بت شکن مجاہد

دلّی کا پُراسرار سادھو

50
YEARS OF PAKISTAN

اے حمید

شینا لائبریری
دوکان نمبر 57 پنیاں چوک صدر بازار
ہری پور ـــ فون: 0300-9837710

پاکستانی جنگی قیدیوں کی ٹرین انڈیا میں داخل ہو گئی تھی۔

یہ سپیشل ٹرین تھی۔ بنگلہ دیش کے کرمی ٹولہ ریلوے سٹیشن سے چلی تھی اور راستے میں تمام سٹیشن چھوڑتی چلی آئی تھی۔ ڈبے میں پاک فوج کے جوان ایسی حالت میں بیٹھے تھے جیسے شیروں کو زنجیروں سے جکڑ دیا گیا ہو۔ ان میں سے کسی نے بھی ہتھیار نہیں ڈالے تھے ان سے زبردستی ہتھیار ڈلوائے گئے تھے۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس شکست کا حقیقی ذمہ دار کون تھا؟ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آج ملک کا بچہ بچہ جان گیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہمارے لیڈروں اور سیاست دانوں نے کیسا خونیں ڈرامہ کھیلا تھا۔ دوسرے یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ میں آپ کو پاک فوج کے شیر دل جوانوں کی آپ بیتی پھر کبھی سناؤں گا کہ وہ مشرقی پاکستان کے دور دراز دلدلی علاقوں میں انہیں ہتھیاروں' سپلائی اور بدلی کے بغیر کیسے ہمت شکن حالات میں لڑایا گیا۔ وہ آخری دم تک آخری گولی تک راشن پانی' گولہ بارود کے بغیر دشمن سے لڑتے رہے۔ شہید ہوتے رہے اور ان کی ہڈیاں مشرقی پاکستان کی مٹی میں مٹی ہو گئیں۔ یہ پاکستان کی تاریخ کی شاید سب سے الم انگیز داستان ہے۔ لیکن اس وقت یہ میرا موضع نہیں ہے۔ اس وقت میں آپ کو صرف اپنی آپ بیتی' اپنی داستان سنانے چلا ہوں جو حیرت انگیز بھی ہے' المناک بھی ہے اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی بھی ہے۔

اس وقت جبکہ میں اپنی اس داستان عبرت کو قلمبند کرنے لگا ہوں تو تمام واقعات میری

آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح ناچنے لگے ہیں اور مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ گزرا تھا اور میں ان حالات میں سے گزر چکا ہوں۔ آپ جب میری داستان سنیں گے یا پڑھیں گے تو آپ کو بھی یقین نہیں آئے گا۔ میں پاکستانی جنگی قیدیوں کے ساتھ ضرور سفر کر رہا تھا لیکن میں پاک فوج کی کسی رجمنٹ کا حاضر سروس عہدیدار نہیں تھا۔ میرا تعلق چند سال پہلے پاک آرمی سے ضرور تھا لیکن اب میں فوج سے ریلیز ہو چکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ کو اپنا مختصر سا تعارف کرا دوں تاکہ آپ کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو جائے کہ میں جنگی قیدیوں کی ٹرین میں کیوں سفر کر رہا تھا۔ میں بھارت کا قیدی ضرور تھا مگر میں ریگولر پاک آرمی کا جوان نہیں تھا۔

میرا نام کرم داد ہے۔ میں پاک آرمی کی کمانڈو فورس میں تھا۔ ہماری رجمنٹ مشرقی پاکستان میں تھی۔ میں بھی اپنی رجمنٹ کے ساتھ ڈھاکہ چھاؤنی کی بارکوں میں رہتا تھا۔ تین برس پہلے میں نے پنجاب میں اپنے شہر میں آ کر شادی کر لی اور پھر میں فوجی کوارٹروں میں رہنے لگا۔ دو برس کی بات ہے کہ فوجی مشقوں کے دوران میں ایک اونچی جگہ سے گر پڑا اور میری کمر میں چوٹ لگ گئی۔ فوجی ڈاکٹروں نے بہت علاج کیا مگر کمر کی درد سے نجات نہ ملی۔ چنانچہ مجھے فوج سے ریلیز کر دیا گیا۔

میں ڈھاکہ میں تین برس سے رہ رہا تھا۔ وہاں مسلمان بنگالیوں سے بڑے اچھے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد مجھے گریجویٹی کی رقم ملی تو میں نے ڈھاکہ میں ہی فرنیچر کی دکان کھول لی۔ ڈھاکہ شہر میری بیوی اور میری بچی کو بھی بہت پسند تھا۔ چنانچہ ہم نے اسی شہر میں کاروبار کا فیصلہ کر لیا۔ میری بیوی دس جماعتیں پاس تھی اور پنجاب کے ایک شہر کی رہنے والی خوش شکل خاتون تھی۔ ہمیں ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی۔ میرے ایک گہرے بنگالی دوست حاجی شمس الدین نے ایک بنگالی حکیم سے میرا علاج شروع کرا دیا۔ جس کے علاج سے مجھے کمر کی درد سے نجات مل گئی۔ ہم نے محمد پور میں ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ مکان کے قریب ہی میری فرنیچر کی دکان تھی۔ حاجی شمس الدین کی کپڑے کی دکان میری دکان کے پاس ہی تھی۔ حاجی صاحب کی فیملی کی

خواتین کا ہمارے گھر میں آنا جانا تھا۔ میری بیوی حاجی صاحب کی بیوی کی بڑی پکی سہیلی تھی۔ ان کا مکان ہمارے مکان کے ساتھ ہی تھا۔

میرا کاروبار ترقی کرنے لگا تھا۔ وقت بڑی خوش حالی اور سکون کے ساتھ گزر رہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں سیاسی ہنگامے شروع ہو گئے۔ میں فوجی کمانڈو تھا' مجھے سیاست سے نہ تو کوئی دلچسپی تھی اور نہ سیاست سے میرا کوئی سروکار تھا۔ مشرقی پاکستان کے اس زمانے کے سیاسی حالات سے آپ لوگ اچھی طرح واقف ہوں گے۔ روز جلوس نکلتے۔ الیکشن شروع ہو گئے۔ مجیب کی پارٹی عوامی لیگ انتخابات بھاری اکثریت سے جیت گئی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ اس زمانے کے پاکستان کے صدر یحییٰ خان نے اسمبلی کا اجلاس بلانے کا اعلان کر دیا۔ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ انہیں علم تھا کہ اسمبلی کا اجلاس بلایا گیا تو مجیب الرحمٰن وزیراعظم بن جائے گا۔ پھر اچانک یحییٰ خان نے دوسرا اعلان کر دیا کہ اسمبلی کا اجلاس نہیں بلایا جائے گا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان خاص طور پر ڈھاکہ شہر میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ غیر بنگالیوں کے مکانوں کو آگ لگائی جانے لگی۔ ان کا قتل عام شروع ہو گیا۔ مجیب الرحمان کی پارٹی عوامی لیگ نے علیحدہ ملک بنگلہ دیش کا اعلان کر دیا۔ میری اور میری بیوی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ لیڈر لوگ عوام کو کس طرف لیے جا رہے ہیں۔ لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات ہونے لگے۔

مجیب الرحمان نے اعلان کر دیا کہ کوئی سرکاری ملازم دفتر میں نہیں جائے گا۔ مگر سب کو گھر بیٹھے تنخواہ ملتی رہے گی۔ بنکوں میں غیر بنگالیوں کے اکاؤنٹ منجمند ہو گئے۔ انہیں صرف اتنی رعایت دی گئی کہ وہ ہفتے میں پانچ سو روپے تک کی رقم بنک سے نکلوا سکتے ہیں۔ ہر طرف لاقانونیت تھی۔ فوج نے ایرپورٹ کا نظم و نسق سنبھال لیا تھا۔ غیر بنگالیوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔ ان کی بہو بیٹیوں کو اغوا کیا جا رہا تھا۔ لوگ مشرقی پاکستان سے نکلنے کے لیے ائرپورٹ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ فوج نے ابھی تک کوئی جوابی کاروائی شروع نہیں کی تھی۔ میری بیوی جمیلہ سخت خوف زدہ تھی۔ میں خود پریشان تھا۔ مگر محمد پور اور میرپور کی بستیوں میں چونکہ غیر بنگالیوں کی اکثریت تھی اس لیے وہاں حالات پر امن تھے۔

اس کے باوجود میری بیوی کو حاجی شمس الدین کی فیملی نے اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔ اس لوٹ مار اور قتل عام میں محب وطن مسلمان بنگالی شریک نہیں تھے۔ بھارت سے آئے ہوئے مکتی باہنی کے لوگ تھے جن کے ساتھ مشرقی پاکستان کے کچھ بنگالی طلباء بھی مل گئے تھے۔ مکتی باہنی والے بھارتی فوج کے ٹرینڈ گوریلے تھے جو سویلین لباس میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کر رہے تھے۔

حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ غیر بنگالی جو جانیں بچا کر ائرپورٹ کی طرف بھاگ رہے تھے انہیں راستے میں ہی پکڑ کر قتل کر دیا جاتا اور ان کی بہو بیٹیوں کو اغوا کر لیا جاتا۔ جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تو فوج نے کاروائی شروع کر دی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' وہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی تاریخ تھی۔ رات کا ایک بجا تھا کہ بڑے زور کا دھماکہ ہوا۔ ڈھاکہ شہر لرز اٹھا۔ جب پاکستانی آرمی میدان میں آ گئی تو شرپسند دہشت گرد مکتی باہنی والے بھارت کی طرف بھاگ گئے۔ شہر میں امن و امان بحال ہونے لگا۔ میں نے بھی دوبارہ اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ لیکن یہ امن عارضی ثابت ہوا۔ بھارت نے پوری جنگی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ اس بار مکتی باہنی والے مشرقی پاکستان میں داخل ہوئے تو ان میں بھارتی کمانڈو فورس بھی بنگالی شہریوں کے لباس میں تھی۔ انہیں انڈین آرمی کی مدد حاصل تھی جو سرحدوں پر گولہ باری کر رہی تھی۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اس تباہی اور عبرت انگیز شکست کا ذمے دار کون تھا؟ یہ وہ سوال ہیں جو ہر محب وطن پاکستانی کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں' لیکن کسی کو ان کا جواب نہیں ملتا۔ مجھے خود معلوم نہیں کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ آپ پڑھے لکھے ہیں' شاید آپ کو معلوم ہو۔ بہرحال مشرقی پاکستان پر بھارت نے باقاعدہ حملہ کر دیا۔ مغربی پاکستان میں بھی جنگ چھڑ گئی۔ ہم لوگ محمد پور میں محبوس ہو کر رہ گئے۔ روز بڑی بڑی خبریں آنے لگیں۔

پھر وہ منحوس دن بھی آ گیا جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ فوج سے زبردستی ہتھیار ڈلوا دیے گئے اور ہماری بہادر فوج کے خوددار جوان بھارت کے جنگی قیدی بنا دیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش میں بڑے پیمانے پر غیر بنگالیوں کا قتل عام

آبرو ریزی اور لوٹ مار شروع ہو گئی۔ مکتی باہنی والے محمد پور میں بھی داخل ہو گئے۔ اس روز میں محمد پور میں ہی اپنے ایک مسلمان محب وطن بنگالی دوست کے گھر حالات کے بارے میں معلوم کرنے گیا ہوا تھا کہ محمد پور کے بازاروں میں فائرنگ کے دھماکے ہونے لگے اور چیخ و پکار مچ گئی۔ میرے مسلمان بنگالی دوست نے کہا کہ میں وہیں رہوں اور باہر نہ جاؤں لیکن مجھے اپنی بیوی جمیلہ کا خیال آ رہا تھا۔ خدا جانے وہ کس حالت میں ہو گی۔ میں اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر بنگالی دوست کے مکان سے نکل کر گلیوں' بازاروں میں چھپتا چھپاتا اپنے محلے میں پہنچ گیا۔ راستے میں میں نے جگہ جگہ ایسے لرزہ خیز منظر دیکھے کہ جن کو یاد کر کے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مکتی باہنی والے باقاعدہ فوجی وردیوں میں تھے۔ وہ بہاریوں' پنجابیوں اور پٹھانوں کو گھر سے گھسیٹ کر بازار میں لاتے۔ چاقو سے پہلے ان کی آنکھیں نکالتے' پھر چھروں کے وار کر کے بیدردی سے قتل کر دیتے۔

میں نے اپنی آنکھوں سے غیر بنگالی عورتوں کو دیکھا کہ انہیں مکتی باہنی والے اور ہندو بنگالی اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ وہ رو رو کر ان سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ میں سخت گھبرایا ہوا تھا۔ مجھے اپنی بیوی کا خیال آ رہا تھا۔ میں بدحواسی کے عالم میں اپنے مکان کے پاس آیا تو دیکھا کہ میرے مکان کو آگ لگی ہوئی تھی۔ میں گھبرا کر اپنے دوست حاجی شمس الدین کے مکان کی طرف دوڑا۔ ان کا مکان بند پڑا تھا۔ گلی میں میرے جاننے والی کئی پنجابیوں اور پٹھانوں کی لاشیں خون میں لت پت پڑی تھیں۔ مکانوں کا ٹوٹا پھوٹا سامان ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ میں نے حاجی شمس الدین کے دروازے پر زور سے دستک دی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ باہر تالہ نہیں لگا ہوا تھا۔ حاجی صاحب نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھا تو گلے لگا کر بچوں کی طرح پھوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بیوی جمیلہ کے بارے میں پوچھا تو وہ مجھے کھینچ کر کمرے میں لے گئے۔ دروازے کو انہوں نے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ ان کی بیوی بچے وہاں پر نہیں تھے۔ حاجی صاحب پہلے تو یہی کہتے رہے کہ میری بیوی زندہ و سلامت ہے اور اسے انہوں نے اپنی فیملی کے ساتھ میرپور پہنچا

دیا ہے لیکن ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ بات کچھ اور ہی ہے۔

میں نے حاجی صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

”حاجی صاحب! آپ کو خدا پاک کی قسم ہے، مجھے صاف صاف بتائیے کہ میری بیوی کہاں ہے؟“

حاجی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ مکتی باہنی والے میرے مکان میں داخل ہو گئے تھے۔ انہوں نے میرے مکان کو لوٹ کر آگ لگا دی اور میری بیوی جمیلہ کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ مجھ پر جیسے آسمان پھٹ پڑا۔ میری آنکھوں کے آگے ایک پل کے لیے بالکل اندھیرا چھا گیا۔ حاجی صاحب مجھے حوصلہ دینے لگے۔

”کرم داد! گھبراؤ نہیں۔ میں تمہاری بیوی کو ضرور واپس لے آؤں گا۔ مکتی باہنی والوں میں دو آدمیوں کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بھابھی کو جہاں بھی لے گئے ہوں گے میں وہاں سے اسے لے آؤں گا۔ تم مجھے تھوڑا وقت دے دو فکر نہ کرو۔“

اس وقت شام ہونے والی تھی۔ وہ میری زندگی کی سب سے اذیت ناک شام تھی۔ جب یہ خیال آتا کہ مکتی باہنی والے ہندو میری بیوی کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے تو میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ کبھی دیواروں پر مکے مارتا، کبھی اپنے سر کو پکڑ لیتا۔ میرا مسلمان بنگالی دوست حاجی شمس مجھے بار بار تسلی دیتا کہ وہ میری بیوی کو واپس لے آئے گا۔ لیکن میری دنیا اجڑ گئی تھی۔ اگر وہ مجھے یہ خبر سناتا کہ مکتی باہنی والے میری بیوی کو قتل کر گئے ہیں تو مجھے صبر آ جاتا۔ میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے وہ رات کس اذیت کے ساتھ جاگ جاگ کر گزاری۔ صبح ہو گئی۔ شہر میں غدر مچا تھا۔ کسی پنجابی، پٹھان یا بہاری کا گھر سے باہر نکلنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ محمد پور میں بھی قیامت برپا تھی۔ مکتی باہنی نے میرپور اور محمد پور کی دونوں غیر بنگالی بستیوں کے مکان لوٹ کر وہاں کے سینکڑوں مسلمان بہاریوں، پنجابیوں اور پٹھانوں کو قتل کر دیا تھا اور ان کی بہو بیٹیوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔

میں نے حاجی شمس سے کہا۔

”دوست! اگر تم ان لوگوں کو جانتے ہو جو میری بیوی کو اغوا کر کے لے گئے ہیں تو مجھے ان کا کچھ اتہ پتہ بتا دو۔ میں خود اپنی بیوی کو تلاش کر لوں گا۔“

پہلے وہ میرے اکیلا باہر جانے پر تیار نہ ہوا۔ جب میں نے اسے کہا کہ اگر اسی نے مجھے ان لوگوں کا پتہ نہ بتایا تو میں خود ہی ان کی تلاش میں نکل جاؤں گا تو اس نے مجھے ان دونوں ہندو بنگالیوں کا پتہ بتا دیا جو مکتی باہنی والوں کے ساتھ میرے گھر میں آئے تھے اور میری بیوی کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ میں بنگلہ زبان بول اور سمجھ لیتا تھا۔ اگرچہ میرا لہجہ پنجابی تھا۔ میرا لباس بنگالی ہی ہوتا تھا۔ جب میں جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کے مکان سے نکلنے لگا تو حاجی شمس الدین نے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور بڑی دردمندی سے کہنے لگا۔

”کرم داد! تم میرے دوست ہی نہیں بھائی بھی ہو۔ تمہاری بیوی جمیلہ میری بھابھی ہی نہیں میری بہن بھی ہے۔ یقین کرو تم محمد پور سے نکلنے کے بعد زندہ نہ بچ سکو گے۔ میرا تمہیں یہی مشورہ ہے کہ مجھے ایک دن کا موقع دو کہ میں جمیلہ بہن کا اپنے طور پر کھوج لگا سکوں۔ اس کے بعد تم بے شک چلے جانا۔“

میرے ہوش و حواس کسی حد تک واپس آ چکے تھے۔ سوچنے لگا حاجی صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ میں بنگالی نہیں ہوں اور میں نے ان لوگوں کو دیکھا تک بھی نہیں، بہتر ہے کہ میں حاجی صاحب کی بات مان لوں، چنانچہ میں رک گیا۔ لیکن حاجی شمس سے کہا۔

”حاجی بھائی! مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ تم جو کچھ بھی معلوم کرو گے مجھے صاف صاف بیان کر دو گے۔ میرے آگے جھوٹ نہیں بولو گے۔“

حاجی شمس کہنے لگا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“

حاجی شمس الدین ایک تو بنگالی تھا اور مشرقی پاکستان کا ہی رہنے والا تھا۔ اس کے ہندو بنگالیوں سے بھی دیرینہ مراسم تھے اور بہت لوگ اسے جانتے اور اس کا احترام کرتے تھے۔ حاجی شمس نے مجھے اپنے مکان میں ہی چھپے رہنے کی ہدایت کی اور خود دوپہر کے بعد نکل

گیا۔ گھر میں اس کا ایک ہی مسلمان بنگالی ملازم شرفو تھا۔ اس کے اپنے بیوی بچوں کو اس نے کاکز میں اپنی بڑی بہن کے ہاں بھجوایا ہوا تھا۔ میں اس کے مکان کے ایک کمرے میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ بنگالی ملازم شرفو نے شام کو چائے بنا کر دی اور بتایا کہ محمد پور میں بھی بھارتی فوجی آ گئے ہیں اور گھروں کی تلاش لے رہے ہیں۔ میں نے اسی سے پوچھا کہ وہ گھروں کی تلاشی کیوں لے رہے ہیں۔ شرفو کہنے لگا۔

"ان کا خیال ہے کہ پاکستانی فوج کے کچھ سپاہی یہاں فرار ہو کر چھپے ہوئے ہیں۔ وہ ان کو تلاش کر رہے ہیں۔"

اس نے یہ بھی بتایا کہ شہر میں ہر طرف انڈین آرمی نظر آ رہی ہے اور پاک فوج کی پلٹنوں سے ہتھیار واپس لے کر انہیں قیدی بنا کر انڈیا لے جایا جا رہا ہے۔ یہ ایک الگ جان لیوا صدمہ تھا میرے لیے۔ شرفو نے یہ بھی بتایا کہ پاک فوج ابھی تک کچھ محاذوں پر لڑ رہی ہے اور ان جوانوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔

مسلمان بنگالی ملازم شرفو بھی حیران اور غم زدہ تھا۔ بار بار کہتا۔

"بابو جی! ہمارے لیڈروں نے ہمیں مروا دیا ہے۔ پاک فوج کے خلاف۔ پاکستان کے خلاف بڑی گھناؤنی سازش ہوئی ہے۔ میں خود بھارتی فوجیوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پاکستان آرمی ہتھیار ڈال دے گی۔ ہمیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔"

میں نے شرفو سے پوچھا۔

"شرفو بابا! جب مکتی باہنی والے میری بیوی کو اغوا کر کے لے گئے تو کیا تم نے انہیں دیکھا تھا؟"

شرفو بولا۔

"بابو جی! میں وہاں نہیں تھا۔ ہمارے حاجی صاحب اس وقت وہاں تھے۔ جب مکتی باہنی والوں نے آپ کے مکان کو آگ لگائی تو حاجی صاحب اس طرف دوڑے تھے کہ بھابھی صاحبہ کو وہاں سے نکال کر لے آئیں۔ مگر اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ بی بی جی تو ہمارے والے مکان میں آ گئی تھیں مگر بدقسمتی سے اس وقت کچھ ضروری سامان وہاں سے نکالنے اپنے مکان میں چلی گئی تھیں۔"

میرا دل غم سے بوجھل ہو رہا تھا۔ جمیلہ کے تصور ہی سے دل ڈوبنے لگتا تھا۔ کبھی ایک دم خون کھول اٹھتا اور جی چاہتا کہ ابھی یہاں سے نکل کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑوں اور جنہوں نے میری بیوی کو اغوا کیا ہے ان میں سے کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑوں۔ مگر میرے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے تھے۔ میں مجبور ہو چکا تھا۔ میں نے بوڑھے بنگالی سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں یہ لوگ میری بیوی کو کہاں لے گئے ہوں گے؟"

شرفو نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"بابو میاں جی! مشرقی پاکستان پر تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ ایک نہیں ہزاروں بہو بیٹیاں اغوا ہو گئی ہیں۔ میرپور اور محمد پور کا تو شاید ہی کوئی غیر بنگالی مسلمان گھر ہو گا جہاں سے کوئی عورت اغوا نہ ہوئی ہو۔ بازار میں ایک آدمی کہہ رہا تھا کہ مکتی باہنی والے ان عورتوں کو اغوا کر کے بھارت کے شہر کلکتہ میں لے گئے ہیں جہاں انہیں فروخت کر دیں گے۔"

میرے دل پر جیسے کسی نے زور سے مکا مار دیا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے اپنے دل کو سمیٹ کر وہیں بیٹھا رہا۔ کیا میری بیوی جمیلہ کو بھی کلکتے کی ہیرا منڈی میں فروخت کر دیا جائے گا؟ میرے اللہ، میرے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ شرفو مجھے حوصلہ دینے لگا۔

"بابو میاں! حاجی صاحب بھابھی کا سراغ لگا لیں گے۔ تم دیکھ لینا۔ جمیلہ بھابھی ضرور واپس آ جائے گی۔"

میں دیر تک چارپائی پر بیٹھا روتا رہا۔ رونے سے دل کا غبار کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ میں نے شرفو سے کہا۔

"اللہ کرے، اللہ کرے۔"

اس رات حاجی شمس الدین واپس نہ آیا۔ دوسرے دن کوئی گیارہ بجے وہ جب واپس آ گیا میں دیوانوں کی طرح اسے تکنے لگا۔ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کرم داد! تم نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جو کچھ مجھے معلوم ہو گا وہ اسی طرح تمہیں بیان کر دوں گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جمیلہ بھابھی کو مکتی باہنی کے لوگ دوسری اغوا کی ہوئی لڑکیوں کے ساتھ کلکتے لے گئے ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان بدقسمت غیر بنگالی عورتوں کو ان لوگوں نے کلکتے میں کس جگہ رکھا ہوا ہے اور اگر انہیں بیچ دیا ہے تو کہاں کہاں بیچا ہے۔ اس کا کھوج تمہیں ان دو بنگالیوں سے لگ سکتا ہے جن کو میں جانتا ہوں۔ ان میں سے ایک کا نام دھرمو ہے، دوسرے کا نام کھیا ہے۔ یہ دونوں ہندو بنگالی ہیں۔ ان میں سے کھیا کے کلکتے والے ٹھکانے کا مجھے پتہ ہے۔ اگر تم گوارا کرو تو کسی طرح کھیا کے ٹھکانے پر پہنچ کر تمہیں جمیلہ بھابھی کا سراغ مل سکتا ہے۔"

میں بے جان پتھر کے بت کی طرح حاجی شمس الدین کے سامنے بیٹھا تھا۔ میرے بدن کے اندر جیسے جوالا مکھی پھٹ رہے تھے۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں پتھر ہو گیا تھا۔ میں نے حاجی صاحب سے کہا۔

"مجھے ہندو بنگالی کھیا کا کلکتے کا ایڈریس دے دیں۔"

حاجی صاحب نے مجھے ایک کاغذ پر کھیا کا ایڈریس لکھ کر دے دیا۔ کہنے لگے۔

"کرم داد! میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکا۔"

میں نے کہا۔

"حاجی صاحب! آپ نے میرے لیے جو کچھ بھی کیا ہے اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں آج شام اندھیرا ہوتے ہی چلا جاؤں گا جمیلہ کو ہندو بنگالی درندوں سے نجات دلانے کے لیے مجھ سے جو ہو سکا کروں گا۔"

حاجی صاحب نے کہا۔

"تم کہاں سے باڈر کراس کرو گے؟ تمہارا قد کاٹھ اور رنگ روپ ایسا ہے کہ فوراً پہچانے جاؤ گے کہ پنجابی ہو۔ ڈھاکہ سے لے کر کلکتے تک مکتی باہنی والے غیر بنگالیوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میں موت سے نہیں ڈرتا، صرف خدا سے ڈرتا ہوں۔ اگر اپنی بیوی کی تلاش میں مجھے موت بھی آ گئی تو وہ غیرت اور عزت کی موت ہو گی۔ میں یہاں بے غیرت بن کر بیٹھا نہیں رہوں گا۔"

حاجی صاحب نے مشورہ دیا کہ مجھے ڈھاکہ سے بوگرا کی طرف جانا چاہیے۔ وہاں ہلی کے مقام سے میں بھارت میں داخل ہو سکتا ہوں۔

"چونکہ ابھی بھارت کی فوجیں آ جا رہی تھیں اور لوگ بھی آتے جاتے رہتے ہیں اس لیے بارڈر پر کوئی چیکنگ پوسٹ نہیں ہے۔"

ریل گاڑی کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی مگر ان میں کوئی پنجابی، پٹھان سفر نہیں کرتا تھا۔ ہندو اور بھارتی مکتی باہنی والے راستے میں انہیں قتل کر دیتے تھے۔ لیکن مجھے اپنی جان کی پروا نہیں تھی، صرف مجھے سوچ سمجھ سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے جذبات پر بہت حد تک قابو پا لیا تھا اور ایک تربیت یافتہ کمانڈو بن کر ڈھاکہ سے کلکتے کی طرف فرار کا منصوبہ بنایا تھا۔ حاجی شمس الدین نے مجھے بھارتی کرنسی دے دی۔ یہ کوئی چھ سات ہزار روپے ہوں گے۔ میں نے اپنا حلیہ ہندو بنگالیوں والا بنایا اور رات کے نو بجے محمد پور سے نکل کر ایک رکشا لیا اور ڈھاکہ ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھا۔ ڈھاکہ کے بازار رات کے وقت تقریباً خالی پڑے تھے۔ پنجابیوں کی دکانیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی دکانیں کھلی تھیں۔ بھارتی فوجی گھوم پھر رہے تھے۔ میرا رکشا ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔

سٹیشن پر کافی رش تھا۔ سب بنگالی تھے۔ کسی پنجابی، پٹھان کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ سٹیشن پر جگہ جگہ بنگلہ دیش کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ میں نے بہادر گھاٹ نام کے سٹیشن کا ٹکٹ لے لیا۔ بہادر گھاٹ سے مجھے دریا پار کر کے بوگرا جانا تھا اور وہاں سے ہلی زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں سے آگے انڈیا کا باڈر شروع ہو جاتا تھا۔ میرا قد کاٹھ ضرور پنجابیوں والا تھا مگر رنگ زیادہ گورا نہیں تھا جس کی وجہ سے کسی نے میری طرف توجہ نہ

دی۔ ٹرین سوا دس بجے چلی۔ بڑا لمبا سفر تھا۔ ساری رات ٹرین چلتی رہی۔ اگلے روز دوپہر کے وقت بہادر گھاٹ آگیا۔ یہاں سے میں نے ایک بڑی کشتی پر دوسرے بنگالی مسافروں کے ساتھ دریا عبور کیا اور بہادر گھاٹ کے دریا پار والے سٹیشن سے ٹرین میں بیٹھ کر بوگرا پہنچ گیا۔ ہلی میں بنگالی اور بھارتی فوجی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ بن وان نام کے ریلوے سٹیشن سے ٹرین آگے انڈیا کے بارڈر تک جاتی تھی۔ ابھی تک میرے ساتھ کسی قسم کا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ ہلی سے میں پیدل ہی بن وان سٹیشن کی طرف چل دیا۔ یہ میدانی علاقہ تھا۔ کئی جگہوں پر میں نے جلے ہوئے ٹینک اور ٹوٹی ہوئی توپیں الٹی پڑی دیکھیں۔ یہاں پاک فوج کے جوانوں نے بڑی بہادری سے انڈین فوج کی بھاری نفری اور توپ خانے کا مقابلہ کیا تھا اور مٹھی بھر جوانوں نے بھارتی فوج کی پوری بریگیڈوں کو تباہ کر دیا تھا۔ یہ توپیں اور جلے ہوئے ٹینک بھارتی فوج کی شکست کی تصدیق کر رہے تھے۔

ہلی اور بن وان سٹیشن کے درمیان کھیتوں میں سفر کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں انڈین ملٹری انٹیلی جینس کی نظروں میں آگیا ہوں اور ایک آدمی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ پہلے تو میں نے کوئی خیال نہ کیا لیکن جب دو تین کھیتوں میں سے گزرنے کے بعد میں نے اسے اپنے پیچھے آتے دیکھا تو مجھے شک پڑ گیا۔ میں فوج کا سابق کمانڈو تھا اور اس قسم کی نقل و حرکت کو فوراً پہچان لیتا تھا۔ چنانچہ میں محتاط ہو گیا۔ محتاط ہو کر بھی میں یہی کر سکتا تھا کہ کسی طرح اس آدمی کو دھوکہ دے کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں مگر وہاں کوئی جنگل وغیرہ نہیں تھا۔ میدانی علاقہ تھا۔ کھیت ہی تھے جو اجڑے پڑے تھے۔ کہیں کہیں کوئی بنگالی کسان نظر آ جاتا تھا۔ جو آدمی میرا پیچھا کر رہا تھا وہ بھی بنگالی لباس میں تھا۔ اس نے میرے اور اپنے درمیان اتنا فاصلہ رکھا ہوا تھا کہ میں اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پاؤں۔ ایک جگہ درختوں کا ذخیرہ آگیا۔ میں اس میں گھس گیا اور تیز تیز چلتا دوسری طرف نکل گیا۔ سامنے بن وان سٹیشن کے سگنل نظر آ رہے تھے۔ میں جلدی جلدی ان کی طرف چلنے لگا۔ یہاں جگہ جگہ بنگالی لوگ بنگلہ دیش کے جھنڈے لیے چل پھر رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ بھارتی فوجی بھی تھے۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

مجھے اپنے تعاقب میں لگا ہوا آدمی نظر نہ آیا۔ مگر میں محتاط ہی رہا۔ مجھے معلوم تھا انٹیلی جینس والا ایک بار شک کی بنا پر پیچھے لگ جائے تو پھر وہ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑا کرتا۔ میں سٹیشن کے آس پاس موجود لوگوں میں گھل مل گیا۔ مجھے یہاں سے ہلی کو جانے والی ٹرین پکڑنی تھی۔ میری جیب میں کافی روپے تھے مگر ٹکٹ کہاں سے ملتا ہے یہ معلوم نہیں تھا۔ میں نے ایک بنگالی سے بنگلہ میں پوچھا کہ ٹکٹ گھر کہاں ہے۔ اس نے ذرا چونک کر مجھے دیکھا۔ میرا بنگلہ زبان بولنے کا لہجہ بھی بنگالی نہیں تھا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں اس طرف چل دیا۔ ٹکٹ گھر کے آگے کافی لوگ تھے۔ قطار لگی ہوئی تھی۔ میں بھی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں کسی نے اردو میں مجھے پیچھے سے آواز دی۔

”کہاں جا رہے ہو تم؟“

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہی آدمی جو میرے پیچھے لگا ہوا تھا، تین مسلح بھارتی فوجیوں کو لیے میرے پیچھے کھڑا مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے بنگالی اردو میں جواب دیا کہ ہلی جا رہا ہوں۔ کیوں کیا بات ہے؟ اس آدمی نے بھارتی فوجیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اب آپ جانیں آپ کا کام۔ میری ڈیوٹی یہاں ختم ہوتی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ ایک طرف چلا گیا۔ تین بھارتی فوجیوں میں سے ایک صوبیدار میجر تھا۔ میں نے اس کے کاندھے کے نشان سے اس کا رینک پہچانا تھا۔ وہ کالے رنگ کا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ جاٹ رجمنٹ کا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑ کر قطار میں سے باہر نکال لیا اور ایک طرف لے جا کر پوچھا۔

”کیا تم پنجابی ہو؟“

میں نے سوچا کہ ان کے آگے جھوٹ بولنا بے کار ہے۔ میں نے کہا۔

”سر! میں پنجابی ہی ہوں۔ ڈھاکہ میں میری دکان اور مکان جلا دیا گیا ہے۔ جان بچا کر انڈیا کی طرف جا رہا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"میرے پاس چار ہزار روپے ہیں۔ وہ آپ لے لیں اور مجھے انڈیا کا باڈر کراس کرنے دیں۔"

بھارتی صوبیدار میجر مجھے گھور کر گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا شاید اس نے مجھے میرے قد کاٹ اور بولنے کے انداز سے پہچان لیا تھا کہ میں کوئی کاروباری پنجابی نہیں ہوں۔

"تم مجھے پاکستانی آرمی کے جوان لگتے ہو۔ تمہاری رجمنٹ کون سی تھی۔ تمہارا رینک کیا ہے۔"

میں نے اس کو ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میرا پاکستان آرمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے اس کی منت سماجت بھی کی۔ مگر وہ یہی کہتا رہا کہ میں پاک آرمی کا جوان ہوں اور وہ مجھے جنگی قیدی بنا کر ساتھ لے جائے گا۔ اس نے مجھ سے میری ساری بھارتی کرنسی بھی چھین لی اور اپنے فوجیوں کو آڈر دیا کہ میرے ہاتھ باندھ دیے جائیں۔ اگر ہم کسی جنگل میں ہوتے تو میں ان تینوں مسلح بھارتی فوجیوں کا صرف مقابلہ ہی نہیں کر سکتا تھا بلکہ ایک کمانڈو کی حیثیت سے ان تینوں کو ہلاک بھی کر سکتا تھا لیکن وہاں آس پاس بھارتی فوجی موجود تھے۔ میں بے بس تھا۔ میں نے بہت شور مچایا کہ میں پاکستانی فوجی نہیں ہوں، پنجابی دکاندار ہوں۔ مگر میرے ہاتھ پیچھے باندھ دیے گئے اور بھارتی فوجی مجھے لے کر سٹیشن پر بھارتی کمپنی کے ہیڈ کواٹر میں لے آئے۔ یہاں ایک سکھ کیپٹن تھا۔ وہ سر جھکائے ایک فائل پر کچھ لکھ رہا تھا۔ بھارتی صوبیدار میجر نے سیلوٹ مار کر مجھے پیش کر دیا۔

"سر! یہ پاکستانی فوج کا جوان ہے۔ سویلین کپڑوں میں فرار ہو رہا تھا۔"

سکھ کیپٹن نے چہرہ اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور صوبیدار میجر سے کہا۔

"تم اس کو میرے پاس کیوں لے آیا ہے۔ اس کو کواٹر گارڈ میں بند کرو، جنگی قیدیوں کی گاڑی آئے تو اس میں بٹھا کر روانہ کر دو۔"

میں نے وہاں کافی شور مچایا اور سکھ کیپٹن کو پنجابی میں سمجھانے کی کوشش کی کہ میرا پاک آرمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ڈھاکے میں فرنیچر کا کاروبار کرتا تھا۔ میری دکان جلا دی گئی ہے۔ میں مکتی باہنی والوں کے خوف سے جان بچا کر انڈیا جا رہا ہوں۔ مگر سکھ کیپٹن نے میری ایک نہ سنی اور بھارتی صوبیدار کو اشارہ کیا جو مجھے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ سٹیشن پر ہی ایک طرف عارضی فوجی کواٹر گارڈ بنی ہوئی تھی۔ مجھے اسی کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔

حالات نے یک لخت پلٹا کھا لیا تھا اور میرے راستے میں جیسے آہنی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ میں کسی حالت میں بھی جنگی قیدی بن کر بھارت کی قید میں نہیں جانا چاہتا تھا، لیکن مجھے جنگی قیدی بنا کر کواٹر گارڈ میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب مجھے سب سے پہلے بھارت کے جنگی کیمپ سے فرار ہونا تھا جو سخت مشکل اور دیر لگانے والا کام تھا اور اس کے بعد اپنی بیوی کی تلاش میں کلکتے واپس آنا تھا۔

میرا دماغ ایک لحہ کے لیے سن ہو کر رہ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ فوجی کواٹر گارڈ سے فرار ہونا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہاں سے جنگی قیدیوں کی گاڑی میں بٹھا کر مجھے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھارت کے کون سے شہر کے قیدی کیمپ میں لے جایا جائے گا۔ ظاہر ہے قیدی کیمپ میں سیکورٹی کا بے حد سخت انتظام ہو گا۔ کہاں میں ہلی سے آگے بنگلہ دیش کا باڈر کراس کر کے آسانی سے بھارت میں داخل ہو کر کلکتے پہنچ سکتا تھا اور کہاں اب میرے سامنے ایک پہاڑ آ کر کھڑا ہو گیا تھا جس کو عبور کرنا میرے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ عام حالات میں اگر مجھے بھارت کے کسی جنگی کیمپ میں قید کر دیا جاتا تو میں وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر سکتا تھا اور ایک کمانڈو ہونے کی وجہ سے میں اس کوشش میں کامیاب بھی ہو سکتا تھا مگر اس آپریشن میں کافی وقت لگتا تھا اور میرے پاس وقت نہیں تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس دوران میری بدنصیب بیوی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا جائے اور وہ میری پہنچ سے دور ہو جائے۔ انڈیا بڑا وسیع ملک تھا۔ ایک خاص مدت گزر جانے کے بعد میرے لیے جمیلہ کو تلاش کرنا ناممکن ہو سکتا تھا۔

شام کے وقت مجھے فوجی کوارٹر گارڈ سے نکال کر تین مسلح بھارتی سپاہی میرے ہاتھ پیچھے باندھے ساتھ لے کر سٹیشن پر گئے۔ تھوڑی دیر میں وہاں پاکستانی جنگی قیدیوں کی ایک ٹرین آ کر کھڑی ہو گئی۔ ٹرین کے ڈبوں کی کھڑکیاں بند تھیں۔ اندر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دروازوں پر بھارتی فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ میرے ہاتھ کھول کر مجھے ایک ڈبے میں دھکیل دیا گیا اور بھارتی گارڈ سے کہہ دیا گیا کہ میں پاک فوج کی کسی رجمنٹ کا جوان ہوں اور سویلین کپڑوں میں فرار ہو رہا تھا۔ میں نے ڈبے میں دیکھا' ڈبہ پاکستانی فوجی جوانوں سے بھرا ہوا تھا۔ جوانوں کے چہروں پر ایک باوقار سکوت طاری تھا۔ ان کی آنکھوں میں بجلیاں سی چمک رہی تھیں۔ لگتا تھا شیروں کو زنجیروں میں جکڑ کر ڈبے میں بند کر دیا گیا ہے۔ سب فوجی وردیوں میں تھے۔ عہدے کی پٹی کسی جوان کے کاندھے پر نہیں تھی۔ وہاں صرف میں سویلین کپڑوں میں تھا۔ ٹرین ایک دو منٹ کے لیے رکی تھی۔ اس کے بعد وہاں سے چل پڑی۔ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ جب ٹرین کافی آگے نکل گئی تو پاکستانی فوج کے ایک قیدی جوان نے مجھ سے پوچھا۔

”تمہارا تعلق کس رجمنٹ سے ہے؟ تمہارا رینک کیا ہے؟“

میں نے کہا۔

”بھائی سچی بات یہ ہے کہ میں پاکستانی آرمی کا سابق حوالدار ہوں۔ فوج سے ریلیز لے کر ڈھاکے میں فرنیچر کا کاروبار کرتا تھا۔ مکتی باہنی والوں نے میرے مکان اور دکان کو آگ لگا دی۔ میں جان بچا کر ہلی کی طرف بھاگ نکلا کہ باڈر کراس کر کے انڈیا پہنچ جاؤں گا۔ مگر بھارتی فوجیوں نے مجھے پاک آرمی کا جوان سمجھ کر پکڑ لیا اور اب جنگی قیدی بنا دیا ہے۔“

کسی نے میری طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ سب غم زدہ خاموش چہرے لیے سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جس جوان نے مجھ سے سوال پوچھا تھا وہ بھی میرا جواب سن کر خاموش رہا۔ ٹرین کافی رفتار سے دوڑی جا رہی تھی۔ یہ جنگی قیدیوں کی سپیشل ٹرین تھی۔ بن وان کے سٹیشن پر کسی خاص وجہ سے ٹرین تھوڑی دیر کے لیے رک گئی تھی۔ اس کے بعد وہ رن تھرو چلتی چلی گئی۔

اب میں اپنی لرزہ خیز داستان کو اس مقام پر واپس لاتا ہوں جہاں سے میں نے سفر شروع کیا تھا۔ یعنی میں پاکستانی جنگی قیدیوں کی ٹرین میں قیدی بن کر بیٹھا تھا اور ٹرین بنگلہ دیش کا باڈر کراس کر کے انڈیا کی سرزمین میں داخل ہو گئی تھی۔ اس دوران ایک دن اور ایک رات سفر کرتے گزر گئی۔ پاک فوج کے جوان میرے آس پاس اور سامنے بیٹھے تھے۔ ان سے تھوڑی بے تکلفی سی ہو گئی تھی۔ مگر اس دوران میں نے کسی جوان کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔ ان کے چہروں پر غیض و غضب کے اثرات تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ ان کے ہاتھوں سے زبردستی ہتھیار چھین کر انہیں بے بسی اور سخت مجبوری کی حالت میں بھارت کی قید میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ آپس میں زیادہ بات چیت بھی نہیں کر رہے تھے۔ میرے ساتھ دو تین جوانوں کی جو بے تکلفی ہو گئی تھی کہ وہ میری بات کا ہاں یا نہ میں جواب دے رہے تھے۔ جب میں نے انہیں اپنی اصل روداد الم سنائی تو ان پر بڑا شدید اثر ہوا۔ ایک جوان نے گالی دے کر کہا۔

”ان لوگوں نے ہم سب کو مروا دیا ہے۔“

خدا جانے اس جوان نے کس کو گالی دی تھی۔ میں خاموش رہا تھا کیونکہ مجھے سیاست کی کچھ سمجھ نہیں تھی۔ جس طرح پاک فوج کے دوسرے جوان سیاسی لیڈروں کی سازشوں اور جوڑ توڑ سے بے خبر تھے۔ مجھے اپنی مصیبت پڑی ہوئی تھی۔ میں ٹرین سے چھلانگ لگا کر بھاگ جانا چاہتا تھا اور ٹرین کلکتے سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے کلکتہ جانا تھا۔ میں نے اپنے ساتھ والے جوان پر جب اپنے دل کا حال ظاہر کیا تو وہ آہستہ سے کہنے لگا۔

”ٹرین کی کھڑکیوں پر تختے ٹھونک دیے گئے ہیں۔ ڈبے کا ایک دروازہ بھی بند ہے۔ دوسرے دروازے پر بھارتی گارڈ موجود ہے۔ نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ۔ آگے کچھ پتہ نہیں ہمیں کس شہر کے جنگی کیمپ میں لے جایا جائے۔“

ٹرین کی ہر بوگی کی دونوں جانب بھارتی فوجیوں کے ڈبے لگے ہوئے تھے۔ دن کا وقت تھا۔ راستے میں ایک جگہ ٹرین کسی چھوٹے سے سٹیشن پر کھڑی ہوئی تو باہر فوجیوں کے

بوٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ یہاں قیدیوں کو دال روٹی دی گئی۔ کسی کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ جو ایک دروازہ کھلا تھا وہاں مسلح بھارتی فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ یہاں ڈبے میں دو اور بھارتی فوجی داخل ہو گئے۔ ٹرین چل پڑی۔ میں نے باتھ روم جانے کا اشارہ کیا۔ ایک بھارتی فوجی مجھے لے کر باتھ روم تک گیا۔ وہ دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے آڈر دینے کے انداز میں کہا۔

”دو منٹ سے زیادہ دیر نہیں کرنی۔“

ٹرین کی لیٹرین کی کھڑکی پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ اتنی ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھیں کہ میں بمشکل ہاتھ باہر نکال سکتا تھا۔ باہر کھیت پیچھے کو جاتے نظر آ رہے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں نے لوہے کی سلاخوں کو دو تین جھٹکے دیے۔ سلاخیں بڑی مضبوطی سے لگی ہوئی تھیں۔ باہر سے بھارتی فوجی نے دروازے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”باہر نکلو اندر کیا کر رہا ہے؟“

میں مایوس چہرہ لیے باہر نکل آیا اور اپنی جگہ پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ مجھے ہر حالت میں اس ٹرین سے فرار ہونا تھا۔ میرے حالات ہی کچھ اور تھے۔ میں بھارت کے کسی بھی جنگی کیمپ میں قید ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک بار میں قیدی کیمپ میں داخل ہو گیا تو پھر وہاں سے فرار ہونا میرے لیے مشکل ہو جائے گا۔ میرے ساتھ جو پاک آرمی کا جوان بیٹھا ہوا تھا میں نے اس کو آہستہ سے کہا۔

”میں آج رات اندھیرا ہوتے ہی فرار ہو جاؤں گا۔“

میں نے اسے یہ بالکل نہیں بتایا تھا کہ میں پاکستان آرمی کا سابق عہدے دار ہوں اور میرا تعلق کمانڈو فورس سے تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”دروازے میں اب ایک کی بجائے دو انڈین سپاہی کھڑے ہیں تم سویلین ہو۔ کوئی فوجی کمانڈو نہیں ہو کیسے چھلانگ لگا کر بھاگو گے؟“

میں نے کہا۔

”جو ہو گا دیکھا جائے گا میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا ہے آج رات کو کر گزرنا ہو گا۔“

پاک فوج کے جوان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنا سر بند کھڑکی کے تختے کے ساتھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے ڈبے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک بھارتی فوجی کھلے دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دوسرا سنتری بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں کے پاس سٹین گنیں تھیں۔ میرا ذہن تیزی سے منصوبہ تیار کرنے لگ گیا کہ مجھے کس طرح دروازے میں سے باہر کودنا ہو گا۔ ٹرین کافی تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی۔ دروازے میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔

دن غروب ہونے لگا تو دروازے میں سے آتی روشنی ماند پڑنے لگی۔ پھر بہت جلد یہ روشنی بھی غائب ہو گئی۔ ڈبے کے بلب جلنے لگے۔ میں صرف ایک صورت میں ڈبے سے باہر کود سکتا تھا کہ دروازے میں کھڑا سنتری اونگھنے لگے یا بیٹھ جائے۔ ایسا رات کے وقت ہی ہو سکتا تھا۔ میں انتظار کرتا رہا اور ٹرین بھارت کی سرزمین پر کلکتے سے مزید آگے نکلتی چلی گئی۔ میں ٹرین کو نہ تو روک سکتا تھا' نہ اسے پیچھے کی طرف جانے پر مجبور کر سکتا تھا۔ میرے پاس صرف ایک ہی موقع رہ گیا تھا کہ جیسے ہی دروازے میں کھڑا بھارتی سنتری غافل ہو میں دوڑ کر دروازے میں سے باہر کود جاؤں۔ باہر خواہ پتھروں پر گروں' چاہے دریا میں گروں یہ میری قسمت تھی۔ ہمیں فوج میں کمانڈو ٹریننگ کے دوران ہوائی جہازوں سے پیرا شوٹ کے ذریعے چھلانگ لگانے کی مشق کرائی جاتی تھی یا کسی بلند جگہ سے کودنا ہوتا تھا تو ہمیں ہدایت کی جاتی تھی کہ نیچے اپنے پنجوں کے بل زمین پر گریں اور اپنے سر اور اپنے وجود کو جتنا پیچھے کی طرف رکھ سکتے ہیں' رکھیں۔ مجھے بلندی سے کودنے کی کافی مشق تھی۔ اگرچہ اس بات کو تین سال گزر گئے تھے لیکن یاد رکھیں کمانڈو کی ٹریننگ اتنی سخت اور پکی ہوتی ہے کہ وہ مرتے دم تک کمانڈو ہی رہتا ہے۔

رات ہو گئی' کھلے دروازے کے باہر اندھیرا چھا گیا۔ میری نظریں تھوڑی دیر

بعد دروازے میں کھڑے انڈین سنتری کو دیکھ لیتی تھیں۔ شام کے بعد پہلے والے کی جگہ پر دوسرا سنتری کھڑا ہو کر پہرہ دینے لگا تھا۔ وہ تازہ دم تھا۔ اس لیے بڑا چاق و چوبند ہو کر کھڑا تھا لیکن آخر اس پر بھی نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا۔ گاڑی کی رفتار ابھی تک ہلکی تھی۔ وہ چند لمحے پہلے کسی شہر کے ریلوے سٹیشن کو چھوڑتی ہوئی گزری تھی۔ کھلے دروازے میں سے شہر کی اور ریلوے سٹیشن کی روشنیاں کچھ دیر تک اندر آتی رہی تھیں۔

میں کوئی اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ ٹرین کھیتوں میں سے گزر رہی ہے یا کسی سنگلاخ میدان میں سے گزر رہی ہے۔ صرف دریا کے پل پر سے گزرتے وقت مجھے ٹرین کے پہیوں کی آواز سے پتہ چل جاتا تھا کہ ٹرین دریا کے پل پر سے گزر رہی ہے۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا کم بخت انڈین سپاہی اسی طرح کھڑا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ دروازے سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگا۔ اس کا ساتھی سنتری پہلے ہی دروازے سے ذرا پیچھے ہو کر ڈبے کی دیوار سے لگ کر گردن ایک طرف ڈھلکائے گہری نیند سو رہا تھا۔ میں ڈبے سے کودنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔ کمانڈو فوج سے سبک دوش ہونے کے بعد بھی اپنی ٹریننگ کو نہیں بھولتا۔ لیکن وقت گزرنے اور سویلین کی زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے بدن کی وہ پھرتی اور سختی کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ تین سال میں میرے جسم میں وہ سختی اور پھرتی نہیں رہی تھی۔ لیکن یہ میری زندگی اور موت کا، میری عزت اور غیرت کا معاملہ تھا۔ قدرتی طور پر میرے بدن میں ایک زبردست توانائی پیدا ہو گئی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ میں چٹان سے ٹکرا کر اسے بھی ریزہ ریزہ کر سکتا ہوں۔ میرے ساتھ جو پاک فوج کا جوان بیٹھا وہ اونگھ رہا تھا۔ میں نے اس سے بات کرنے کی بالکل کوشش نہ کی اور دروازے میں کھڑے بلکہ جھک کر اونگھتے ہوئے بھارتی سنتری کو مسلسل تکنے لگا۔ وہ اونگھتے اونگھتے ذرا نیچے کو جھکتا اور پھر جلدی سے سیدھا ہو جاتا تھا۔ لیکن اس پر نیند کا بھرپور غلبہ تھا۔

قدرت نے میرے لیے راستہ صاف کر دیا۔ سنتری ایک بار اونگھتے ہوئے نیچے کو جھکا تو اس نے سٹین گن کندھے سے اتار کر گود میں رکھی اور وہیں دروازے میں بیٹھ گیا۔ چند

لمحوں کے بعد وہ بھی اپنے دوسرے ساتھی کی طرح سر دیوار سے لگائے سو رہا تھا۔ مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ میں نے ایک نگاہ ڈبے میں ڈالی، تقریباً سبھی جوان سو رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ میرا ساتھی بھی سر کھڑکی کے تختے کے ساتھ لگائے سو رہا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنے جسم کو سمیٹ کر آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا اور دبے دبے پاؤں اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہی کوئی چار پانچ قدموں کے فاصلے پر تھا۔ ڈبے کی روشنی دونوں فوجیوں کے چہروں پر پڑ رہی تھی جو غافل ہو کر سو رہے تھے۔ ڈبے کی آخری سیٹ پر بیٹھے ہوئے پاک فوج کے ایک جوان نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پاک فوج کے جوان نے انگلی سے مجھے ایسے اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ چھلانگ لگا دو، اس وقت موقع ہے۔

میں نے کھلے دروازے میں سے باہر کی جانب دیکھا۔

باہر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ گاڑی کا بڑا شور بلند ہو رہا تھا۔ اچانک ٹرین کے انجن نے سیٹی بجائی میں وہیں بیٹھ گیا۔ اس خیال سے کہ سیٹی کی آواز پر کہیں انڈین فوجی جاگ نہ پڑے۔ مگر وہ دونوں سنتری گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ انجن کی سیٹی کی آواز سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ یا تو کوئی سٹیشن قریب آ رہا ہے یا دور سے انجن ڈرائیور نے انجن کی روشنی میں لائن پر کوئی چیز گزرتی دیکھی ہے۔ ٹرین اسی رفتار سے فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ باہر سے چھلانگ لگانے سے یہ خطرہ بھی تھا کہ میں کسی ریلوے پھاٹک یا کسی ندی نالے کے پل یا پتھروں کے اوپر گرا تو زندہ نہیں بچوں گا۔ لیکن اس وقت مجھے موت کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں فوراً اس ٹرین سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے میری بیوی جمیلہ کی شکل بار بار آ رہی تھی کہ اسے گھسیٹ کر ایک مکان کے اندر لے جایا جا رہا ہے اور وہ رو رہی ہے۔

میں نے اپنے پورے جسم کو جیسے پاؤں کے پنجوں پر اٹھا لیا اور دو تین قدم تیزی سے اٹھائے اور پھر اللہ کا نام لے کر اپنے آپ کو ڈبے سے باہر گرا دیا۔ باہر گرتے ہی تیز ہوا

کے تھپیڑوں نے مجھے ذرا سا اوپر اچھال کر آگے کی طرف اوپر اٹھایا اور پھر زمین پر گرا دیا۔ میں نے اپنے جسم کو اس چھلانگ کے لیے پوری طرح تیار کر رکھا تھا اور جسم کو گیند کی طرح اکٹھا کر لیا ہوا تھا۔ میں دھپ سے زمین پر گرا اور بجائے آگے کی طرف لڑھکنے کے زمین کے اندر دھنس گیا۔ یہ میری بے حد خوش قسمتی تھی کہ میں ایک ایسے کھیت میں گرا تھا جس میں چھوٹی چھوٹی فصل اگی ہوئی تھی اور شاید دن کے وقت پانی دیا ہوا تھا جو اب کیچڑ کی طرح بن چکا تھا۔ میں کیچڑ میں گرا تھا۔ کھیت کا کیچڑ بالکل دلدل کی طرح ہوتا ہے۔ میں کھیت کی دلدل پر گرا تھا اور چونکہ میری رفتار بھی ٹرین کی رفتار کے برابر تھی اس لیے گرتے ہی وہیں آگے کی جانب چھ سات قدم تک رول ہوتا چلا گیا اور جب رکا تو میں کیچڑ میں لت پت ہو چکا تھا۔ یہ فروری کا مہینہ تھا۔ رات کو سردی ہو جاتی تھی مگر بھارت کے مشرقی علاقوں میں اتنی زیادہ سردی نہیں پڑتی اور کلکتے اور بہار کے علاقے میں دسمبر جنوری میں بھی پنجاب کے علاقوں والی سردی نہیں ہوتی۔ میں جلدی سے اٹھا اور محسوس کیا کہ مجھے کہیں بھی کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ میں نے ریلوے لائن کی طرف دیکھا جس ٹرین سے میں نے چھلانگ لگائی تھی اس کے آخری ڈبے کی سرخ بتی دور ہوتی جا رہی تھی اور اب انگارے کی طرح لگ رہی تھی۔

میں کھیت سے باہر نکل آیا۔ میرے سارے کپڑے بلکہ سارا جسم کھیت کے کیچڑ میں لت پت ہو گیا تھا۔ میں نے ریلوے لائن کراس کی اور دوسری طرف جو کھیت تھے ان کی اونچی فصل میں گھس گیا اور پیچھے کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ اس بات کا امکان کم تھا کہ میرے فرار کا علم میرے ڈبے کے بھارتی سنتریوں کو ہو۔ لیکن خدشہ ضرور تھا کہ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ میں ڈبے سے فرار ہو گیا ہوں تو شاید ٹرین میری تلاش میں واپس آ جائے۔ لیکن اس بات کا امکان بھی بہت کم تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اگلے سٹیشن پر اگر گاڑی رکے اور میرے فرار کا پتہ چل جائے تو ٹرین کی بھارتی فوجی گارڈ وائرلیس پر پیچھے کی چھاؤنی میں یا آگے کے کسی فوجی ہیڈ کوارٹر کو اطلاع کر دے اور اس سارے علاقے میں میری تلاش شروع ہو جائے۔ لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں تھی کہ ساری کی ساری ٹرین واپس آ جائے اور اسی وقت علاقے میں میری تلاش شروع ہو جائے۔ چنانچہ میں کسی حد تک بے فکر سا ہو گیا تھا۔ میں پیچھے کی جانب اس طرح کھیتوں میں چل رہا تھا کہ ہر قدم پر ریلوے لائن سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

رات کا اندھیرا گہرا تھا اردگرد کہیں کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ آگے کافی فاصلے پر ایک ریلوے سگنل کی سبز بتی سبز نقطے کی طرح ٹمٹما رہی تھی۔ شاید اس سگنل کی بتی سرخ تھی اور سگنل ڈاؤن نہیں ہوا تھا جس کو دیکھ کر انجن نے وسل دیا تھا۔ آسمان پر بے شمار ستارے چمک رہے تھے۔ ان کی دھندلی دھندلی چمک میں مجھے اردگرد کے کھیت نظر آنے لگے تھے۔ کیچڑ میں لت پت ہونے کی وجہ سے مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ بنگال بہار کے علاقے میں میں دو ایک بار پہلے بھی آ چکا تھا۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ فروری کے مہینے میں بنگال میں رات کو اتنی ٹھنڈ نہیں ہوتی جتنی مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ میں بنگال سے آگے صوبہ بہار میں داخل ہو چکا تھا۔ کیونکہ بہار میں آتے آتے سردی شروع ہو جاتی تھی۔ پاکستان کی نئی نسل کو انڈیا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ نہ اس کی تاریخ کا علم ہے، نہ اس کے جغرافیے کا کچھ پتہ ہے۔ نئی نسل کو یہ بھی پوری طرح سے معلوم نہیں کہ حضرت علامہ اقبال نے برصغیر میں مسلمان کے لیے ایک علیحدہ مملکت کا تصور کیوں پیش کیا تھا اور قوم نے قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں پاکستان کیوں بنایا تھا۔ نئی نسل صرف انڈیا کے گانے سننا اور ڈش انٹینا پر اس کی فلموں کے فحش ناچ دیکھنا ہی جانتی ہے۔ اسے یہ تک نہیں معلوم کہ بھارت میں ہندو قوم کا راج ہے جو ازل سے اسلام کی دشمن ہے اور جس نے پاکستان کے وجود کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا اور جس کی حکومت نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ پاکستان کو کبھی خوشحالی اور ترقی کی منزل کی طرف گامزن نہیں ہونے دیں گے اور جس نے ہندوستان میں آباد کروڑوں مسلمانوں کو باقاعدہ اپنا غلام بنا رکھا ہے اور جس نے حال ہی میں مسلمانوں کی تاریخی بابری مسجد کو شہید کروا دیا تھا۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کو ساری دنیا جانتی ہے، نہیں جانتی تو ہماری نئی نسل کے نوجوان نہیں جانتے اور جن کو ان حقائق سے روشناس کرانے کی اشد ضرورت ہے اور

میں انہیں ان حقائق سے روشناس کراتا رہتا ہوں۔ ہندو سکھوں میں بھی اچھے لوگ ہیں لیکن یہاں انفرادیت کی بات نہیں ہو رہی۔ یہاں پوری ہندو قوم کی بات ہو رہی ہے۔ ہندو حکومت کی، ہندو راج کی بات ہو رہی ہے جس کو پاکستان کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے اور جو اسے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ بھارت میں ہمیشہ ہندو کی حکومت رہی ہے اور ہر حکومت ہندو قوم کو یہ نعرہ دے کر اقتدار سنبھالتی ہے کہ وہ نہ صرف بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کی شدھی کر کے انہیں ایک دن ہندو بنا دے گی بلکہ پاکستان کو بھی ختم کر کے اسے دوبارہ بھارت میں شامل کر دے گی۔ یہ میں کوئی سنی سنائی بات نہیں کر رہا۔ اس حقیقت سے ہر کوئی واقف ہے بلکہ اب تو ہندو سیاسی جماعتوں کے لیڈر سٹیج پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ بھارت کے مسلمانو! یا ہندو بن کر بھارت میں رہو اور اگر ہندو بن کر نہیں رہنا تو بھارت سے نکل جاؤ۔ یہ ہے اس ہندو قوم کی اصلیت۔ جو دوسرے ملکوں کے سامنے جمہوریت کی رٹ لگاتے ہوئے نہیں تھکتی۔ آپ تو پاکستان میں رہتے ہیں۔ ہماری نئی نسل میں سے نناوے فی صد نوجوانوں نے ہندو کو نہیں دیکھا وہ اس کی ذہنیت کو کیا سمجھیں گے۔ ہماری نئی نسل تو ہندو کو ڈش انٹینا کے چینل پر فحش ڈانس کرتے، فحش گانے گاتے دیکھتی ہے۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ متعصب کٹر ہندو قوم ہے جس نے بابری مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اسے شہید کر دیا تھا اور جس کی حکومت آج کشمیریوں پر اپنی فوج مسلط کر کے ہر قسم کے انسانیت سوز مظالم ڈھا رہی ہے۔

بہرحال ایک ادیب اور محب وطن ادیب ہونے کے ناطے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں وہ اپنی نئی پاکستانی نسل کے نوجوانوں کو بھی دکھا دوں تاکہ وہ صرف عبرت ہی نہ پکڑیں بلکہ اپنے دشمن سے ہوشیار رہیں۔ میری پوری داستان سے بھی جو میں آپ کو سنا رہا ہوں اور جو میری آپ بیتی ہے یہی مطلب نکلتا ہے کہ اپنے دشمن سے ہوشیار رہیں۔ اپنے ملک پاکستان کی سرحدوں کو پہچانیں اور اپنے فرض کو ادا کریں جو اسلام کی طرف سے اور پاکستان کی عظمت اور حرمت کی طرف سے آپ پر عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی راہ پر چل کر قومیں ترقی کرتی ہیں اور عزت و وقار کی زندگی بسر کرتی ہیں اور تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف میں لکھا جاتا ہے۔

اب میں واپس اپنی داستان کی طرف آتا ہوں۔

اگر آپ بھارت کے صوبہ بنگال سے مشرقی پنجاب کی طرف آئیں تو بنگال کے آگے بہار کا صوبہ آتا ہے۔ بنگال میں سردیوں میں بھی موسم خوشگوار رہتا ہے۔ صوبہ بہار میں جیسے جیسے آپ آگے اتر پردیش کی طرف آتے جائیں گے سردی بڑھتی جائے گی۔ رات کی خنکی مجھے بتا رہی تھی کہ میں صوبہ بنگال سے نکل آیا ہوں اور صوبہ بہار کے علاقے میں ہوں کیونکہ رات سرد تھی۔ چلنے سے اور ہوا لگنے سے میرے کپڑوں اور جسم کے ساتھ چپکا ہوا کیچڑ خشک ہوتا جا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر راستے میں کوئی تالاب آگیا تو میں اس میں نہا کر اور کپڑے دھو کر اپنے آپ کو صاف کر لوں گا۔ بنگال کے اکثر دیہات میں اور صوبہ بہار میں کہیں کہیں دیہات میں یا دیہات سے باہر تالاب مل جاتے ہیں جہاں عورتیں پانی بھی بھرتی ہیں، کپڑے بھی دھوتی ہیں اور پتلی ساڑھیاں باندھ کر نہاتی بھی ہیں۔ ستاروں کی روشنی اگرچہ دھندلی تھی مگر مجھے ہر شے نظر آنے لگی تھی۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں میں ٹرین سے چھلانگ لگانے کے بعد آگے کی طرف جانے کی بجائے پیچھے کی طرف جا رہا تھا۔ کیونکہ مجھے کلکتے پہنچنا تھا۔ ٹرین کا سفر مجھے بتا رہا تھا کہ میں کلکتے سے کافی دور آگے کی طرف نکل آیا ہوں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میں کسی سٹیشن پر پہنچ گیا تو کسی ٹرین میں بیٹھ کر کلکتے کی طرف نکلنے کی کوشش کروں گا۔

میرے ڈھاکہ کے دوست حاجی شمس الدین نے مجھے انڈین کرنسی میں جو چھ سات ہزار روپے دیے تھے وہ سارے ہلی سٹیشن کے علاقے میں بھارتی فوجیوں نے مجھ سے چھین لیے تھے۔ لیکن میں نے ہزار ہزار روپے کے دو نوٹ اور ایک نوٹ سو روپے کا رومال میں لپیٹ کر اپنی ٹانگ کے ساتھ پاجامے کے اندر چلتے وقت باندھ لیے تھے۔ وہ رقم میرے پاس محفوظ تھی۔ رومال میں بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے یہ بھارتی نوٹ کیچڑ میں لت پت ہونے اور بھیگنے سے بچ گئے تھے۔ میں نے ایک جگہ بیٹھ کر رومال میں سے سو روپے

کا نوٹ نکال کر اپنے کرتے کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ باقی ہزار ہزار روپے کے دونوں نوٹ اسی طرح رومال میں لپیٹ کر ٹانگ کے ساتھ اوپر کر کے باندھ لیے تھے۔

میرے اردگرد کافی فاصلے پر کہیں کہیں پہاڑیوں کے خاکے نظر آرہے تھے۔ زمین کہیں میدانی تھی، کہیں اونچی نیچی ہو جاتی تھی۔ کہیں کھیت آجاتے تھے اور کہیں بنجر قسم کا میدان آجاتا تھا۔ میں ایک گاؤں کے قریب سے گزرا۔ ایک دو جگہوں پر مٹی کے تیل کی لالٹین جل رہی تھی۔ میری بو پا کر دور کوئی کتا تھوڑی دیر بھونک کر چپ ہوگیا۔

میں ایک کچے راستے پر جا رہا تھا۔ گاؤں سے آگے جا کر ایک تالاب آگیا۔ تالاب کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں سیڑھیوں میں بیٹھ گیا اگرچہ مجھے سردی لگ رہی تھی لیکن اپنے آپ کو اور کپڑوں کو کیچڑ سے صاف کرنا بھی ضروری تھا۔ میں نے کپڑے اتار کر انہیں تالاب کے ٹھنڈے پانی سے اچھی طرح دھویا۔ پھر نچوڑ کر ایک جھاڑی پر ڈال دیا۔ اسکے بعد اپنے جسم پر پانی ڈال کر جسم کو اور سر میں لگے ہوئے کیچڑ کو صاف کیا۔ جلدی سے گیلے کپڑے ہی پہن لیے کیونکہ ننگے بدن سردی محسوس ہو رہی تھی۔ گیلے کپڑے پہلے تو بڑے ٹھنڈے لگے لیکن ذرا دیر بعد ہی جسم کی گرمی سے ان کی ٹھنڈک بہت حد تک دور ہوگئی۔ میں نے بھی اس خیال سے تیز تیز چلنا شروع کر دیا کہ تیز چلنے سے جسم گرم ہوگا اور سردی کا احساس بھی کم ہو جائے گا اور کرتا پاجامہ بھی سوکھ جائیں گے۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ میرا خیال ہے رات کے نو بجے کا وقت ہوگا۔ کیونکہ میں نے شروع رات میں ہی ٹرین سے چھلانگ لگائی تھی۔ میں کچے راستے پر چلتا رہا۔ اندھیری رات میں کسی گاؤں کی جھونپڑیاں سی نظر آئیں اور میں ان سے دور دور رہ کر آگے نکل جاتا۔ میری نگاہ دور آسمان پر لگی تھی کہ شاید کہیں ریلوے کا کوئی سگنل نظر آجائے۔

آخر مجھے دور سے ایک سرخ بتی ٹمٹماتی نظر پڑی۔

میں اس کی طرف بڑھنے لگا۔ تھوڑی دور گیا ہوں گا کہ سرخ بتی ایک دم سبز ہوگئی۔ یہ ریلوے سگنل ہی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پیچھے بہار کے کسی شہر کی جانب سے کوئی گاڑی آرہی تھی۔ یہ گاڑی کلکتے کی طرف ہی جا رہی ہوگی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ لیکن

میں سٹیشن سے کافی پیچھے تھا اسی دوران مجھے انجن کے وسل کی دور سے آتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا دور کافی فاصلے پر مجھے اندھیرے میں ایک ریل گاڑی کے ڈبوں کی جھلملاتی ہوئی روشنیاں دکھائی دیں۔ پھر ٹرین کی ہلکی ہلکی آواز آنے لگی۔ ٹرین آگے کی طرف چلی جا رہی تھی۔ میں چلتا بھی رہا اور ٹرین کو دور سے دیکھتا بھی رہا۔ جب ٹرین ریلوے سگنل کے نیچے سے گزر گئی تو تو اس کی سبز بتی پھر سے سرخ ہوگئی۔ میں اس ٹرین کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ لیکن یہ جان کر مجھے حوصلہ ہوگیا تھا کہ میں کسی ریلوے سٹیشن پر پہنچ گیا ہوں، جہاں سے مجھے کلکتے کی طرف جانے والی گاڑی ضرور مل جائے گی۔ یہ احساس ضرور تھا کہ اس ٹرین میں سے کچھ بھارتی فوجی میری تلاش میں وہاں نہ آگئے ہوں، لیکن اس کا امکان بہت کم تھا۔ ویسے بھی ان لوگوں کو میرا حلیہ معلوم نہیں تھا۔ میرا لباس بھی بنگالی تھا اور میں بنگلہ زبان بھی بول لیتا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد میں ایک ریلوے سٹیشن پر آگیا۔

یہ بے رونق سادہ ساتی سٹیشن تھا۔ جس ٹرین کو میں نے دیکھا تھا وہ جا چکی تھی۔ پلیٹ فارم سرد رات میں سنسان پڑا تھا۔ سٹیشن کی ڈیوڑھی میں کچھ مسافر ضرور بیٹھے اونگھ رہے تھے بلکہ سو رہے تھے۔ کھدر کے بنگالی ٹائپ کے کرتے پاجامے میں مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن میں تو اپنی طرف سے کلکتے جانے کے لیے نکلا تھا جہاں اس موسم میں کوٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ ٹکٹ گھر کھلا تھا، اندر ایک بوڑھا بہاری بابو بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں سے کلکتے کو اگلی گاڑی کب جائے گی۔ اس نے نیند بھری آواز میں کہا۔

"رات کو ایک بجے جائے گی۔"

میرے لیے وہاں رات کے ایک بجانے قیامت بن گئے۔ خالی بنچ پر بیٹھا تو سردی نے بیٹھنے نہ دیا، لیٹ گیا تو زیادہ سردی لگنے لگی۔ بس کبھی چل کر کبھی بیٹھ کر آدھی رات گزار دی۔ آدھی رات کے بعد ٹی سٹال کھل گیا۔ میں نے چائے بھی پی اور اس کے ساتھ دو بند مکھن بھی کھائے۔ بڑی بھوک لگی تھی۔ چائے کے دو گلاس پیئے تو جسم میں گرمائش آ

گئی۔ کلکتے کا ٹکٹ میں نے پہلے ہی خرید رکھا تھا۔ گاڑی آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ معلوم ہوا ٹرین لیٹ ہے۔ رات کے اڑھائی بجے پیچھے سے ایک ٹرین آ کر رکی۔ ڈبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ تقریباً سبھی مسافر سو رہے تھے۔ میں ایک کمپارٹمنٹ میں داخل ہو کر سامان کے پاس فرش پر ہی بیٹھ گیا۔

یہ گاڑی اگلے روز دن کے گیارہ بجے کلکتے پہنچی۔

میرے ڈھاکہ کے بنگالی دوست حاجی شمس الدین نے مجھے کلکتے میں اپنے ایک مسلمان بنگالی دوست کا ایڈریس بھی دیا تھا اور کہا تھا کہ میں اسی کے پاس جا کر ٹھہروں۔ اس کا نام حاجی فرید احمد تھا اور وہ بہو بازار میں گھڑیوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ وہاں اس کی اپنی دکان تھی۔ کلکتے میں موسم خوشگوار تھا۔ سردی بالکل نہیں تھی بلکہ دھوپ میں گرمی لگتی تھی۔ اس شہر میں میں ایک دو بار ویزے پر پہلے بھی آ چکا تھا۔ رکشا لے کر میں بہو بازار آ گیا۔ وہاں ایک جگہ سے حاجی فرید احمد گھڑی ساز کا پوچھا اور اس کی دکان پر پہنچ گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کا سانولے رنگ کا دبلا پتلا آدمی سر پر حاجیوں والی سفید ٹوپی پہنے آنکھوں پر محدب شیشے کی عینک لگائے ایک گھڑی کی مرمت کر رہا تھا۔ چھوٹی سی دکان تھی جس میں اندر جانے کا راستہ بھی تھا۔ شوکیس میں گھڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر اس آدمی نے عینک اتار کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے سلام کیا اور کہا کہ میں ڈھاکہ سے آ رہا ہوں اور مجھے حاجی شمس الدین نے حاجی فرید احمد کے پاس بھیجا ہے۔

اس نے کہا۔

"میں ہی حاجی فرید احمد ہوں۔ تشریف رکھیں۔"

میں دیوار کے ساتھ لگے بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے مختصر کر کے اسے اپنی ساری بپتا سنائی تو وہ بڑا متاثر ہوا۔ کہنے لگا۔

"مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں آپ کے لیے کروں گا۔"

اس نے میرے لیے چائے منگوائی۔ پھر دکان کے باہر کھڑے ہو کر کسی کو آواز دی۔ ایک لڑکا ساتھ والی دکان سے نکل کر آ گیا۔

حاجی صاحب نے اسے بنگلہ میں کہا۔

"یہاں دکان پر بیٹھو' میرے مہمان آئے ہیں۔"

حاجی صاحب مجھے لے کر اپنے فلیٹ پر آ گئے جو دکان کے پہلو میں ایک گلی میں واقع تھا۔ انہوں نے مجھے کھانا کھلایا۔ اس کے بعد چائے منگوائی اور کہنے لگے۔

"تم نے دھرمو اور کھیا جن دو ہندو بنگالیوں کے نام بتائے ہیں اور جو ایڈریس تمہیں شمس الدین نے لکھ کر دیا ہے' یہ جگہ جرائم پیشہ لوگوں کا گڑھ ہے۔ میں تمہیں اکیلے وہاں جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ اس وقت کلکتے میں مکتی باہنی والے بے شمار پنجابی اور بہاری مسلمان لڑکیاں بنگلہ دیش سے اغوا کر کے لائے ہیں اور انہیں ادھر ادھر بیچ رہے ہیں۔ مجھے ایک دن کی مہلت دو۔ میں اپنے اثر رسوخ سے تمہاری بیوی کا کھوج لگانے کی پوری کوشش کروں گا۔"

حاجی فرید احمد کا مشورہ مجھے ہر حالت میں قبول کرنا پڑا۔ کیونکہ میں اکیلا ایک اجنبی شہر میں' اجنبی لوگوں سے وہ سب کچھ معلوم نہیں کر سکتا تھا جو حاجی فرید معلوم کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ دوپہر کے بعد حاجی فرید احمد مجھے اپنے فلیٹ میں چھوڑ کر اپنی مہم پر نکل گیا۔ شام ہو رہی تھی جب وہ واپس آیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

"کچھ پتہ چلا۔"

وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ حالات غیر موافق ہیں۔ کہنے لگا۔

"میں نے اپنے خاص ذریعے سے معلوم کیا ہے کہ تم نے اپنی بیوی کا جو حلیہ اور نام بتایا ہے اس حلیے اور اس نام کی عورت اس وقت کلکتے میں نہیں ہے۔"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر وہ کہاں ہے؟"

حاجی فرید احمد سب کچھ معلوم کر کے آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"میرے آدمی کو خود کھیا نے بتایا ہے کہ اس حلیے اور اس نام کی پنجابی عورت کو انہوں نے محمد پور کے ایک مکان سے اغوا کیا تھا اور اسے کملا وتی نام کی ایک عورت خرید کر

اپنے ساتھ بردوان لے گئی ہے۔"

"یہ عورت کون تھی؟" میں نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔ حاجی فرید احمد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں تو اسے نہیں جانتا لیکن کھیا نے میرے آدمی کو یہی بتایا ہے کہ کملاوتی بردوان سے آئی تھی۔ اس نے مکتی باہنی کے ایجنٹ سے تمہاری بیوی جمیلہ کا سودا چکایا اور اسے ساتھ لے کر واپس بردوان چلی گئی۔"

میں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔

"کیا اسے یقین ہے کہ جس عورت کو کملاوتی نے خریدا ہے وہ میری بیوی جمیلہ ہی تھی۔"

حاجی صاحب بولے۔

"میرے آدمی نے خاص طور پر یہ سوال کھیا سے پوچھا تھا۔ جس کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ اس پنجابی عورت نے اپنا یہی نام بتایا تھا۔"

میں سرد آہ کھینچ کر رہ گیا۔ دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ خون کھول رہا تھا۔ کبھی میں شدت جذبات سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیتا، کبھی میرا جسم بالکل سن ہو جاتا۔ میں نے حاجی صاحب سے کہا۔

"میں کھیا نام کے آدمی سے خود ملنا چاہتا ہوں تاکہ میری تسلی ہو جائے کہ جس عورت کو انہوں نے کملاوتی کے ہاتھ فروخت کیا ہے وہ میری بیوی جمیلہ ہی تھی۔"

حاجی صاحب نے کہا۔

"میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ لیکن تم اپنی تسلی ضرور کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں کھیا کا اڈہ بتا دیتا ہوں۔ وہاں جا کر تم اسے مل لو۔ لیکن تم شریف آدمی ہو اور وہاں سبھی جرائم پیشہ لوگ ہوتے ہیں۔ وہاں شراب بھی بکتی ہے اور برے کردار کی عورتیں بھی آتی جاتی ہیں۔"

میں نے کہا۔

"آپ مجھے کھیا کے اڈے کا پتہ بتا دیں میں ایک بار اس شخص سے ضرور ملنا چاہتا ہوں۔"

حاجی فرید احمد میری طرف دیکھنے لگے۔ بولے۔

"وہاں طیش میں آ کر کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا، یہ تمہارے دشمنوں کا ملک ہے اور ان جرائم پیشہ لوگوں کو علاقے کی پولیس کی پوری حمایت حاصل ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کروں گا، آپ مطمئن رہیں۔"

حاجی فرید احمد نے مجھے کھیا کے اڈے کا پورا ایڈریس بتا دیا اور میں شام کا اندھیرا پھیلتے ہی ٹرام میں بیٹھ کر اس طرف روانہ ہو گیا۔

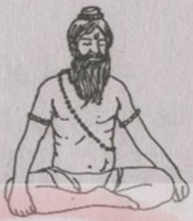

کھیا کا اڈہ کلکتے کے ایک گنجان آبادی والے محلے کی بوسیدہ سی تنگ گلی میں تھا۔ مجھے حاجی فرید احمد نے کھیا کا حلیہ بتا دیا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی نیم روشن دکان تھی جس کے اندر لکڑی کے بنچوں پر مزدور قسم کے خستہ حال بنگالی بیٹھے دیسی شراب اور تاڑی وغیرہ پی رہے تھے اور تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ میں بھی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ ایک بنگالی لڑکا میرے پاس آکر بولا۔

"کیا پیو گے بابو؟"

یہ اس نے بنگلہ زبان میں پوچھا تھا۔ میں نے بنگلہ میں کہا۔

"مجھے اڈے کے مالک کھیا دادا سے ملنا ہے۔ کیا وہ اس وقت یہاں ہے۔"

لڑکے نے کہا۔ "میرے ساتھ آجاؤ۔"

لڑکے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی لوگوں کو کھیا دادا کے پاس لے جاتا رہا ہے۔ میں ذہن میں ایک منصوبہ بنا کر آیا تھا۔ لڑکا مجھے ایک کوٹھڑی میں لے گیا جہاں پنکھا چل رہا تھا۔ ایک باڈی بلڈر ٹائپ کا بنگالی بنیان اور نیکر پہنے کھاٹ پر ایک عورت کو لیے بیٹھا تھا۔ سامنے لوہے کی تپائی پر شراب کی بوتل اور گلاس پڑا تھا۔ لڑکے نے بنگلہ میں کہا۔

"دادا یہ تمہیں ملنے آیا ہے۔ نیا گاہک معلوم ہوتا ہے۔"

کھاٹ پر بیٹھے ہوئے کھیا دادا نے مجھے گھور کر دیکھا اور عورت کو پیچھے ہٹاتے ہوئے

بولا۔

"کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟"

میں لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا میں نے بنگلہ میں کہا۔

"دادا! میرا نام مدن لعل ہے۔ میں جمشید پور سے مال خریدنے تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"تم جمشید پور میں کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"اپنا اڈہ چلاتا ہوں۔ سنا ہے باڈر پار سے کچھ مال آیا ہے۔ اگر دکھا دو تو ابھی سودا چکا دوں گا؟"

اس کے ساتھ ہی میں نے کرتے کی جیب میں سے سو سو کے چار نوٹ نکال کر کھیا دادا کی طرف بڑھا دیے اور بنگلہ میں ہی کہا۔

"یہ میری طرف سے نذرانہ سویکار کریں۔ مال پسند آگیا تو باقی رقم اسی وقت چکا دوں گا۔"

سو سو کے نوٹ دیکھ کر کھیا کا چہرہ کھل گیا۔ اس نے جلدی سے نوٹ اٹھا کر سرہانے کے نیچے رکھے اور بولا۔

"مدن لعل جی آپ نے دیر کر دی۔ باڈر پار سے بڑا اچھا مال لائے تھے۔ بہت سا بک گیا ہے۔ چند ایک نگینے رہ گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"کھیا دادا! اگر محمد پور کا کوئی مال ہو تو میں اسے پسند کروں گا۔ کیونکہ وہاں بڑے کھاتے پیتے غیر بنگالی رہتے تھے۔"

کھیا کھاٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے عورت کو باہر بھجوا دیا تھا۔ کہنے لگا۔

"محمد پور سے دس بارہ لڑکیاں اٹھائی تھیں۔ یہ سالے مکتی باہنی والے بڑا تنگ کرتے تھے۔ انہیں بھی کافی رقم دینی پڑتی تھی۔ اس وقت جو مال باقی بچا ہے وہ میرے اڈے پر

نہیں ہے۔ ان عورتوں کی تصویریں ہم نے لے کر کاپی میں لگائی ہوئی ہیں تاکہ ایجنٹوں کو دکھا سکیں۔ آپ تصویریں دیکھ کر پسند کر لیں۔"

اس نے دیوار میں بنی ہوئی الماری کھول کر ایک پرانی کاپی نکالی اور اسے کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ کاپی میں مختلف عورتوں کی پاسپورٹ سائز کی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ان تصویروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ عورتوں کو زبردستی کرسی پر بٹھا کر تصویریں اتاری گئی ہیں۔ ایک فوٹو میں تو اس آدمی کا بازو بھی نظر آ رہا تھا جس نے بدنصیب عورت کو پکڑ رکھا تھا۔ میں بے تاب نظروں سے تصویروں کو دیکھنے لگا۔ ایک تصویر پر نظر پڑتے ہی میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دوبارہ آنکھیں کھول کر فوٹو کو دیکھا۔ یہ میری بیوی جمیلہ کی فوٹو تھی۔ اس کے سر پر دوپٹہ نہیں تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی آواز کو اپنے قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ عورت اچھی لگتی ہے۔"

مکھیا نے آگے جھک کر میری بیوی جمیلہ کی فوٹو دیکھی اور ہنس کر بولا۔

"بابو! تم نے دیر کر دی۔ یہ مال تو بردوان کی ایک عورت کل ہی خرید کر لے گئی ہے۔ یہ عورت ہم نے محمد پور ہی سے اٹھائی تھی اور فوٹو دیکھو۔"

اس نے ایک عورت کی فوٹو پر انگلی رکھ کر کہا۔

"اسے ہم نے گلستان کے علاقے کی ایک کوٹھی سے اٹھایا تھا۔ کسی افسر کی بیوی ہے۔ یہ مال ابھی تک میرے پاس ہے۔ کہو تو ابھی چل کر دکھا دوں۔"

میں نے کاپی بند کرتے ہوئے کہا۔

"مکھیا جی! میں کل اسی وقت آؤں گا اور جو مال بچ گیا ہے اسے دیکھ لوں گا۔ لیکن مجھے یہ عورت پسند آ گئی ہے تم اگر مجھے بردوان والی عورت کا نام پتہ بتا دو تو میں اس کو زیادہ پیسے دے کر اس عورت کو خریدنے کی کوشش کروں گا۔"

مکھیا کہنے لگا۔

"وہ عورت بڑی تجربہ کار پرانی نائیکہ ہے۔ وہ اسے آگے کبھی نہیں بیچے گی۔ اس کو تو سونے کا انڈہ دینے والی مرغی مل گئی ہے۔"

میں نے کہا۔

"دادا! تم اس عورت کا نام پتہ بتا دو۔ میں ایک کوشش ضرور کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ کاپی کو بند کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس عورت کا نام کملا وتی ہے۔ بردوان کبھی پہلے گئے ہو؟"

"نہیں میں وہاں پہلے کبھی نہیں گیا۔"

"تو پھر ایسا کرو۔" مکھیا کان کھجاتے ہوئے بولا۔ "بردوان کے سٹیشن کے پیچھے کسٹم گھاٹ نام کی بستی ہے۔ اس بستی میں کسی پان سگریٹ والے کی دکان سے کمو بائی کا پوچھ لینا۔ وہ تمہیں اس کا گھر بتا دے گا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"مکھیا دادا! تمہارا دھنواد۔"

مکھیا مجھے باہر تک چھوڑنے آیا۔ کہنے لگا۔

"بردوان سے واپس آ کر مجھے ضرور ملنا۔ میں تمہیں اور بھی بڑا اچھا مال دکھاؤں گا۔ ابھی تو ادھر سے تازہ مال آنے والا ہے۔"

میں نے شراب کے اڈے کے باہر آ کر مکھیا سے ہاتھ ملایا اور گلی میں واپس چل پڑا۔ وہاں سے میں رکشا میں بیٹھ کر بہو بازار حاجی فرید احمد کے مکان پر آ گیا۔ وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر سکون سا آ گیا۔ کہنے لگے۔

"خدا کا شکر ہے تم خیریت سے واپس آ گئے۔ تمہیں بھیج کر میں پچھتا رہا تھا کہ غنڈوں کے اڈے پر بھیج دیا ہے خدا خیر کرے۔"

میں نے انہیں سارا واقعہ سنایا تو میری جرات پر حیران رہ گئے۔ کہنے لگے۔

"تم نے تو کمال کر دکھایا۔ تو کیا اب بردوان جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "ضرور جاؤں گا۔ دعا کریں مجھے میری بیوی مل جائے۔"

حاجی صاحب نے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔"

رات میں نے بے چینی سے گزاری۔ صبح سات بجے کی گاڑی میں بیٹھ کر میں کلکتے کے ہاوڑا اسٹیشن سے بردوان کی طرف روانہ ہوگیا۔ مغربی بنگال سے جب آپ صوبہ بہار کی طرف جاتے ہیں تو دھنباد اور آسنول سے پہلے بردوان کا شہر آتا ہے۔ بردوان کلکتے سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ڈیڑھ پونے دو گھنٹوں میں گاڑی نے مجھے بردوان پہنچا دیا۔ سٹیشن سے باہر آکر میں نے کشم گھاٹ بستی کا پوچھا اور سٹیشن کے عقب میں ایک بستی دیکھی جو پرانے بوسیدہ مکانوں پر مشتمل تھی۔ جگہ جگہ مکانوں کے بیچ میں سے ناریل کے درختوں کے جھنڈ اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ مکھیا نے بتایا تھا کہ یہاں پہنچ کر کمو بائی کا کسی سگریٹ پان والے سے پوچھ لینا۔ سگریٹ پان کا ایک کھوکھا بستی کے شروع میں ہی تھا۔ کھوکھے والا بنگالی گردن ایک طرف کیے پان لگا رہا تھا۔ میں نے کمو بائی کا پوچھا تو اس نے ایک نظر مجھ پر اوپر سے نیچے تک ڈالی اور بنگالی میں کہا۔

"صبح صبح کس کا نام پوچھنے آگئے ہو بابو۔ ادھر آگے چلے جاؤ۔ کونے والا مکان ہے اس کا۔"

میں خاموشی سے جس طرف اس نے بتایا تھا اسی طرف چل پڑا۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک تھی۔ مکانوں کی دیواریں دھوپ اور بارش سے خراب ہو رہی تھیں۔ ڈھلانی چھتوں پر کائی جمی ہوئی تھی۔ گندے مندے نیم عریاں کالے کالے بچے کھیل رہے تھے۔ میں کونے والے مکان کے سامنے جا کر رک گیا۔ مکان کے صحن کی دیوار شکستہ ہو رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ وہاں کوئی بھی انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو تین منٹ بعد کسی نے اندر سے بنگالی میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

میں نے بنگالی میں کہا۔

"کمو بائی سے کہو جمشید پور سے ایک مہمان آیا ہے۔"

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر اندر سے کنڈی اتارنے کی آواز کے ساتھ دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ ایک سانولی سی تیکھے ابروں والی لڑکی نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"اندر آجاؤ۔"

میں صحن میں داخل ہوگیا۔ لڑکی نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی اور میرے آگے آگے چلتے ہوئے بنگالی زبان میں کہنے لگی۔

"میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔"

صحن میں ایک طرف گائے بندھی ہوئی تھی۔ لڑکی نے مجھے ایک کمرہ کھول کر اندر بٹھا دیا اور یہ کہہ کر چلی گئی کہ بائی جی ابھی آتی ہیں۔ کمرے میں پرانے زمانے کا صوفہ پڑا تھا۔ دیوار پر کسی فلم ایکٹریس کی ڈانس کے پوز کی بڑی رنگین تصویر لگی ہوئی تھی۔ لڑکی نے چھت کا پنکھا چلا دیا تھا۔ اتنے میں ایک موٹے بدن کی سانولی عورت اندر آئی۔ اس نے جامنی رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ ساڑھی میں سے اس کا بھدا جسم جگہ جگہ سے نظر آ رہا تھا۔ وہ پان کھا رہی تھی۔ چہرے سے بڑی تجربہ کار اور عیار عورت لگتی تھی۔ میں نے اٹھ کر نمسکار کیا اور کہا۔

"آپ ہی کملاوتی جی ہیں؟"

"ہاں۔" اس نے صوفے کے پاس کھڑے کھڑے میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم کون ہو؟ کیا کام ہے؟"

وہ بنگلہ زبان بول رہی تھی۔ میں بھی بنگلہ بول رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"بائی جی! میں جمشید پور سے آیا ہوں میرا نام مدن لعل ہے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو روپے کے دو نوٹ نکال کر اس کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"جلدی میں آپ کے لیے مٹھائی وغیرہ نہیں خرید سکا یہ میری طرف سے قبول کریں۔"

کمو بائی نے فوراً نوٹ پکڑ لیے اور انہیں اپنے بلاؤز کے اندر ڈالتے ہوئے مسکرائی اور میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اب اس کا لہجہ بڑا شیریں ہو گیا تھا۔ کہنے لگی۔

"تم بنگالی نہیں لگتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"جی ہاں بائی جی! میں بہاری ہوں مگر بنگال میں بھی بڑی دیر رہ چکا ہوں۔"

کمو بائی نے بڑے زور سے کسی کا نام لے کر آواز دی۔ وہی سانولی لڑکی آ گئی۔ بائی نے کہا۔

"کوئی جل پان لے آ۔"

پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

"آپ دن کے وقت آئے ہیں اس وقت میں آپ کی زیادہ خدمت نہیں کر سکتی۔ اکثر لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں جا چکی ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میں تو صرف ایک لڑکی سے ملاقات کرنے کا خواہشمند ہوں۔"

ساتھ ہی میں نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کو پیش کر دیا۔ کملا بائی نے جلدی سے نوٹ لے کر بلاؤز کے اندر ڈال لیا اور پوچھا۔ "کون سی لڑکی؟"

میں نے کہا۔

"بات یہ ہے کملا بائی کہ کلکتے میں کھیا دادا میرا پرانا دوست ہے۔ جمشید پور سے میں اکثر اس کے پاس آتا جاتا رہتا ہوں۔ پچھلے دنوں میں نے اس کے پاس ایک لڑکی دیکھی جو مجھے پسند آ گئی۔ میں نے کھیا سے کہا کہ یہ لڑکی میں اس سے خریدنا چاہتا ہوں۔ وہ بولا مدن بابو۔ یہ ابھی نئی نئی آئی ہے۔ بہت ڈری ہوئی ہے۔ دو ایک روز انتظار کر لو۔ کل میں اس کے پاس گیا تو اس نے بتایا کہ لڑکی تو میں نے بردوان کی کملا بائی کے ہاتھ بیچ دی ہے۔ لڑکی کا نام اس نے جمیلہ بتایا تھا اور کھیا اور دھرمو اسے بنگلہ دیش سے اٹھا کر لائے تھے۔ بس میں اس لڑکی کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ تم جو کہو گی میں پیش کر دوں گا۔"

کملا بائی عیار عورتوں کی طرح مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"بابو! تم جس لڑکی کی بات کر رہے ہو' میں سمجھ گئی ہوں۔ وہ پنجابی لڑکی تھی۔ جمیلہ اپنا نام بتاتی تھی۔ اس کو مکتی باہنی والوں کے ساتھ مل کر دھرمو اور کھیا محمد پور کی بستی سے اٹھا کر لائے تھے۔ وہ اپنا نام کرمو دادا یا شاید کرم داد بتاتی تھی۔"

میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔

"ہاں کرم داد!! یہی اس کے خاوند کا نام تھا۔"

"تمہیں کیسے پتہ ہے؟" کملاوتی نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "مجھے کھیا نے بتایا تھا۔ وہ لڑکی کہاں ہے کملا بائی؟ مجھے اس کی ایک جھلک دکھا دو میں تمہیں ایک ہزار روپیہ دوں گا۔"

ہزار روپے کا نام سن کر کملاوتی نائیکہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کہنے لگی۔

"اس وقت تو وہ لڑکی یہاں نہیں ہے۔ میرا ایک آدمی اسے لے کر دھنباد کے ٹھاکر کے پاس گیا ہوا ہے۔ دو ایک دن میں آ جائے گی۔ تم میرے مکان پر ہی ٹھہرو میرے پاس لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔"

یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میرا جی چاہا کہ اس عورت کی ایک ہی جھٹکے سے گردن توڑ دوں۔ مگر میں بے بسی کی حالت میں تھا۔ میں نے پوچھا۔

"مجھے دھنباد کے ٹھاکر کا پتہ بتا دو۔ میں خود وہاں چلا وٴں گا۔"

کملاوتی نے تعجب کے ساتھ کہا۔

"ارے دادا! تمہیں وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہاں جاؤ گے تو ٹھاکر کے آدمی تمہاری تکا بوٹی کر دیں گے۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میرا آدمی جمیلہ کو لے کر کل نہیں تو پرسوں آ جائے گا۔ پھر تم اس کے ساتھ رات بسر کر لینا۔"

سانولی لڑکی چائے اور کچھ مٹھائی لے آئی۔ میں عجیب تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ دل میں بار بار ایک ابال سا اٹھتا تھا کہ ابھی گاڑی میں بیٹھ کر دھنباد جاؤں اور ٹھاکر کو قتل کر کے جمیلہ کو واپس لے آؤں مگر کملا بائی نے مجھے ٹھاکر کا ایڈریس بتانے سے صاف انکار کر دیا

تھا، کہنے لگی۔

"یہ ہمارا اصول نہیں ہے کہ ایک عورت کو کسی کے پاس بھیجیں اور پھر اس کے پیچھے کسی دوسرے آدمی کو رقم لے کر بھیج دیں۔"

چائے کا ہر گھونٹ مجھے زہر لگ رہا تھا۔ دماغ میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا' کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟ آخر چار و ناچار مجھے یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ پردوان میں کملا وتی کے گھر پر ہی ٹھہر جاؤں اور جمیلہ کی واپسی کا انتظار کروں۔ کملا بائی نے میرے پاس دولت دیکھ لی تھی۔ اس نے میری آؤ بھگت شروع کر دی۔ دوپہر کو خوب ترکاریاں اور مچھلی وغیرہ بنوائی۔ شراب بھی لا کر رکھ دی۔ میں نے کہا۔ "میں شراب نہیں پیتا۔"

حیران ہو کر بولی۔

"تم کیسے تماش بین ہو۔"

کملا بائی عرف کمو بائی کے اڈے پر مجرا وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ عورتوں کو شہر کے ان شریف بدمعاشوں کے ہاں سپلائی کرتی تھی جو اس کے اڈے پر نہیں آسکتے تھے اور جنہیں عیاشی کے ساتھ ساتھ اپنی عزت ناموس کا بھی بہت خیال تھا۔ وہ پولیس کو ماہانہ ادا کرتی تھی۔ اس لیے بے فکر ہو کر یہ دھندا کر رہی تھی۔

شام کے وقت باہر دو تین رکشا باری باری آکر رکے۔ ان میں سے میں نے کچھ ساڑھی والی لڑکیاں اتر کر تیزی سے کملا وتی کے مکان کی طرف آتی دیکھیں۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میرا دل اپنی بیوی جمیلہ کے خیال سے بوجھل ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک کیسا انقلاب آگیا کہ کہاں میں اپنی بیوی کے ساتھ امن اور عزت کی زندگی بسر کر رہا تھا اور کہاں اس وقت میں ایک نائیکہ کے مکان پر بیٹھا ہوں اور میری بیوی..... اس سے آگے میں نہ سوچ سکا۔ اس سے آگے میں کوئی تصور اپنے ذہن میں نہ لا سکا۔ میں اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کملا بائی اچانک اندر آگئی کہنے لگی۔

"مدن بابو! کھانا نہیں کھاؤ گے؟ آؤ میرے ساتھ۔"

اور اس نے بڑی ادائے خاص کے ساتھ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور میرے ساتھ لگ کر مجھے کمرے سے نکال کر دوسرے کمرے میں لے گئی جہاں زمین پر دری بچھی ہوئی تھی اور دسترخوان پر کھانا لگا تھا۔ دو لڑکیاں پہلے سے وہاں ریشمی ساڑھیوں میں ملبوس بیٹھی تھیں۔ انہوں نے ایک ساتھ مجھے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے نمسکار کیا اور دسترخوان پر بیٹھ گیا۔

ہم کھانا کھانے لگے۔ کھانے پر بنگلہ اور اردو دونوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ ایک لڑکی رنگ ذرا کھلتا ہوا تھا۔ وہ بنگالی نہیں لگی تھی۔ وہ اردو بھی صاف بول رہی تھی۔ کملا بائی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میری طرف جھک کر کہا۔

"یہ لڑکی تمہارے دیش کی ہے۔ بہارن ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ انگریزی بھی بول لیتی ہے۔ میں اسے تمہارے پاس بھیجوں گی۔"

اور پھر بے شرمی سے مسکراتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اری پرامیلا! تمہیں مدن بابو کیسے لگتے ہیں؟"

پرامیلا نے شرماتے ہوئے کہا۔

"اچھے لگتے ہیں۔"

مجھے یہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ میرا ذہن بار بار اپنی بیوی جمیلہ کی طرف جاتا تھا کہ وہ دھنباد میں کس کے پاس ہوگی۔ اس کے ساتھ کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ کیا سوچ رہی ہوگی۔ کہیں وہ خودکشی نہ کر لے۔ ذہن میں طرح طرح کے پریشان کر دینے والے خیال آ رہے تھے۔ میں کھانا زہر مار کر کے اپنے کمرے میں آگیا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ دماغ آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح دہک رہا تھا۔ کبھی چارپائی پر بیٹھ جاتا۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ اتنے میں دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

دوسری طرف سے کسی عورت نے اردو میں کہا۔

“میں ہوں پرامیلا۔ دروازہ کھولیں مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔”

یہ وہی لڑکی تھی جس کا تعارف دسترخوان پر کملا بائی نے مجھ سے کرایا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ جلدی سے اندر آ کر میری چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

“دروازہ بند کر دیں۔”

میں نے دروازہ بند کر دیا اور کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ “کیا بات کرنی ہے تمہیں؟”

لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

“اتنی جلدی بھی کیا ہے مدن بابو۔”

میں نے کہا۔ “مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔ جلدی بتاؤ تم مجھ سے کیا بات کرنے آئی ہو؟”

لڑکی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ کہنے لگی۔

“تم نے صبح کملا بائی کے ساتھ جمیلہ نام کی پنجابی لڑکی کے بارے میں جو باتیں کی تھیں وہ ساری میں نے سن لی تھیں۔ مجھے بتاؤ کیا سچ مچ تم اس لڑکی سے محبت کرنے لگے ہو؟”

میں محتاط ہو گیا۔ میں نے سنبھل کر کہا۔

“تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟”

وہ بولی۔ “اس لیے کہ ایک تو تم ہندو ہو۔ میرے وطن کے ہو۔ دوسرے لڑکی پنجابی ہے اور مسلمان ہے۔ تمہیں اس کا اتنا خیال کیوں ہے کہ تم اس کی خاطر کلکتے سے یہاں آ گئے ہو اور اس کے ساتھ ایک رات بسر کرنے کے ایک ہزار روپے تک دینے کو تیار ہو۔”

“میں نے یونہی کہہ دیا کہ مجھے وہ لڑکی پسند آ گئی تھی۔”

پرامیلا نے کہا۔

“صرف پسند آ جانے سے کوئی مرد کسی لڑکی کی خاطر شہر چھوڑ کر دوسرے شہر نہیں پہنچ جاتا۔”

“میرے دل میں اچانک خیال آیا کہ اس لڑکی سے جمیلہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے اسے دھنباد شہر کے اس ٹھاکر کا پتہ بھی معلوم ہو جس کے پاس کملا بائی نے جمیلا کو بھیجا ہوا ہے۔ میں نے کہا۔

“تو پھر یوں ہی سمجھ لو کہ میں اس پنجابی مسلمان لڑکی سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میں اس کی ایک جھلک دیکھنے کو بے چین ہوں۔ کیا تم مجھے دھنباد کے ٹھاکر کا مکان بتا سکتی ہو کہ کہاں ہے۔ میں دھنباد جا کر اس مسلمان لڑکی کی صرف ایک جھلک دیکھ کر واپس آ جاؤں گا۔”

پرامیلا میری طرف دیکھتے ہوئے شرارتی انداز میں مسکرا رہی تھی۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو کہنے لگی۔

“کیا سچ مچ تم اس مسلمان لڑکی سے اتنا پیار کرتے ہو؟”

میں نے کہا۔ “میں اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ پیار کرتا ہوں۔”

پرامیلا کہنے لگی۔

“اگر تم واقعی اس لڑکی سے اتنا پیار کرتے ہو تو تمہیں یہ بتانا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ وہ پنجابن لڑکی جس کا نام جمیلہ ہے اور جسے کملا بائی نے کلکتے کے کھیا سے خریدا تھا اور کھیا جسے بنگلہ دیش کی محمد پور کی بستی سے اٹھا کر لایا تھا۔ دھنباد کسی ٹھاکر کے ہاں نہیں گئی۔”

میں حیران ہو کر پرامیلا کا منہ دیکھنے لگا۔

“تو پھر----تو پھر وہ کہاں ہے؟”

پرامیلا جلدی سے اٹھ کر بند دروازے کے پاس گئی۔ اس نے کان لگا کر باہر کچھ سننے کی کوشش کی۔ پھر ایک دم سے کنڈی اتار کر دروازہ کھول دیا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی اور چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"جمیلہ کو کملا بائی نے شری راج کے آدمیوں کے ہاتھ دس ہزار روپے میں بیچ دیا ہے اور شری راج کے آدمی جمیلہ کو لے کر دلی چلے گئے ہیں۔"

یہ ایک اور دھماکہ تھا جو ایٹم بم کی طرح میرے دماغ میں ہوا۔ میں بت بن کر بیٹھا تھا اور پرامیلا جو کچھ کہہ رہی تھی اسے سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"شری راج دلی کا ایک اونچے درجے کا ماڈرن بدمعاش ہے۔ اس کے پاس کرائے کے قاتل بھی ہیں اور نہایت اونچے درجے کی حسین و جمیل ماڈرن تعلیم یافتہ طوائف لڑکیاں بھی ہیں۔ ان لڑکیوں کو وہ بھارتی سرکار کے بڑے بڑے افسروں کے ہاں بھاری معاوضے پر سپلائی کرتا ہے اور اپنی پسند کے ٹھیکے اور ٹینڈر منظور کرواتا ہے۔ بھارت کے سیاستدان اور بڑے بڑے کاروباری اداروں کے مالک اپنے کاروبار اور سیاسی حریفوں کو قتل کروانے یا ہمیشہ کے لیے غائب کروانے میں شری راج کی خفیہ مدد حاصل کرتے ہیں۔ شری راج اس کے عوض لاکھوں روپے کا معاوضہ وصول کرتا ہے۔ پولیس کو سب کچھ معلوم ہے مگر وہ اس کو ہاتھ نہیں ڈال سکتی کیونکہ شری راج کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ دلی کے پولیس کمشنر سے لے کر بڑے بڑے سیاسی لیڈر اس کے دوست ہیں اور اس سے خوف کھاتے ہیں۔ اب بتاؤ کیا تم اس پنجابن لڑکی جمیلہ کو شری راج کے خطرناک چنگل سے نکال سکو گے؟ کبھی نہیں۔ اس کا کبھی بھول کر بھی دل میں خیال نہ لانا۔ شری راج کے آدمی انسان کو یوں قتل کر دیتے ہیں جیسے انسان مکھی اور چیونٹی سے بھی حقیر ہو۔"

پرامیلا نے آگے بڑھ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور پیار سے کہا۔

"میں بھی خوبصورت ہوں۔ جمیلہ تو نئی نئی اس دھندے میں آئی ہے۔ جتنی محبت میں تمہیں دوں گی وہ لڑکی نہیں دے سکتی تھی۔"

میرے جسم میں ایک طوفان سا مچا ہوا تھا۔ خون میں ہیجانی کیفیت تھی۔ اگر یہ لڑکی سچ کہہ رہی تھی تو پھر جمیلہ ایک ایسے مافیا کے جال میں پھنس گئی تھی یا پھنسنے والی تھی جہاں سے اسے نکالنا جان جوکھوں کا کام تھا اور جہاں سے اسے نکالنے کے لیے مجھے سر دھڑ کی بازی لگانی تھی۔ میں نے پرامیلا سے پوچھا۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ یہ سارا سودا میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ بے چاری لڑکی جمیلہ رو رہی تھی۔ مگر اس کی کسے پروا تھی وہاں شری راج کے آدمیوں نے اسے پسند کر لیا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ یہاں کی لڑکیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی اور اس کا جسم بھی بڑا سڈول تھا۔"

میں نے پرامیلا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔

"پرامیلا! اگر مجھے یقین ہو جائے گا کہ جمیلہ نام کی لڑکی کو واقعی کملا بائی نے شری راج کے آدمیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے تو میں اس کی یاد کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل سے نکال دوں گا اور تمہیں اپنی محبوبہ بنا لوں گا۔"

پرامیلا نے میرے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"اب میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ جس لڑکی کو شری راج کے ایجنٹ خرید کر لے گئے ہیں وہ تمہارے کھیا دادا کی جمیلہ ہی تھی۔"

میں کچھ کہنے لگا تھا کہ پرامیلا ایک دم اچھل سی پڑی۔ کہنے لگی۔

"اگر میں تمہیں جمیلہ کی تصویر دکھا دوں تو کیا پھر تمہیں یقین آ جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "کیا تمہارے پاس اس کی تصویر ہے؟"

وہ چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"کملا بائی کی عادت ہے کہ اس کے اڈے پر جو نئی لڑکی آتی ہے وہ اس کی ایک تصویر کھنچوا کر ضرور اپنے البم میں لگا کر رکھ لیتی ہے۔ میں ابھی تمہیں اس کی تصویر لا کر دکھاتی ہوں۔"

وہ جلدی سے چپل پہن کر کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یا اللہ! یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ کیا یہ عذاب بھی میری قسمت میں لکھا تھا۔ اے خدا! تو غفور الرحیم ہے۔ میرے گناہ معاف کر دے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں رونے لگا۔ بڑی مشکل سے میں نے ضبط کیا۔

کرتے کے دامن سے آنسو پونچھے اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں پرامیلا واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے سائز کی ایک فوٹو تھی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور تصویر میرے سامنے کر کے بولی۔

"مدن لعل بابو! یہی ہے ناں تمہاری پیاری جمیلہ؟"

فوٹو رنگین فلم سے اتاری گئی تھی۔ اس میں میری بیوی جمیلہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک جانب خود کملا بائی بیٹھی تھی۔ دوسری طرف کوئی اور لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں نے جمیلہ کو جیسے درمیان میں جکڑ رکھا تھا۔ دونوں عورتیں مسکرا رہی تھیں جبکہ میری بیوی جمیلہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑ گئے ہوئے تھے۔ وہ اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے خلاؤں میں اپنی زندگی کے گزرے ہوئے باعزت باوقار ایام کو تلاش کرنے کی بے سود کوشش کر رہی ہو۔ میرے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے کچھ بولنا چاہا مگر آواز میرے گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ پرامیلا نے میری بدلی ہوئی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ کہنے لگی۔

"مدن بابو! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

میں نے تصویر اسے واپس کر دی اور کہا۔

"اب مجھے یقین آ گیا ہے۔"

پرامیلا مجھے بازو سے پکڑ کر چارپائی پر لے آئی۔ مجھے اپنے آپ پر قابو حاصل کرنے میں کچھ وقت ضرور لگا لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ کیونکہ مجھے پرامیلا سے ابھی کچھ مزید معلومات حاصل کرنی تھیں۔ میں نے اس سے کہا۔

"یہ شری راج تو بڑا بدمعاش آدمی ہے۔ یہ بھارت کی راج دھانی میں رہ کر یہ سب کچھ کر رہا ہے اور کوئی اسے پوچھنے والا نہیں۔"

وہ کہنے لگی۔

"تم بھارت کے لیڈروں اور بڑے بڑے افسروں کو کیا سمجھتے ہو۔ سب کرپٹ ہیں اور عیاش ہیں۔ جو دو ایک ان میں دیانت دار ہیں وہ بوڑھے ہو چکے ہیں، ان کی کوئی نہیں سنتا۔"

مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے شری راج کے بارے میں براہ راست کوئی سوال کیا تو پرامیلا کو خواہ مخواہ شک پڑے گا کہ میں اب بھی جمیلہ کو نہیں بھولا اور اس کی تلاش میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ویسے ہی بے نیازی کے انداز میں پوچھا۔

یہ شری راج تو کسی بہت بڑے محل میں رہتا ہو گا۔"

پرامیلا اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ وہ مجھے پیار کیے جا رہی تھی جبکہ میں اس کے پیار سے بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھا تھا۔ کہنے لگی۔

"دلی میں سنا ہے اس کے چار بنگلے ہیں۔ کبھی کسی بنگلے میں ہوتا ہے کبھی کسی بنگلے میں۔ کتنی ہی کاریں ہیں اس کی۔ ویسے گیتا بھون نام کا اس کا بنگلہ بڑا مشہور ہے۔ میں نے تو نہیں دیکھا مگر سنا ہے کہ نئی دلی میں کسی جگہ پر ہے۔ مگر تم کیوں اس کا پوچھ رہے ہو؟ میری طرف دیکھو۔ کیا میں جمیلہ سے کم خوبصورت ہوں؟"

اور پرامیلا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ مجھے اس کی ہنسی زہر لگی۔ میں جتنی جلدی ہو سکے دلی پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اس سے پہلے کہ میری بیوی وہاں سے بھی غائب کر دی جائے میں وہاں پہنچ جاؤں۔ میں نے سوچا کہ پرامیلا سے جمیلہ کی فوٹو حاصل کر لی جائے تو اسے تلاش کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ جمیلہ کی فوٹو ابھی تک پرامیلا کے پاس ہی تھی۔ اس نے تصویر سرہانے کے نیچے رکھ دی تھی۔

میں پرامیلا کے ساتھ دل پر پتھر رکھ کر دل لگی کی باتیں کرنے لگا۔ رات کے کسی لمحے جب میں نے پرامیلا کو غافل پایا تو سرہانے کے نیچے سے جمیلہ کی فوٹو نکال کر اپنے قبضے میں کر لی۔ اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ پرامیلا چارپائی پر بے سدھ ہو کر گہری نیند سو رہی تھی۔ بتی جل رہی تھی۔ میں دن نکلنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا لباس درست کیا اور دروازہ کھول کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

بردوان شہر کی اس بستی پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بازار میں کوئی دکان نہیں

کھلی ہوئی تھی۔ بستی کے دوسرے کونے کی جانب سے چوکیدار کے لٹھ کی آواز کسی وقت آ جاتی تھی۔ میں ریلوے سٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ وہاں کوئی رکشا وغیرہ بھی نہیں تھا۔ سٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ سٹیشن پر چند ایک مسافر نظر آئے۔ ایک قلی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ کلکتے جانے والی گاڑی صبح چار بجے آئے گی۔ میں کلکتے میں حاجی فرید احمد صاحب سے مل کر اور انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد دلی جانا چاہتا تھا۔ سٹیشن پر کسی نہ کسی طرح میں نے وقت گزار دیا۔ گاڑی آئی اور میں اس میں بیٹھ گیا۔

ٹرین نے مجھے دن نکلتے ہی کلکتے پہنچا دیا۔ وہاں سے سیدھا حاجی صاحب کے فلیٹ پر آ گیا۔ حاجی صاحب جاگ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔

"کرم داد! کیا ہوا؟"

میں نے انہیں ساری بات بیان کر دی اور جمیلہ کی فوٹو بھی دکھائی۔ اس پاسپورٹ سائز کی رنگین فوٹو میں جمیلہ کے ساتھ نائیکہ کملا بائی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ جمیلہ کا پریشان اور بیماروں والا چہرہ دیکھ کر حاجی صاحب نے انتہائی افسوس کے ساتھ کہا۔

"خدا ان لوگوں کو غارت کرے۔ ایک شریف گھرانے کی خاتون کو کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔"

انہوں نے میرے لیے ناشتہ منگوایا۔ کہنے لگے۔

"اب تم نے کیا سوچا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں اپنی بیوی کی تلاش میں دلی جاؤں گا اور اسے شری راج کے پھندے سے نکال کر جیسے بھی ہو سکا آپ کے پاس آؤں گا۔"

حاجی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے۔

"دلی بھارت کی راج دھانی ہے۔ بڑا شہر ہے کیا تم وہاں کسی کو جانتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں ڈھاکے سے صرف ایک بار ویزا لے کر دلی گیا تھا۔ اس بات کو بھی دو برس گزر گئے ہیں۔"

حاجی صاحب کہنے لگے۔

"شری راج جیسا کہ تم نے بتایا ہے ایک بہت بڑے اور اونچے درجے کے جرائم پیشہ گروہ کا لیڈر ہے تم اکیلے ان قاتل لوگوں کا کیسے مقابلہ کرو گے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہے حاجی صاحب۔ میں اپنی عزت' اپنی غیرت کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

حاجی صاحب بولے۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اس کے لیے بھی عقل کی اور کسی منصوبہ بندی کی ضرورت ہو گی۔ ایسا تو ہو گا نہیں کہ تم شری راج کے بنگلے میں جاؤ۔ وہاں سامنے جمیلہ بی بی بیٹھی ہوئی ہو اور تم اسے ساتھ لے کر واپس آ جاؤ۔ وہ لوگ اگر جمیلہ بی بی کو یہاں سے خرید کر لے گئے ہیں تو کسی مقصد کے لیے لے گئے ہیں اور اس کی حفاظت بھی کر رہے ہوں گے۔"

میں نے مایوسی کے لہجے میں کہا۔

"تو پھر آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں؟"

حاجی صاحب نے چائے کا خالی گلاس میز پر رکھ دیا اور بولے۔

"مجھے سوچنے کی مہلت دو۔"

میں نے کہا۔ "حاجی صاحب! میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر دیر ہو گئی تو میری بیوی وہاں سے بھی کہیں غائب نہ کر دی جائے۔"

حاجی صاحب نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گہری سوچ میں تھے اور آرام کرسی پر بیٹھے کھڑکی کے باہر بجلی کے تاروں پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے ذہن میں کوئی خیال آیا' وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔

"ایک بات ہو سکتی ہے۔ دلی میں میرے ایک دوست مشتاق علی کا ہوٹل ہے۔ میں اسے ٹیلی فون پر تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔ وہ میرا بڑا قابل اعتماد دوست ہے۔ تم ٹھہرنا بھی اسی کے ہوٹل میں۔ اس کے ہوٹل میں ہر قسم کے لوگ آتے جاتے

ہیں۔ وہ اس پوزیشن میں ہے کہ تمہاری کوئی مدد کر سکے۔"

میری راہ تھوڑی سی آسان ہوگئی تھی۔ حاجی فرید احمد نے مشتاق علی کو دلی ٹیلی فون کر کے ساری باتیں کھل کر بیان کر دیں۔ میں رات کی گاڑی میں بیٹھ کر دلی روانہ ہوگیا۔ حاجی صاحب نے مشتاق علی کے ہوٹل کا پتہ مجھے لکھ کر دے دیا تھا۔ اس کے ہوٹل کا نام مغل ہوٹل تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ شہر کی گنجان آبادی میں کوئی پرانے ٹائپ کا ہوٹل ہوگا۔ لیکن مغل ہوٹل شہر کی ایک ماڈرن آبادی میں واقع تھا۔ دو منزلہ ہوٹل تھا اور اس کے شیشے کے دروازے بھی تھے۔

میں رکشے سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ ہوٹل کی چھوٹی سی لابی تھی۔ بائیں جانب چھ سات صوفے لگے تھے جن پر کچھ عورتیں اور مرد بیٹھے تھے۔ سامنے ایک چھوٹا سا ہال تھا جہاں گاہک چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ میزوں پر تانبے کے چھوٹے چھوٹے گلدستے بھی رکھے ہوئے تھے۔ یہ کوئی فائیو سٹار ہوٹل نہیں تھا لیکن کم تر درجے کا ہوٹل بھی نہیں تھا۔ دیوار کے ساتھ کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ جہاں ایک لڑکی ٹیلی فون پر باتیں کر رہی تھی۔ میں کاؤنٹر پر گیا تو لڑکی نے ٹیلی فون رکھ دیا اور مجھ سے بڑی عمدہ قسم کی اردو میں پوچھا۔

"میں کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے ہوٹل کے مالک مشتاق علی صاحب سے ملنا ہے۔"

اس نے فوراً دوسرے ٹیلی فون کا رسیور اٹھا کر کوئی نمبر گھمایا اور مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے اسے اپنا نام بتا دیا۔ لڑکی نے فون پر کسی سے کہا۔

"سر ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ کرم دادا اپنا نام بتاتے ہیں۔"

پھر اس نے فوراً رسیور رکھ دیا اور بڑی خوش اخلاقی سے بولی۔

"آپ بائیں جانب تشریف لے جائیں۔ پہلا کمرہ خان صاحب کا ہے۔"

بائیں جانب ایک مختصر سی راہ داری تھی۔ ایک کمرے کے دروازے کے باہر مشتاق علی صاحب کے نام کی تختی لگی تھی۔ میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔

"آ جائیں۔"

کمرے میں داخل ہو کر میں نے ایک ادھیڑ عمر خوش لباس شخص کو دیکھا جو گرم شیروانی اور سفید پاجامہ پہنے صوفے پر بیٹھا کوئی فائل دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں پر سنہری فریم والا نظر کا چشمہ لگا تھا' چشمہ اتار کر اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سلام کیا تو اس نے اٹھ کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ میں نے اپنا نام بتایا۔ کہنے لگا۔

"تشریف رکھیں۔ حاجی فرید نے مجھے ٹیلی فون پر آپ کی ساری درد بھری داستان سنا دی تھی۔ مجھے سن کر بہت دکھ ہوا۔ یہ مشرقی پاکستان کا اجتماعی المیہ ہے۔ ہم بھارت کے مسلمانوں کو دہرا صدمہ ہوا ہے۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا آپ کے لیے ضرور کروں گا۔ آپ فی الحال اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں۔ شام کو تفصیل کے ساتھ آپ سے باتیں ہوں گی۔"

مشتاق علی بڑی اچھی اردو بول رہا تھا۔ وہ خاص دلی شہر کا رہنے والا تھا۔ مجھے اس کی باتوں سے کافی حوصلہ ہوا۔ بیرے نے مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ وہاں میری ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔ میں نے گرم پانی سے غسل کیا دو جوڑے کھدر کے میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں نے نئی کھدر کی بنگلہ ٹائپ کی قمیض اور پاجامہ پہن لیا مگر مجھے ایک کوٹ یا صدری کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ دلی میں ابھی سردی پڑ رہی تھی۔ میں نے بیرے سے پوچھا کہ سلے سلائے گرم کپڑے مجھے کہاں سے مل سکتے ہیں۔ اس نے ایک مارکیٹ کا ایڈریس بتایا میں رکشا لے کر مارکیٹ میں گیا۔ پیسے میرے پاس موجود تھے۔ میں نے ایک جرسی اور ایک گرم کوٹ خریدا اور واپس ہوٹل میں آگیا۔ شام کے وقت مشتاق علی خود میرے کمرے میں آگئے۔ کہنے لگے۔

"آپ بازار کچھ چیزیں خریدنے گئے تھے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں ایک کوٹ اور جرسی خریدنی تھی۔"

وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”میاں! آپ پاکستانی ہیں۔ آپ کے پاس یہاں کا کوئی ویزا بھی نہیں ہے۔ آپ کو زیادہ باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ آج کل پولیس اوار ملٹری کی انٹیلی جینس والے مشرقی پاکستان سے فرار ہونے والے آرمی جوانوں اور سویلین کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کسی دوسری مصیبت میں پھنس جائیں۔“

مشتاق علی صاحب نے بڑا صحیح مشورہ دیا تھا۔ میں اپنی بیوی کی پریشانیوں میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں پاکستانی ہوں اور جنگی قیدیوں کی ٹرین سے فرار ہوا ہوں۔ میں نے کہا۔

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔ میں آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گا۔“

وہ رومال سے عینک کا شیشہ صاف کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”ہمارا شری راج کے گینگ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن میں ایک دو ایسے آدمیوں کو جانتا ہوں جن کا اسی جرائم پیشہ گروہ کے لوگوں سے ملنا جلنا ہے۔ ان میں سے ایک آدمی کو میں نے فون کیا تھا مگر وہ گھر پر نہیں تھا۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ آئے تو اسے میرے پاس بھیج دیں۔ یہ آدمی مسلمان ہے لیکن شری راج کی سی آئی ڈی کا خاص آدمی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کہیں وہ شری راج کو خبر تو نہیں کر دے گا؟“

مشتاق علی بولے۔

”ایسی بات نہیں ہے وہ میری وجہ سے ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ ویسے بھی وہ کلمہ گو ہے اور پاکستان سے محبت کرتا ہے۔ اچھا یہ بتائیں کہ بھاوجہ صاحبہ یعنی آپ کی بیوی کا حلیہ کیسا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میرے پاس اس کی فوٹو ہے۔“

”یہ تو بہت اچھا ہے۔ مجھے دکھائیں گے؟“

میں نے بریف کیس میں سے جمیلہ کی فوٹو نکال کر دے دی۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے انگلی رکھ کر بتایا کہ یہ میری بدنصیب بیگم جمیلہ ہے۔ مشتاق علی بڑی درد مندی سے بولے۔

”خدا کرے کہ یہ مسلمان خاتون آپ کے پاس واپس آ جائے۔ مشرقی پاکستان میں غیر بنگالیوں کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔“

انہوں نے جمیلہ کی فوٹو مجھے واپس کر دی اور کہا۔

”اسے آپ اپنے پاس سنبھال کر رکھیں۔ ضرورت پڑنے پر میں آپ سے لے لوں گا۔ دوسری بات مجھے تمہیں یہ کہنی تھی کہ تم اپنا لباس تبدیل کر لو تو زیادہ بہتر ہے۔ بنگالیوں والا لباس تمہیں کسی نئی مصیبت میں نہ پھنسا دے۔“

مشتاق علی نے مجھے اپنے ایک خاص ملازم کے ساتھ دلی کے ایک نئے شاپنگ سنٹر بھیج دیا جہاں سے میں نے اپنے لیے دو پتلونیں، دو کالر والی قمیض اور نئے جوگنگ شوز خرید لیے۔ دوسرے روز میں ان کپڑوں میں اپنے کمرے سے نکل کر مشتاق صاحب کے پاس آیا تو وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ کہنے لگے۔

”یہ لباس بالکل ٹھیک ہے۔“

انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور کہنے لگے۔

”اگر کسی نے تم سے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو اور کہاں رہتے ہو تو کہہ دینا کہ میں کلکتے میں پرانے کپڑوں کا کاروبار کرتا ہوں اور دلی کاروبار سلسلے میں آیا ہوا ہوں اور مغل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اس سے زیادہ کسی کو کچھ نہ بتانا۔ باقی میں نے ابھی ابھی اپنے آدمی کو فون کیا ہے، وہ تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائے گا۔ تم اپنے کمرے میں ہی رہنا۔ بہتر ہو گا کہ تم یہاں مجھ سے بھی زیادہ نہ ملو۔ یہ میں تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ کل میں نے سی آئی ڈی کے ایک آدمی کو ہوٹل میں چائے پیتے دیکھا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”میں ایسا ہی کروں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔“

”تم اپنے کمرے میں جا کر بیٹھو۔ میرا آدمی آیا تو میں اسے لے کر خود تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“

میں کمرے میں آ کر پلنگ پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا میں اب جمیلہ سے کبھی مل سکوں گا یا نہیں؟ کیونکہ حالات مجھے جمیلہ سے روز بروز دور کر رہے تھے اور اس کا ملنا

مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بات کا فیصلہ میں نے کلکتے میں ہی کر لیا تھا کہ جن لوگوں نے محمد پور سے میری بیوی اور دوسری غیر بنگالی عورتوں کو اغوا کر کے انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہے ان میں سے اگر کسی کا کھوج مل گیا تو میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ابھی تک مجھے ان آدمیوں میں سے صرف کلکتے والا کھیا دادا ہی ملا تھا جس نے مکتی باہنی والوں کے ساتھ مل کر محمد پور سے میری بیوی کو اغوا کیا تھا۔ اس کے ساتھی دھرمو کو میں ابھی تک نہیں مل اتھا۔ لیکن میں جمیلہ کو حاصل کرنے کے بعد ہی ان لوگوں سے اپنی بے حرمتی کا انتقام لے سکتا تھا۔ یہ میں نے طے کر رکھا تھا کہ کھیا اور دھرمو دونوں مکتی باہنیوں کو میں کسی حالت میں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

میں نے کھانا بھی کمرے میں ہی منگوا کر کھایا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے کہ مشتاق علی صاحب ایک آدمی کو لے کر میرے کمرے میں آ گئے۔ تیس پنتیس سال کے اس سانولے آدمی نے سویٹر اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ بال خضاب سے کالے کیے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں بڑی چمک تھی' سگریٹ پی رہا تھا۔ مشتاق صاحب نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیں احمد صاحب۔ میرے پرانے دوست ہیں۔"

پھر انہوں نے احمد صاحب سے کہا۔

"اور یہ میرے دوست کرم داد ہیں۔"

احمد صاحب نے بڑے غور سے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اردو میں کہا۔

"آپ ڈھاکے میں کیا کاروبار کرتے تھے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرا فرنیچر کا کاروبار تھا۔ کچھ دیر مشرقی پاکستان کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ڈھاکہ فال پر بھارت کے دوسرے مسلمانوں کی طرح انہیں بھی بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ احمد صاحب نے براہ راست مجھ سے سوال کیا۔

"جس وقت مکتی باہنی والے آپ کے مکان میں داخل ہوئے تو آپ کہاں تھے؟"

مچا ہوا تھا۔ مکتی باہنی والے غیر بنگالیوں کا قتل عام کر رہے تھے۔ سارے واقعات سننے کے بعد احمد صاحب کہنے لگے۔

"مجھے یاد ہے ہمارے باس شری راج کے کچھ آدمی بنگلہ دیش سے اغوا کر کے لائی ہوئی لڑکیاں دیکھنے کلکتے ضرور گئے تھے اور دو تین لڑکیاں خرید کر بھی لائے تھے مگر میں نے ان لڑکیوں کو صرف ایک بار ہی دیکھا ہے۔ اس کے بعد وہ ہمارے کمپلیکس میں کہیں نظر نہیں آئیں۔ میرا خیال ہے کہ باس شری راج نے انہیں سپیشل ٹریننگ کے لیے انڈر گراؤنڈ کیمپ میں بھجوا دیا ہے۔"

میں نے احمد سے پوچھا۔

"کیا آپ کو کلکتے سے خرید کر لائی گئی لڑکیوں کی شکل و صورت یاد ہے؟"

"بڑی اچھی طرح سے یاد ہے۔ ان میں سے ایک کا رنگ گورا تھا۔ دبلی مگر صحت مند تھی۔"

میں نے جمیلہ کی فوٹو بریف کیس سے نکال کر اس کے آگے رکھ دی۔

"کیا وہ لڑکی یہ تو نہیں تھی۔"

احمد صاحب جمیلہ کی فوٹو دیکھتے ہی بول اٹھے۔

"بالکل یہی لڑکی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہی آپ کی بیگم صاحبہ ہیں۔ کوئی بات نہیں میں کل ہی آپ کو یہ معلوم کر کے بتا دوں گا کہ اسے باس نے سپیشل ٹریننگ کے لیے انڈر گراؤنڈ کیمپ میں بھیجا ہے یا نہیں۔ جو بھی صورت حال ہوئی میں آپ کو کل پورا کھوج لگا کر بتاؤں گا۔"

وہ رات اور اس سے اگلا دن سخت بے چینی اور کش مکش میں گزرا۔ اپنے کمرے میں ہی پڑا رہا۔ تیسرے پہر مشتاق صاحب آ گئے۔ ان کے ساتھ شری راج کا آدمی احمد بھی تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"کرم داد صاحب! آپ کی بیوی جمیلہ بیگم کو باس نے خاص ٹریننگ کے واسطے انڈر

گراؤنڈ ٹریننگ کیمپ میں نہیں بھیجا۔"

"تو کیا وہ دلی میں اس بدمعاش کے بنگلے پر ہی ہے؟"

میرے اس سوال کے جواب میں مسٹر احمد نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کرم داد صاحب! آپ کی بیگم صاحب شری راج کے بنگلے پر بھی نہیں ہیں۔"

"تو پھر وہ کہاں ہے؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

احمد صاحب نے کہا۔

"شری راج سخت توہم پرست آدمی ہے اور ناگ دیوی کا اندھا عقیدت مند ہے۔ ناگ دیوی کے بڑے مندر کے پجاری دیوگری کو وہ اپنا دیوتا اور گورو مانتا ہے۔ دو روز پہلے ناگ دیوی کے بڑے مندر کے پجاری اور شری راج کے گورودیو پجاری دیوگری اس کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے آپ کی بیوی جمیلہ کو وہاں دیکھ لیا اور شری راج سے کہا کہ یہ لڑکی تو آکاش کی اپسرا ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دو۔ ہم اسے ناگ مندر کی دیوداسی بنائیں گے اور شری راج نے آپ کی بیوی جمیلہ کو گورو دیو کے حوالے کر دیا جو اسے لے کر اپنے چیلے چانٹوں کے ساتھ ناگ دیوی کے مندر جا چکا ہے۔"

میرے سامنے ایک اور جوالہ مکھی کا دہانہ کھل گیا تھا۔ مشتاق علی نے احمد صاحب سے پوچھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ جو لڑکی شری راج نے اپنے گورو دیو کے حوالے کی ہے وہ کرم داد کی بیگم جمیلہ ہی تھی؟"

احمد صاحب بولے نے کہا۔

"جس عورت کی تصویر کرم داد صاحب نے مجھے دکھائی ہے اگر وہ کرم داد صاحب کی بیگم ہے تو پھر یقین کریں کہ یہی عورت شری راج نے اپنے گورو دیو کے حوالے کی ہے۔"

میں نے گہرا سانس بھر کر پوچھا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ بدمعاش گورو پجاری کہاں کیا ہو گا؟"

احمد صاحب نے کہا۔

"یہاں سے جنوب کی جانب مدھیہ پردیش میں ایک جگہ آتی ہے سنبھل پور، اس کے پہلو میں بالکل متوازی ایک دوسری جگہ ہے جس کا نام دیو گڑھ ہے۔ ان دونوں قصبوں اور دیو گڑھ سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر دریائے کاویری کے کنارے ناگ دیوی کا ہزاروں سال پرانا مندر ہے۔ پجاری دیو گری اس مندر کا مہنت ہے۔ لیکن وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ تم بالکل اجنبی ہو اور ناگ دیوی کے مندر میں سانپوں کا راج ہے۔ وہاں ایسے ایسے زہریلے سانپ ہیں جن کی پھنکار اگر چہرے پر پڑ جائے تو آدمی مر جاتا ہے۔ یہ سارے سانپ پجاری دیوگری کے غلام ہیں اور اس کا حکم مانتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"احمد صاحب! میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار پھر تصدیق کر لیں کہ جس عورت کو شری راج نے اپنے گورو کو سونپا ہے وہ میری بیوی جمیلہ ہی تھی۔"

وہ کہنے لگے۔

"اول تو مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ عورت جمیلہ بی بی ہی تھی۔ لیکن اگر اس کے باوجود تم مزید تسلی کرنا چاہتے ہو تو مجھے جمیلہ بی بی کی فوٹو دے دو۔ میں اس کی مزید تصدیق کر لوں گا۔"

میں نے جمیلہ کی فوٹو احمد صاحب کے حوالے کر دی وہ کہنے لگے۔

"میں کل کسی وقت آ کر بتاؤں گا۔"

ان کے جانے کے بعد مشتاق علی کہنے لگے۔

"کرم داد بھائی! کیا تم ان سانپ کی پوجا کرنے والے شیطانوں کے مندر میں جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"اگر میری بیوی جمیلہ کو یہ لوگ جہنم میں بھی لے گئے ہوں گے تو میں اپنی بیوی کو

نکالنے وہاں بھی پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت میری زندگی کا یہی ایک مقصد اور یہی ایک مطلب ہے۔ اگر میری بیوی محمد پور میں دوسرے لوگوں کے ساتھ شہید ہو جاتی تو مجھے آج صبر آگیا ہوتا۔ لیکن وہ زندہ ہے اور کافروں کے قبضے میں ہے۔ میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک میں ان کافروں کو تہہ تیغ کر کے اپنی بیوی کو ان سے نجات نہیں دلا دوں گا۔"

اس کے بعد مشتاق علی صاحب خاموش ہو گئے۔

وہ رات بھی میرے لیے قیامت کی رات تھی۔ کسی وقت نیند کا غلبہ ہو جاتا اور کسی وقت میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔ مجھے جمیلہ کی چیخیں سنائی دیتیں۔ رات اسی عذاب اور کرب کے عالم میں گزر گئی۔ اگلے روز دن کے دس بجے احمد صاحب آ گئے۔ مشتاق علی کو ساتھ لے کر وہ میرے کمرے میں آئے اور جمیلہ کی فوٹو والا لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"کرم داد اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ جس عورت کو شری راج نے اپنے گورو دیو کے حوالے کیا ہے وہ آپ کی بیوی جمیلہ بی بی ہی تھی جس کی یہ فوٹو ہے اور جس کو شری راج کے آدمی کلکتے میں کھیادادا سے خرید کر لائے تھے۔"

احمد صاحب کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے مشتاق علی صاحب سے کہا۔

"مشتاق صاحب! کیا آپ پتہ کر کے مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہ سنبھل پور اور دیو گڑھ کے علاقے جہاں ناگ دیوی کا مندر ہے کہاں پر ہیں اور وہاں جانے کے لیے مجھے کہاں سے گاڑی پکڑنی ہو گی؟"

مشتاق صاحب کو یقین ہو چکا تھا کہ اب میں وہاں نہیں رکوں گا۔ کہنے لگے۔

"میں نے اس طرف کبھی سفر نہیں کیا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ یہ علاقے جیسا کہ احمد صاحب نے بتایا آندھرا پردیش میں نہیں ہیں بلکہ مدھیہ پردیش میں واقع ہیں۔ میں پوری انکوائری کر کے تمہیں بتا سکتا ہوں تم یہاں کمرے میں ہی ٹھہرو۔"

وہ نیچے ہوٹل کی لابی میں چلے گئے۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد آئے اور کہنے لگے۔

"میاں! یہ دونوں علاقے واقعی مدھیہ پردیش میں ہیں۔ ناگ دیوی کا مندر دیو گڑھ کے قریب دریائے کاویری کے کنارے ایک جنگل میں واقع ہے۔ تمہیں دلی سے رانچی جانے والی گاڑی پکڑنی ہو گی۔ رانچی سے تم دوسری ٹرین پکڑو گے جو اڑیسہ پرانت کے بڑے شہر بھبھونیشور کو جاتی ہے۔ سنبھل پور راستے میں ہی آتا ہے۔ تم سنبھل پور اتر جاؤ گے اور وہاں سے کسی لاری میں بیٹھ کر دیو گڑھ کی طرف جاؤ گے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ تم اکیلے یہ خطرناک مہم کیسے سرانجام دو گے؟ تمہارے پاس اپنی حفاظت کے لیے کوئی اسلحہ بھی نہیں ہے۔ تم ان سارے علاقوں سے ناواقف ہو۔"

میں نے کہا۔

"خدا کی مدد میرے ساتھ ہو گی۔ مشتاق صاحب! آپ نے میری خاطر جو کچھ کیا اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے گا۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، جنہیں میں نے بڑی مشکل سے روک لیا۔ کیونکہ کسی کے سامنے آنسو بہانا مجھے گوارا نہیں تھا۔ مشتاق صاحب بولے۔

"کرم داد بھائی! تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں نے جو کچھ کیا ایک مسلمان کی حیثیت سے اور ایک انسان کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ جمیلہ تمہاری بیوی ہی نہیں ہماری بہن کی طرح بھی ہے۔ خدا کرے کہ وہ تمہیں مل جائے اور تم دونوں خیر و عافیت سے پاکستان واپس پہنچ جاؤ۔"

میں نے ان سے کہا کہ وہ کلکتے میں حاجی فرید احمد صاحب کو تمام حالات سے باخبر کر دیں اور انہیں کہہ دیں کہ اگر میں جمیلہ کو واپس لانے میں کامیاب ہو گیا تو ان کا شکریہ ادا کرنے ان کے پاس ضرور آؤں گا۔ مشتاق صاحب بولے۔

"میں آج ہی انہیں فون کر کے سارے حالات بتا دوں گا۔ تم کب روانہ ہونا چاہتے ہو؟"

"میں تو اسی وقت نکل جانا چاہتا ہوں۔ مجھے صرف اتنا معلوم کروا دیں کہ دلی سے رانچی شہر کو ٹرین کس وقت جاتی ہے۔"

"یہ میں ابھی فون پر معلوم کیے دیتا ہوں۔"

مشتاق صاحب نے نیچے جا کر ریلوے انکوائری آفس سے جو کچھ معلوم کیا مجھے اوپر آکر بتا دیا۔ کہنے لگے۔

"ایک ایکسپریس ٹرین رات کے سوا نو بجے دلی سٹیشن سے چلتی ہے۔ اس کے بعد رات گیارہ بجے ایک مسافر ٹرین پھر چھوٹتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں سوا نو بجے والی گاڑی پکڑنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں تمہارا ٹکٹ منگوائے لیتا ہوں۔ اگر پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دو۔ جتنے پیسے چاہیں میں پیش کر دیتا ہوں؟"

میں نے کہا۔

"میرے پاس اس وقت چھ سات سو روپے موجود ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ کافی ہوں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔"

مشتاق علی صاحب مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں موت کی مہم پر جا رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک شبہ بھی نہیں تھا کہ میں موت کی مہم پر ہی جا رہا تھا۔ اگر جسمانی طور پر کوئی چیز میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی تو وہ میری فوج میں حاصل کی ہوئی کمانڈو ٹریننگ تھی۔ مجھے اپنے اوپر پورا اعتماد تھا اور مجھے معلوم تھا کہ میں اتنی آسانی سے دشمن کے قابو میں آنے والا نہیں ہوں۔ صرف مجھے ایک پستول یا ایک بڑے کمانڈو چاقو کی شدید ضرورت تھی۔ پستول کا ذکر میں نے مشتاق صاحب کے آگے اس لیے نہیں کیا تھا کہ دو چار دنوں میں میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مشتاق صاحب اس قسم کے آدمی نہیں ہیں کہ میرے لیے کہیں سے بلا لائسنس پستول وغیرہ کا کوئی بندوبست کر سکیں۔ اگر میں انہیں کمانڈو چاقو لانے کے لیے کہتا تو وہ یہ چاقو بھی نہیں لا سکتے تھے۔ کیونکہ انہیں اس خاص قسم کے چاقو کی سمجھ نہیں تھی۔ میں نے خود ہی بازار سے چاقو خریدنے کا فیصلہ کیا اور مشتاق صاحب کو بتائے بغیر ہوٹل کے پچھلے دروازے سے نکل کر دلی کے اس ماڈرن علاقے کی ایک مارکیٹ میں آگیا۔ وہاں چاقو چھریوں کی ایک دکان تھی۔ وہاں سے مجھے ایک کمانڈو چاقو مل گیا۔ اس چاقو کو بھارت کے جنگلوں میں شکار کھیلنے والے شکاری لوگ استعمال کرتے تھے۔ چاقو پر چمڑے کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ میں اسے لے کر ہوٹل میں آگیا۔

شام کا کھانا میں نے اور مشتاق علی صاحب نے مل کر کھایا۔ کہنے لگے۔

"کرم داد بھائی! مجھ سے کوئی کوتاہی ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہاری اچھی طرح سے خدمت نہیں کر سکا۔"

مشتاق علی صاحب بڑے درد مند مسلمان تھے۔ میں نے کہا۔

"آپ نے میرے ساتھ بھائیوں سے بڑھ کر سلوک کیا ہے۔ میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔"

میں نے جمیلہ کی فوٹو والا لفافہ اپنے کوٹ کی جیب میں سنبھال کر رکھ لیا۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے مشتاق صاحب نے میرے لیے ٹیکسی منگوالی۔ وہ اپنی گاڑی میں مجھے نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ یہ بھارتی مسلمان ہونے کے ناطے ان کی مجبوری تھی۔ میں مشتاق صاحب کے گلے لگ کر ملا۔ ہوٹل کی لابی سے نکل کر تیز تیز قدم چلتا ٹیکسی میں سوار ہوا اور ٹیکسی دلی ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑی۔

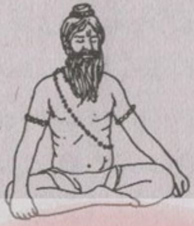

دلی سے رانچی تک کا سفر کافی طویل تھا۔

پورے بھارت کے وسط میں سے گزرنا پڑا۔ راستے میں کئی بڑے شہر آئے۔ دلی سے علی گڑھ، علی گڑھ سے آگرہ، وہاں سے کانپور، کانپور سے الہ آباد، آگے بنارس سے آگے صوبہ بہار کا مشہور تاریخی شہر گیا آیا جہاں مہاتمابدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ پورا ایک دن اور ایک رات سفر میں گزر گئی۔ دوسرے دن شام کے وقت گاڑی رانچی پہنچی۔ رانچی سے مجھے سنبھل پور جانا تھا۔ معلوم ہوا کہ آگے بھی ایک رات کا سفر ہے اور سنبھل پور والی گاڑی دس بجے رات کو چلے گی۔ میں نے رانچی کے سٹیشن پر ہی رکنے کا فیصلہ کیا۔ میں شہر میں ادھر ادھر پھرنے سے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں پاکستانی تھا اور میرے پاس بھارت کا کوئی ویزا وغیرہ نہیں تھا۔ دلی میں میں بنگال سے کافی دور تھا مگر اب مغربی بنگال کے قریب آگیا تھا اور میں اسی علاقے سے فرار ہوا تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ میں سی آئی ڈی والوں کی نگاہوں میں آجاؤں۔ سٹیشن کے مسافرخانے میں بہت سے مسافر موجود تھے۔ میں بھی وہاں پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ وہیں میں نے ریلوے کی کنٹین پر کھانا وغیرہ کھایا۔ چائے پی اور رات کے دس بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں پوری طرح خبردار تھا۔ ابھی تک مجھے وہاں کوئی مشکوک آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ ٹکٹ میں نے لے رکھا تھا۔ رات کو ساڑھے دس بجے سنبھل پور سے ہوتی ہوئی آگے ناگ پوری کو جانے والی گاڑی آئی۔

ساری رات سفر میں گزر گئی۔ یہاں موسم گرم ہوگیا ہوا تھا۔ مجھے کوٹ میں گرمی لگ رہی تھی۔ کوٹ کے اندر میں نے کارڈ رائے کی پرانی جرسی پہن رکھی تھی۔ میں نے کوٹ اتار کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ صبح منہ اندھیرے ٹرین سنبھل پور کے سٹیشن پر رکی۔ میں اتر گیا۔ کوٹ میں نے اپنے کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ کیونکہ یہاں سردی بالکل نہیں تھی۔ اپنی کارڈرائے کی جرسی کے بھی بٹن میں نے کھول رکھے تھے۔ کمانڈو چاقو جرسی کے اندر والی جیب میں تھا۔ بھارتی کرنسی کے کچھ نوٹ جو بچ گئے تھے وہ میری پتلون کی پچھلی جیب میں تھے۔ میری بیوی جمیلہ کی فوٹو والا لفافہ بھی پتلون کی پچھلی جیب میں ہی تھا۔ میری بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ شانے چوڑے چکلے تھے اور جسم مضبط تھا جس کو آرمی کی کمانڈو ٹریننگ نے بے حد پھرتیلا اور چٹان ایسا بنا دیا ہوا تھا۔

مشتاق علی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ سنبھل پور سے دیو گڑھ جانے کے لیے مجھے کوئی نہ کوئی لاری مل جائے گی۔ مجھے لاری میں سفر کرتے ہوئے دیو گڑھ سے ایک میل پیچھے دریا کے قریب اتر جانا تھا کیونکہ ناگ دیوی کا مندر وہیں جنگل میں کسی جگہ پر تھا۔ سنبھل پور کا قصبہ کافی بڑا تھا۔ ابھی دن نہیں نکلا تھا۔ ایک دو مندروں میں پوجا پاٹھ ہو رہی تھی اور گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ سارا علاقہ ہندوؤں کا گڑھ تھا۔ میں سٹیشن کے باہر چائے کی ایک دکان پر آکر بیٹھ گیا۔ چائے پی۔ تھوڑا سا ناشتہ کیا اور ایک آدمی سے پوچھا کہ دیوگڑھ کو لاری یا بس کہاں سے چلتی ہے۔ اس نے بتایا کہ سٹیشن کی دوسری طرف لاری اڈہ ہے۔ وہاں سے مجھے بس مل جائے گی۔ میں اٹھ کر لاری اڈے پر آگیا۔ مجھے دیو گڑھ جانے والی لاری مل گئی۔ اس میں سبھی ہندو سوار تھے۔ کچھ سادھو قسم کے لوگ بھی تھے جو ناگ دیوی کی پوجا کو جا رہے تھے۔ لاری دیوگڑھ کی طرف چلی جا رہی تھی۔ یہ سارا علاقہ جنگل کا علاقہ تھا۔ اونچے اونچے گنجان درختوں کے درمیان ایک کچی سڑک بنی تھی جس پر لاری ہچکولے کھاتی جا رہی تھی۔ میرے ساتھ ہی جو ہندو بیٹھا تھا اور جس کے ماتھے پر لال تلک لگا ہوا تھا اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں دیو گڑھ جا رہا ہوں یا ناگ دیوی مندر کی یاترا کو جا رہا ہوں۔ میں نے کہا۔

"مہاراج! میں ناگ دیوی کی پوجا کرنے جا رہا ہوں۔"

وہ بولا۔

"رکھشا کے لیے کیا لے جا رہے ہو؟ میں تو سوا پندرہ روپے رکھشا ڈالوں گا۔ تم بھی اس سے زیادہ پیسے پجاری کو مت دینا۔ یہ پجاری لوگ بڑے لالچی ہوتے جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میں بھی سوا پندرہ روپے ہی دوں گا۔"

اس سے مجھے پتہ چلا کہ ناگ دیوی کے مندر میں رکھشا ضرور ڈالی جاتی ہے۔ میں نے مزید معلومات حاصل کرنے کے خیال سے اس سے کہا۔

"مہاراج! میں پنجاب سے آ رہا ہوں۔ میرا نام مدن لال ہے۔ پہلی بار ناگ دیوی کے درشن کرنے آیا ہوں۔ سنا ہے وہاں بڑے زہریلے سانپ ہوتے ہیں۔ وہ یاتریوں پر حملہ تو نہیں کرتے۔؟"

وہ ہندو بولا۔

"جو یاتری ان سے ڈر جاتا ہے اس پر حملہ ضرور کرتے ہیں۔ تم بالکل نہ ڈرنا۔ جو ڈرتا نہیں سانپ اسے کچھ نہیں کہتے۔ ویسے آج تک کسی سانپ نے کسی یاتری کو نہیں کاٹا۔ یہ ناگ دیوی کا خاص وردھان ہے۔"

میں نے دل میں کہا کہ مجھ پر اگر کسی سانپ نے حملہ کیا تو اسے وہیں کچل دوں گا۔ سوچ رہا تھا کہ میری بیوی جمیلہ یہاں کس طرح زندہ ہوگی۔ خدا کرے کہ وہ مجھے یہاں مل جائے میں نے ہندو سے پوچھا۔

"ناگ مندر کے بڑے پجاری کا نام کیا ہے؟"

وہ بولا۔

'"اسے گورو دیو گری کہتے ہیں۔ بڑا لالچی پجاری ہے۔ سنا ہے شہر میں اس کا غنڈوں' بدمعاشوں سے بھی تعلق ہے۔ مگر یہاں کسی کے آگے ایسی بات نہ کرنا۔ دیو گری کے چیلوں کو پتہ چل گیا تو وہ تم پر رات کو سانپ چھوڑ دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "میں کسی سے ایسی بات نہیں کروں گا۔"

دیو گڑھ ابھی کچھ دور ہی تھا کہ لاری ایک گاؤں کے باہر رک گئی۔ میرے ہندو ساتھی نے کہا۔

"آ جاؤ یہاں سے ناگ مندر قریب ہی ہے۔"

میں بھی دوسرے یاتریوں کے ساتھ لاری سے اتر پڑا۔ سادھو لوگ آگے آگے تھے۔ پیچھے پیچھے شہری یاتری تھے۔ سب ناگ دیوی کے بھجن گاتے جنگل کی ایک پگڈنڈی پر چل پڑے۔ تین چار میل گھنے جنگل میں سفر کرنے کے بعد سامنے دریا آگیا۔ دریا زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ بڑی نہر جتنا چوڑا تھا۔ مگر اس کا پانی بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ دریا کے کنارے ایک مخروطی مینار والا مندر بنا ہوا تھا۔ مندر کے اوپر زرد رنگ کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ مندر کے بڑے دروازے کی سیڑھیاں نیچے دریا کے کنارے تک چلی گئی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر میں نے دیکھا کہ ہندو مرد اور عورتیں دریا کے پانی سے اشنان کر رہی تھیں۔ دو تین ہندو عورتیں تو بالکل عریاں تھیں۔ باقی عورتوں نے ململ کی ساڑھیاں لپیٹ رکھی تھیں۔

مندر کی بڑی ڈیوڑھی میں بڑا سا ٹل لٹک رہا تھا۔ جو یاتری اندر جاتا تھا ہاتھ مار کر ٹل کو ضرور بجاتا تھا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ میں اپنے ہندو ساتھی کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ جو کچھ وہ کرتا تھا میں بھی کیے جاتا تھا۔ آگے مندر کا ایک کمرہ بنا ہوا تھا جہاں استھان پر ایک کالے رنگ کی عورت کی مورتی کھڑی تھی۔ مورتی کے سارے جسم پر سیندھور اور تیل ملا ہوا تھا۔ مورتی بڑی ڈراؤنی تھی۔ اس کی گردن میں زندہ سانپ جھول رہے تھے۔ کمرے کے فرش اور دیواروں پر بھی سانپ رینگ رہے تھے۔ میں بڑی احتیاط سے ہندو ساتھی کے ساتھ لگ کر چل رہا تھا۔ اس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

"مدن لال! ڈرنا بالکل نہیں۔ ڈرو گے تو کوئی نہ کوئی سانپ آ کر تمہیں ڈس لے گا۔"

ایک موٹی گردن والا بڑا صحت مند منت گلے میں جینو ڈالے گیروی دھوتی باندھے آلتی پالتی مارے ناگ دیوی کی مورتی کے آگے بیٹھا یاتریوں سے رکھشا وصول کر کے ان کو چھوٹے چھوٹے ایک دو بتاشے دے دیتا تھا۔ میں نے بھی سوا پندرہ روپے رکھشا دی اور

منت سے تین بتاشے لے لیے۔ میرے ہندو ساتھی نے کہا۔

"یہی دیوگری منت ہے۔ یہ مندر کا بڑا پجاری ہے اور بڑا دولت مند آدمی بن گیا ہے۔"

دیوگری کے گلے میں بھی کالے رنگ کا ایک سانپ لٹک رہا تھا۔ ہندو ساتھی نے کہا۔

"یہ کالا سانپ پجاری دیوگری کا باڈی گارڈ ہے۔ یہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔"

میں بڑے پجاری دیوگری کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ یہی شخص دلی کے شری راج سے میری بیوی کو لے آیا تھا۔ میں اپنے ہندو ساتھی کے ہمراہ یاتریوں کے دھکے کھاتا آگے نکل گیا۔ دوسرے دروازے پر آ کر میں نے ہندو ساتھی سے پوچھا۔

"یہ پجاری یہیں مندر میں ہی رہتا ہے کیا؟"

وہ بولا۔ "اور کہاں جائے گا۔ بڑا عیاش آدمی ہے۔ سب لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ روز رات کو دارو پیتا ہے اور اس نے اپنی عیاشی کے لیے کچھ عورتیں بھی مندر میں پال رکھی ہیں۔ یہ انہیں ناگ دیوی کی داسیاں کہتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا یہ ناگ داسیاں بھی مندر میں ہی رہتی ہیں۔"

وہ ہندو یاتری کہنے لگا۔

"مندر کے ایک تہہ خانے میں رہتی ہیں۔ بڑے زہریلے سے سانپ ان پر پہرہ دیتے ہیں۔ اگر کوئی ناگ داسی باہر نکلنے کی کوشش کرے تو سانپ انہیں وہیں ڈس کر ہلاک کر دیتے ہیں۔"

"تو کیا یہ ناگ داسیاں کبھی تہہ خانے سے باہر نہیں نکلتیں؟"

ہندو یاتری وہاں کا بھیدی معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا۔

"کہتے ہیں مہینے میں ایک بار پجاری دیوگری خود انہیں تہہ خانے سے نکال کر جنگل میں پھرانے لے جاتا ہے۔ اس وقت دونوں جانب اور آگے پیچھے پجاری کے پالتو زہریلے سانپ باڈی گارڈ بن کر چل رہے ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "پھر بھی کوئی نہ کوئی ناگ داسی کبھی نہ کبھی تو فرار ہو ہی جاتی ہو گی۔ انسان اس قید سے تنگ بھی آ جاتا ہے۔"

ہندو یاتری کہنے لگا۔

"پجاری دیوگری نے ان ناگ داسیوں کے جسموں کی بو اپنے تمام باڈی گارڈ سانپوں کو سنگھا رکھی ہے۔ کہتے ہیں جب پہلے پہل کوئی عورت ناگ داسی بن کر مندر میں لائی جاتی ہے تو اسے تہہ خانے کے ایک کمرے میں ننگی کر کے چارپائی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور پجاری دیوگری اس عورت پر اپنے باڈی گارڈ سانپ چھوڑ دیتا ہے۔ یہ سانپ نئی ناگ داسی کے عریاں بدن پر ساری رات رینگتے رہتے ہیں۔ عورت چیخیں مارتی ہے اور پھر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ صبح سانپوں کو کمرے سے نکال کر پٹاریوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ بدنصیب عورت ناگ مندر کی داسی بنا لی جاتی ہے۔ اگر وہ کسی طرح فرار ہو جائے تو پجاری دیوگری اس سانپ کو پٹاری میں سے نکال کر چھوڑ دیتا ہے جس نے ناگ داسی کے عریاں بدن پر رینگ رینگ کر اس کے بدن کی بو سونگھ لی ہوتی ہے۔ وہ عورت جہاں کہیں ہوتی ہے وہاں جا کر اسے ڈس کر ہلاک کر آتا ہے۔ اس قسم کی دو تین وارداتیں دیوگڑھ اور سنبھل پور میں ہو چکی ہیں کہ ناگ مندر کی کوئی ناگ داسی فرار ہو کر وہاں پہنچی تو اسے کسی سانپ نے ڈس لیا اور اس کی لاش اس حالت میں شہر کے کسی مکان یا جنگل میں کسی پگڈنڈی کے پاس ملی کہ لاش کا جسم سیاہ پڑ چکا تھا۔ یہ ناگ مندر کے سانپ کے زہر کا اثر تھا۔"

یہ تمام حالات معلوم کرنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ مجھے کس طریقے سے جنگ لڑنی ہو گی اور اپنی بیوی جمیلہ کو کہاں تلاش کرنا ہو گا۔ یقینی طور پر وہ بڑے پجاری دیوگری کے خفیہ والے تہہ خانے میں ہی دوسری ناگ داسیوں کے ساتھ قید میں پڑی تھی۔ میں نے اپنے ہندو ساتھی سے پوچھا۔

"یہ پجاری دیوگری کا تہہ خانہ کہاں پر ہے؟"

"تمہیں بتایا تو ہے کہ اسی مندر میں کسی جگہ پر ہے۔ سوائے دیوگری اور اس کے دو

چار بدمعاش چیلوں کے اور کسی کو اس تہہ خانے کا راستہ معلوم نہیں ہے۔"

اس ہندو یاتری نے جو لاری میں میرا دست بن گیا تھا پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

"تم ان باتوں کو کرید کرید کر کیوں پوچھ رہے ہو' تمہیں شاید معلوم نہیں کہ پجاری دیوگری کے سانپوں کو ان باتوں کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ فضا کو سونگھ لیتے ہیں۔ اگر دیوگری کو معلوم ہو گیا کہ تم اس کے خفیہ تہہ خانے کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہے ہو تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ تمہارے ساتھ میری جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اب مجھ سے کچھ نہ پوچھنا۔ ہمیں ابھی تین دن تک یہاں رہنا ہے۔"

میں نے اس کے بعد ہندو یاتری سے پجاری کے سانپوں اور اس کے تہہ خانے کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا لیکن دل میں تہیہ کر لیا کہ اس بدمعاش پجاری دیوگری کے تہہ خانے کا کھوج لگا کر رہوں گا۔ کیونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میری بیوی کو پجاری نے اسی تہہ خانے میں بند کر رکھا ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ خفیہ تہہ خانے کا کھوج کس طرح لگایا جائے۔ سوائے اس ہندو یاتری کے میرا وہاں کوئی جاننے والا نہیں تھا اور اس ہندو یاتری نے اپنا منہ بند کر لیا تھا۔ ناگ دیوی کے مندر کے اردگرد کافی کھلی جگہ تھی جہاں یاتریوں کے لیے چھوٹی چھوٹی بوسیدہ کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک ایک کوٹھڑی میں دو دو تین تین یاتری گھس گئے تھے۔ باہر بھی کچھ یاتریوں نے پھولداریاں لگا لی تھیں اور بانس کی چارپائیاں ڈال دی تھیں۔ چولہے جلا کر کھانا وغیرہ بھی پکایا جاتا تھا۔ دیوگڑھ اور سنبھل پور سے آ کر لوگوں نے کھانے پینے کی دکانیں بھی کھول رکھی تھیں۔ میں نے دوپہر کو ایک دکان پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور اپنی تنگ سی کوٹھڑی میں آ کر لیٹ گیا۔ میرے ساتھ اس کوٹھڑی میں میرا ہندو یاتری ساتھی بھی تھا۔ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ کچھ دیر لیٹ کر میں سوچتا رہا کہ مجھے اپنی مہم کا آغاز کس طرح سے اور کہاں سے شروع کرنا چاہیے۔

ایک بات میرے ذہن میں آ گئی۔ چنانچہ میں اٹھا اور کوٹھڑی سے نکل کر ٹہلتا ہوا مندر کے عقب میں آ گیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا تالاب بنا ہوا تھا۔ تالاب میں دو تین بوڑھی

عورتیں بیٹھی برتن مانجھ رہی تھیں۔ میں ان کے پیچھے سے ہوتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس جانب مندر کی دیوار دو تین مرد اونچی تھی۔ ایک جگہ مجھے دیوار میں چھوٹا سا دروازہ دکھائی دیا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا دروازے کے پاس آ گیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اندر سے بین بجنے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ یہ سپیروں والی بین کی آواز تھی جس کو بجا کر سپیرے سانپ کو نچاتے ہیں۔ میں نے آگے ہو کر دروازے میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا دالان تھا۔ وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دبے پاؤں دالان میں داخل ہو گیا۔ دن کا وقت تھا لیکن دالان کی چھت نیچی تھی جس کی وجہ سے وہاں ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اچانک مجھے سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ میں جلدی سے ایک طرف ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ دالان کی دیوار سے ایک سوراخ میں تین سانپ آگے پیچھے باہر نکلنے اور فرش پر رینگتے ہوئے میری طرف بڑھے۔ مجھے ہندو یاتری کی بات یاد آ گئی کہ یہاں کے سانپوں کو دیکھ کر اگر تم ڈر گئے تو یہ تم پر حملہ کر دیں گے۔ ان سے ہرگز ہرگز مت ڈرنا۔ میں ڈر تو بہت رہا تھا مگر میں نے ظاہر یہ کیا کہ میں بالکل خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں اپنی جگہ پر بظاہر بڑے سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔ تینوں سانپ رینگتے ہوئے میرے پاؤں کے قریب سے ہو کر گزر گئے۔ وہ دروازے سے باہر چلے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔ میں پیچھے مڑنے ہی لگا تھا کہ بین کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ یہ آواز دالان کی ایک چھوٹی سی بند کھڑکی میں سے آ رہی تھی۔ میں دبے دبے قدم اٹھاتا کھڑکی کے پاس گیا اور اسے ذرا سا دھکیلا۔ کھڑکی ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گئی۔ میں اس کے صرف ایک پٹ کو تھوڑا سا کھول کر دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف پہلے تو اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ پھر آہستہ آہستہ نظر آنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ یہ ایک تنگ سی کوٹھڑی ہے۔ جس کے کونے میں ایک لمبوترا پرانے طرز کا دروازہ بنا ہوا ہے۔ بین کی آواز اسی طرف سے آ رہی تھی۔ مجھے تہہ خانے کے خفیہ راستے کی تلاش تھی۔ میں کھڑکی سے کوٹھڑی میں اتر گیا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیے۔ اندھیرے میں میں

چبوترے دروازے کے قریب آیا۔ دروازے کے ایک پٹ میں دو تین سوراخ تھے۔ ان سوراخوں میں سے دھیمی دھیمی روشنی باہر نکل رہی تھی۔

بین کی آواز یہاں زیادہ قریب سے سنائی دینے لگی۔ میں نے ایک سوارخ میں سے جھانکا۔ دوسری جانب بھی ایک تنگ اور بوسیدہ کوٹھڑی تھی جس کے فرش پر الٹے رکھے ہوئے مٹکے پر ایک دیا روشن تھا۔ ایک مریل سا عجیب شکل و صورت کا سیاہ فام آدمی بیٹھا بین بجا رہا تھا۔ اس کے سامنے فرش پر ایک سانپ پھن اٹھائے جھوم رہا تھا۔ مریل آدمی کی کھوپڑی کسی مردے کی کھوپڑی لگ رہی تھی۔ دیئے کی روشنی میں اس کی کھوپڑی چمک رہی تھی۔ شاید اس نے کھوپڑی پر تیل ملا ہوا تھا۔ کوٹھڑی کے سامنے والی دیوار میں ایک تنگ راستہ نظر آ رہا تھا۔ اچانک وہاں دو آدمی نمودار ہوئے جنہوں نے سادھوؤں والے گیروے کرتے پہن رکھے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی مریل آدمی نے بین بجانی بند کر دی اور سانپ کو اٹھا لیا۔ آنے والوں میں سے ایک نے اسے کہا۔

“سنکھو! نیچے جا۔ مہاراج گپھاہ میں آ گئے ہیں اور تمہیں بلا رہے ہیں۔ چل نیچے۔”

وہ مریل آدمی جس کا نام سنکھو تھا جلدی سے اٹھا اور جس راستے سے دونوں سادھو اوپر آئے تھے اس طرف جا کر غائب سا ہو گیا۔ دونوں سادھو کوٹھڑی کے فرش پر بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا۔

“مہاراج! آج یگیہ کریں گے۔ ہم آج جنگل میں نہیں جائیں گے۔”

دوسرے نے کہا۔ “نہیں جائیں گے یہاں بیٹھے ہیں۔ یہیں بیٹھے رہیں گے۔”

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے اور آلتی پالتی مار کر ایسے بیٹھ گئے جیسے سمادھی لگا لی ہو۔ مجھے پیچھے دالان مین سے کسی کے گزرنے کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سوچا کہ اس وقت یہاں سے چلے جانا چاہیے اور رات کو یہاں آ کر معلوم کرنا چاہیے کہ نیچے گپھاہ میں یگیہ کیا ہونے والا ہے۔ اتنا مجھے احساس ہو گیا تھا کہ تہہ خانے میں اسی کوٹھڑی سے راستہ جاتا ہے۔ میں دبے پاؤں چل کر کھڑکی میں سے نکلا اور دوسری کوٹھڑی میں سے گزرتا ہوا دروازہ ذرا سا کھول کر دالان میں جھانک کر دیکھا۔ دالان خالی تھا۔

میں دالان میں سے تیز تیز قدموں سے گزر گیا اور مندر کی دیوار والے دروازے سے نکل کر عقبی تالاب کے پاس آ کر سامنے کی طرف چلنے لگا۔ عورتیں ابھی تک تالاب پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ میں اوپر سے ہو کر ناگ دیوی کے مندر میں اپنی کوٹھڑی میں آ گیا۔ میرا ساتھی ہندو یاتری چارپائی پر بیٹھا کوئی پوتھی کھولے بھجن گنگنا رہا تھا اور آگے پیچھے ہل رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

“مدن لال! تم کہاں گئے تھے؟”

میں نے کہا۔ “یونہی جنگل میں سیر کرنے نکل گیا تھا۔”

بولا۔ “اکیلے اس طرح جنگل میں نہ جایا کرو۔ تمہیں پتہ نہیں اس جنگل میں ناگن بدروحیں رہتی ہیں اور وہ دن کے وقت بھی اپنے شکار کی تلاش میں پھرتی رہتی ہیں۔”

“اچھا۔” میں نے کہا۔ “مجھے معلوم نہیں تھا۔ اب نہیں جاؤں گا۔”

لیکن رات کو میں نے مندر کے خفیہ تہہ خانے میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سارا دن میں نے مندر کی کوٹھڑی میں گزار دیا۔ جب رات ہوئی تو ہندو یاتری میرے اور اپنے لیے کھانا لے کر آ گیا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ اس نے کہا۔

“چلو ناگ دیوی کی پوجا کرنے چلتے ہیں۔”

میں نے کہا۔ “میرے سر میں درد ہے تم جاؤ۔ میں بعد میں آ جاؤں گا۔”

وہ بولا۔ “ارے بھیا تم کیسے ہندو ہو۔ ناگ دیوی کی پوجا کرنے نہیں جاتے؟”

میں نے کہا۔ “بھیا! میں تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گا۔ تم جاؤ۔”

وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد میں بھی کوٹھڑی سے نکل کر مندر کے پیچھے تالاب پر آ گیا۔ یہاں خاموشی تھی۔ اندھیرا ابھی تھا۔ مندر کی عقبی دیوار اندھیرے میں سیاہ پہاڑی ڈھلان کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ رات ہو گئی ہے۔ انتظار کرنا بیکار ہے۔ جو کچھ کرنا ہے ابھی کر گزرنا چاہیے۔ شاید میری بیوی کا کوئی سراغ مل جائے۔ میں تالاب کے کنارے کنارے چلتا مندر کی عقبی دیوار والے دروازے میں سے گزر کر دالان میں آ گیا۔ یہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں لے آنکھیں سکیڑ کر غور سے فرش کو دیکھا کہ کہیں

کوئی سانپ تو نہیں رینگ رہا۔ وہاں مجھے کوئی سانپ نظر نہ آیا۔

میں نے دل میں کلمہ شریف پڑھا اور بائیں جانب والی کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کوٹھڑی خالی پڑی تھی۔ یہاں سامنے والی دیوار میں بھی دروازہ تھا جس کے سوراخ میں سے میں نے دوسری طرف تنگ کوٹھڑی میں مرل سپیرے کو سانپ سے کھیلتے اور بین بجاتے دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید دروازہ بند ہو گا۔ مگر دروازہ کھلا تھا۔ میں نے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ کوٹھڑی میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ یہ وہی کوٹھڑی تھی جہاں دن کے وقت سپیرا سانپ سے کھیل رہا تھا اور دو سادھو آ کر وہاں بیٹھ گئے تھے۔ دونوں سادھو اس وقت وہاں نہیں تھے۔ میں دبے پاؤں چلتا کونے والے دروازے تک آیا۔ یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ ایک کھلا دہانہ تھا۔ جہاں سے نیچے سیڑھیاں جاتی تھیں۔ مرل سپیرا یہیں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے گیا تھا۔ میں نے وہاں رک کر کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ نیچے اندھیرا تھا اور کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ سادھو نے مرل سپیرے سے کہا تھا کہ نیچے گپھا میں مہاراج نے یکنہ کرنا ہے۔ یکنہ کسی تقریب کی رسم ہوتی ہے۔ مہاراج سے اس کی مراد مندر کا بڑا پجاری دیو گری ہی ہو سکتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اندھیرے میں سیڑھیاں اترنے لگا۔

گھپ اندھیرا تھا۔ میں دیوار کو پکڑ کر اتر رہا تھا۔ پندرہ بیس سیڑھیاں اترنے کے بعد مجھے آدمیوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوزیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح کی آوازیں تھیں۔ دو چار سیڑھیاں اترنے کے بعد میں ایک سرنگ نما راہ داری میں آ گیا۔ سرنگ نما راہ داری مجھے اس لیے نظر آ گئی تھی کہ اس کے آخری سرے پر جہاں راہ داری گھوم جاتی تھی شاید کوئی بجلی کا کمزور سا بلب روشن تھا یا کوئی مشعل جل رہی تھی۔ اس کی روشنی سرنگ میں پڑ رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ آدمیوں کی ملی جلی آواز سرنگ کے دوسرے سرے سے آ رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ آگے چلنے لگا۔ جب میں سرنگ کا موڑ مڑا تو سامنے دیوار کے ساتھ بجلی کا ایک دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ یہاں سرنگ بند ہو جاتی تھی اور تین چار

سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں۔ ان سیڑھیوں کے اوپر ایک چبوترا بنا ہوا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر آ گیا۔ اب آوازیں زیادہ صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ چبوترے کے آگے دیوار میں گول شگاف سا تھا۔ شگاف میں سے ایسی روشنی آ رہی تھی جیسے دوسری طرف کہیں آگ کا الاؤ روشن ہو۔

میں جھک کر چلتا ہوا شگاف کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور دوسری طرف دیکھا۔ تب معلوم ہوا کہ میں زمین سے کوئی دس فٹ کی بلندی پر ہوں۔ نیچے ایک بہت بڑا ہال کمرہ تھا یہ زمین دوز ہال کمرہ تھاز۔ ایک طرف بڑا سا تخت بچھا تھا۔ تخت پر ایک موٹی توند والا سیاہ فام پجاری گلے میں پھولوں اور ہڈیوں کی مالائیں ڈالے آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر تاج تھا جس میں سے ایک سانپ نے اپنا پھن اٹھا رکھا تھا۔ میں نے اس پجاری کو پہچان لیا۔ یہ وہی ناگ مندر کا بڑا پجاری دیو گری تھا جو میری بیوی کو دلی کے شری راج سے لے کر یہاں آیا تھا۔ اس کے اردگرد دونوں جانب چوکیوں پر گیروے کپڑوں والے دس پندرہ سادھو ترشول ہاتھوں میں لیے بیٹھے تھے۔ درمیان میں الاؤ روشن تھا۔ دو آدمی الاؤ کے گرد ڈھول کی تھاپ پر آہستہ آہستہ چکر کاٹ رہے تھے اور کوئی اشلوک پڑھ رہے تھے۔ شاید یہی یکنہ تھا۔

اچانک بڑے پجاری دیو گری نے ہاتھ بلند کر کے کسی عجیب زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ ناچنے والے آدمی رک گئے۔ چوکیوں پر سے چار سادھو اٹھے۔ انہوں نے قریب ہی پڑی ہوئی پانی کی گاگریں اٹھا کر پانی الاؤ میں انڈیل دیا۔ الاؤ کی آگ بجھ گئی۔ دوسرے آدمیوں نے بجھے ہوئے الاؤ کے اوپر ایک تخت لا کر بچھا گیا۔ سب چپ ہو کر بیٹھ گئے۔ پجاری دیو گری تخت سے اٹھا اور اونچی آواز میں اشلوک پڑھتے ہوئے اس نے تخت کے دو چکر لگائے اور بلند آواز اور اپنی زبان میں پھر کوئی بات کہی۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی حکم صادر کر رہا ہے۔

اس کا حکم پاتے ہی دو سادھو تیز تیز قدم اٹھاتے کونے والی دیوار کی طرف گئے۔ وہاں پردہ گرا ہوا تھا۔ انہوں نے پردہ ہٹایا اور دوسری طرف غائب ہو گئے۔ ہال کمرے میں سناٹا

چھایا ہوا تھا۔ پجاری دیوگری بجھے ہوئے الاؤ کے اوپر رکھے ہوئے تخت کی ایک طرف ترشول اٹھائے بت کی طرح کھڑا تھا۔ سب دم بخود بیٹھے تھے۔ دونوں سادھو پردہ ہٹا کر دوبارہ نمودار ہوئے۔ اس بار وہ اکیلے نہیں تھے۔ انہوں نے دو جوان لڑکیوں کو بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا اور لڑکیاں ایسے سر ادھر ادھر مارتی ہوئی چل کر آ رہی تھیں جیسے ان پر کوئی جادو کیا ہوا ہو یا ان کو کوئی نشہ پلا دیا گیا ہو۔ دونوں لڑکیاں سرخ ساڑھیوں میں تھیں اور ان کے اوپر والے دھڑ عریاں تھے۔ ساڑھیاں دھوتی کی طرح کمر کے گرد بندھی ہوئی تھیں۔ دونوں لڑکیوں کو تخت پر ایک دوسری کے ساتھ لٹا دیا گیا۔ دونوں میں سے کسی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ پجاری دیوگری نے ترشول والا ہاتھ اوپر اٹھا کر بلند آواز میں کچھ کہا۔ دونوں سادھو جو لڑکیوں کو وہاں لائے تھے دوڑ کر اپنی اپنی چوکی پر بیٹھ گئے۔

ایک بار پھر فضا میں سناٹا طاری ہو گیا۔

میں یہ سب کچھ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں لڑکیوں کو میں نے غور سے دیکھا ان میں میری بیوی جمیلہ نہیں تھی۔ پجاری دیوگری نے ترشول والا ہاتھ بلند کیا اور جس تخت پر لڑکیاں لیٹی ہوئی تھیں اس کے گرد چکر لگانے شروع کر دیے۔ وہ کچھ پڑھتا بھی جا رہا تھا۔ خدا جانے اس نے کتنے چکر لگائے ہوں گے۔ اس دوران دونوں لڑکیاں چپ چاپ لیٹی رہیں۔ کسی نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آخر پجاری دیوگری رک گیا۔ تخت کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے اونچی آواز میں کوئی اشلوک پڑھا اور ایک طرف اشارہ کیا۔ جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا اس طرف سے ایک سادھو پٹاری لے کر اٹھا اور پجاری دیوگری کے پاس آ کر بڑے ادب سے بیٹھ گیا۔ پجاری دیوگری نے پٹاری کا ڈھکن اٹھا دیا۔ ڈھکن کے اٹھتے ہی ایک سانپ نے پھنکار مار کر اپنا سر باہر نکالا اور پھن کھول کر لہرانے لگا۔ پجاری دیوگری نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ سانپ اس کی ہتھیلی پر آ کر بیٹھ گیا۔ پجاری دیوگری اونچی آواز میں اشلوک پڑھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے سانپ کو ایک لڑکی کے سینے پر بٹھا دیا۔

سانپ نے لڑکی کے سینے پر بیٹھتے ہی پھنکار مار کر پورے غصے اور غیض و غضب کے ساتھ لڑکی کے سینے پر تین بار ڈس لیا۔ لڑکی کے حلق سے بھیانک چیخ نکلی اور اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔ پجاری دیوگری نے سانپ کو لڑکی کے سینے سے اٹھا کر دوسری لڑکی کے عریاں سینے پر رکھ دیا۔ سانپ نے پھنکار مار کر دوسری لڑکی کے سینے پر بھی تین بار ڈس لیا۔ دوسری لڑکی کے حلق سے بھی ایک درد انگیز چیخ نکلی اور اس کا سر بھی سانپ کے زہر کے زیر اثر ایک طرف ڈھلک گیا۔

اس کے ساتھ ہی سارے سادھو اپنی اپنی چوکیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور جس تختے پر دونوں لڑکیاں بے ہوش یا مردہ پڑی تھیں اس کے گرد ڈھول تاشوں کی تھاپ پر جھوم جھوم کر رقص کرنے لگے۔ پجاری دیوگری دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے زور زور سے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ کافی دیر تک یہ وحشیانہ رقص جاری رہا۔ پھر آہستہ آہستہ سارے سادھو رقص کرتے جھومتے جھامتے واپس اپنی اپنی چوکیوں پر جا کر مورتیوں کی طرح بیٹھ گئے۔ دونوں بد نصیب لڑکیاں تختے پر بے سدھ ہو کر پڑی تھیں۔ ان کے جسم بالکل حرکت نہیں کر رہے تھے۔ پجاری دیوگری بھی اپنے شاہی تخت پر جا کر بیٹھ گیا۔

ہال میں ایک بار پھر گہری خاموشی ہو گئی۔

پجاری دیوگری آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا اور منہ میں کچھ گنگنا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کوئی منتر پڑھ رہا ہے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی زبان میں کوئی حکم صادر کیا۔ اس کا حکم پاتے ہی دو ہٹے کٹے سادھو اٹھ کر اس تختے کے پاس آئے جس پر دونوں لڑکیاں بے ہوش پڑی تھیں۔ ایک سادھو نے ایک لڑکی کو اور دوسرے سادھو نے دوسری لڑکی کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا اور ایک سادھو سامنے کی جانب اور دوسرا سادھو اس طرف آنے لگا جہاں فرش پر ذرا بلندی پر میں چبوترے پر چھپ کر بیٹھا یہ سارا پر اسرار خونیں منظر دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دوسری طرف مڑ جائے گا لیکن میں یہ دیکھ کر گھبرا گیا کہ وہ چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

میں جلدی سے اٹھ کر پیچھے ہو گیا اور سیڑھیاں اتر کر سرنگ میں آ کر ایک طرف اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ سادھو لڑکی کو کاندھے پر ڈالے شگاف میں سے نکلا۔

سیڑھیاں اتر کر سرنگ میں آیا اور اسی طرف چلنے لگا جس طرف سے میں آیا تھا۔ سرنگ میں واپس جانے کا یہی ایک راستہ تھا۔ میں پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ جس طرف سے مجھے وہاں سے بھاگ کر نکلنا تھا اس طرف سادھو لڑکی کو لے کر جا رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ضرور یہ سادھو لڑکی کو جنگل میں پھینکنے جا رہا ہو گا۔ میں بھی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے سرنگ میں واپس چلنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ سادھو سرنگ کا موڑ گھوم گیا۔ میں اس سے پندرہ بیس قدم پیچھے تھا اور میں نے جیب سے اپنا کمانڈو چاقو نکال لیا تھا کہ اگر سادھو نے مجھے دیکھ لیا اور مجھ پر حملہ کیا تو میں اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔

سادھو سرنگ میں چلتا گیا۔ آگے پھر سیڑھیاں آ جاتی ہیں جو اوپر اس کوٹھڑی میں جاتی ہیں جہاں میں نے مرلی سپیرے شنکو کو سانپ سے کھیلتے اور بین بجاتے دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ سادھو لڑکی کو جنگل میں پھینکنے جا رہا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے لڑکی کو اس قدر زہریلے سانپ نے تین بار کاٹا تھا وہ کیسے زندہ بچ سکتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ سادھو لڑکی کو اٹھائے تین چار سیڑھیاں چڑھ کر کوٹھڑی میں چلا گیا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں۔ اس کوٹھڑی کو سرنگ کی جانب کوئی دروازہ نہیں تھا۔ میں سرنگ کی دیوار کے ساتھ اندھیرے میں رک کر انتظار کرنے لگا کہ سادھو کوٹھڑی سے نکل کر مندر کے عقبی دروازے سے باہر نکل جائے تو میں وہاں سے نکلوں۔ مجھے وہاں کھڑے بمشکل دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہی سادھو کوٹھڑی کی دیوار کے شگاف میں دوبارہ نمودار ہوا۔ لڑکی اس کے کاندھے پر نہیں تھی۔ اتنی جلدی وہ لڑکی کی لاش کو جنگل میں پھینک کر واپس نہیں آسکتا تھا۔

سادھو سیڑھیاں اتر کر سرنگ میں واپس میری طرف ہی آ رہا تھا۔ میں اندھرے میں تھا۔ سوچا یہیں کھڑا رہتا ہوں۔ آگے آگے بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ آگے کی طرف بھاگا تو ہال کمرے میں دوسرے سادھو لوگ موجود ہیں۔ سارا کام خراب ہو جائے گا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ سرنگ کی آخری دیوار کے پاس دبے پاؤں تیز تیز قدموں سے گیا اور جہاں چبوترے کی سیڑھیاں شروع ہوتی تھیں۔ ان سیڑھیوں کی اوٹ میں اندھیرا تھا۔ میں وہاں

سمٹ کر بیٹھ گیا۔ سادھو چلا آ رہا تھا اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر گیا اور ہال کمرے میں دوسری طرف اتر گیا۔ ہال کمرے سے آدمیوں کے باتیں کرنے کی بھنبھناہٹ نما آوازیں کچھ دیر آتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔

میں بڑی احتیاط سے سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر گیا۔ ہال کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نیچے اتر کر سرنگ میں سے گزرتا ہوا اس کوٹھڑی میں آگیا جہاں میرے خیال میں سادھو سانپ سے ڈسوائی جانے والی نیم عریاں لڑکی کو چھوڑ گیا تھا۔ کوٹھڑی میں آکر میں نے دیکھا کہ لڑکی فرش پر بالکل سیدھی پڑی تھی۔ اس کے سرہانے کی جانب اوندھے رکھے ہوئے مٹکے پر دیا جل رہا تھا۔ لڑکی بے ہوش تھی اور جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں کمر سے اوپر اس کا جسم عریاں تھا۔ میں آہستہ آہستہ چل کر لڑکی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں اس کے سینے پر نگاہ ڈالی۔ سینے پر سانپ کے تین بار ڈسنے کے تین نشان صاف نظر آرہے تھے۔ ان نشانوں پر خون کی بوندیں نکل کر جم گئی تھیں۔

لڑکی آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔ وہ زندہ تھی۔ میں حیران ہوا کہ اس کو سانپ نے تین بار کاٹا ہے پھر بھی یہ زندہ ہے۔ مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے سانپ اتنا زہریلا نہ ہو۔ میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ جمیلہ کو کہاں تلاش کرنا چاہیے۔ یہی فیصلہ کیا کہ واپس ہال کمرے میں جاؤں اور وہاں سے جو راستہ دوسری طرف کسی تہہ خانے کو جاتا ہے وہاں جا کر جمیلہ کا کھوج لگانے کی کوشش کروں۔ اس طرف سادھو دوسری لڑکی کو لے گیا تھا۔ مجھے اپنے پیچھے سانپ کی پھنکار کی آواز آئی۔ میں گھبرا کر اٹھا اور دوڑ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ جس طرف سے میں کوٹھڑی میں آیا تھا اس طرف سے میں نے ایک سانپ کو آتے دیکھا۔ سانپ کالے رنگ کا تھا اور کچھ نہیں تو چار پانچ فٹ لمبا تھا۔ میں نے پہلے تو سوچا کہ وہاں سے نکل جاؤں لیکن جب دیکھا کہ سانپ فرش پر رینگتا ہوا سیدھا لڑکی کی طرف جا رہا ہے تو وہیں رک گیا۔

کوٹھڑی میں دیے کی روشنی صرف لڑکی کے اردگرد ہی پڑ رہی تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا اس جگہ اندھیرا تھا۔ سیاہ سانپ فرش پر بے ہوش پڑی لڑکی کے اردگرد چکر لگانے لگا۔

کوئی دس بارہ چکر لگانے کے بعد وہ لڑکی کے جسم پر چڑھ گیا۔ اس نے اپنا پھن اٹھار کھا تھا۔ وہ لڑکی کے جسم پر رینگ رہا تھا۔ رینگتا ہوا کبھی اس کی گردن سے لپٹ جاتا۔ وہاں سے اس کے سینے پر آجاتا۔ پھر لڑکی کی کمر کے پیچھے چلا جاتا۔ لڑکی نے کمر کے نیچے ساڑھی باندھی ہوئی تھی۔ سانپ ساڑھی کے اندر چلا گیا اور پھر اس کے پاؤں کی طرف سے باہر نکل آیا۔ مجھے اپنے ہندو یاتری دوست کی بات یاد آگئی۔ اس نے بتایا تھا کہ یہاں جو نئی لڑکی لائی جاتی ہے اسے رات کو ایک جگہ ڈال دیا جاتا ہے اور اس پر سانپ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ سانپ اس کے سارے جسم پر رینگتا رہتا ہے اور یوں اس لڑکی کے جسم کی بو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیتا ہے۔ اس کے بعد اگر لڑکی وہاں سے فرار ہو کر چاہے کسی جگہ پہنچ جائے سانپ اس کی بو کی مدد سے وہاں پہنچ جاتا ہے اور مفرور لڑکی کو ڈس کر ہلاک کر دیتا ہے۔

اس بے ہوش لڑکی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ اس قسم کا رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر تک سانپ بے ہوش لڑکی کے جسم سے چمٹ کر رینگتا رہا۔ پھر وہ لڑکی کے سینے پر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ جھوم رہا تھا۔ اس نے اچانک اپنا پھن لڑکی کے چہرے پر جھکایا اور لڑکی کے ہونٹوں پر منہ رکھ دیا۔ خدا جانے وہ لڑکی کو ڈس رہا تھا یا کیا کر رہا تھا۔ کوئی دس پندرہ سیکنڈ تک سانپ اسی حالت میں رہا۔ پھر اس نے پھن اٹھایا۔ زور سے پھنکارا اور لڑکی کے جسم سے اتر کر رینگتا ہوا جدھر سے آیا تھا ادھر کو چلا گیا۔ میں آہستہ سے چل کر لڑکی کے پاس آیا۔ لڑکی اسی طرح بے ہوش پڑی تھی۔ لڑکی کے ہونٹوں پر ایک جگہ سرخ خون کا نقطہ سا بن گیا تھا۔ شاید سانپ نے اسے وہاں کاٹا تھا۔ سانپوں کا یہ پر اسرار کھیل میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہی سلوک میری بیوی جمیلہ کے ساتھ بھی ان لوگوں نے کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر کہ وہ زندہ نہیں رہی ہوگی میرا خون کھول اٹھا۔ دل نے کہا چاقو کھول کر ہال کمرے کے دوسرے تہہ خانے میں جاؤ اور ان سب شیطان صفت آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دو۔ مگر اس طرح بہت ممکن تھا کہ جمیلہ مجھ سے اور دور کر دی جاتی۔ ابھی تک مجھے یہ بھی پتہ نہیں چل سکا تھا کہ میری بیوی اس جہنمی مندر میں موجود بھی ہے یا نہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہال کمرے کی دوسری جانب جو کوٹھڑیاں یا تہہ خانہ ہے وہاں جا کر دیکھو۔ میں اٹھ کر ہال کمرے کی طرف چلنے ہی لگا تھا کہ ایک نحیف سی آواز سن کر میرے قدم وہیں رک گئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا اوندھے گھڑے پر جلتے ہوئے دیے کی دھیمی روشنی میں بے ہوش لڑکی کو ہوش آچکا تھا۔ اسکی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ اسی طرح بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی مگر اپنے ہوش میں تھی۔ اس نے کمزور آواز میں کہا۔

"ادھر مت جاؤ۔"

میں نے جھک کر لڑکی کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی تھیں اور وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا تم زندہ ہو؟"

اس نے کہا۔ "میں زندہ ہوں۔ تم جان بچا کر یہاں سے چلے جاؤ۔ تم یہاں کیسے آگئے ہو۔"

میں نے کہا۔ "پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں تہہ خانے میں اور کون کون سی لڑکیاں ہیں؟"

اس لڑکی پر نقاہت طاری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس سے زیادہ بولا نہیں جا رہا۔ جمیلہ کی فوٹو میری پتلون کی جیب میں ہی تھی۔ میں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جیب سے فوٹو نکال کر لڑکی کی آنکھوں کے سامنے کر دی اور کہا۔

"درمیان میں جو لڑکی بیٹھی ہے کیا یہ لڑکی یہاں پر موجود ہے؟ یہ پنجابی بولتی ہے اور میری بیوی ہے۔ میں اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میری مدد کرو۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

لڑکی کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ بڑے غور سے فوٹو دیکھ رہی تھی۔ فوٹو پر دیے کی پوری روشنی پڑ رہی تھی۔ میں نے فوٹو پر جمیلہ کے چہرے پر انگلی رکھ دی۔

"یہ میری بیوی ہے۔ اس کا نام جمیلہ ہے۔ اسے پجاری دیوگری دلی سے لایا ہے۔"

لڑکی نے آنکھیں بند کرلیں اور گہرے سانس لینے لگی۔ میں نے جمیلہ کی فوٹو اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹالی۔ لڑکی نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کمزور آواز میں کہا۔

"کل آدھی رات کے بعد مندر کے پیچھے تالاب پر آجانا۔ اب چلے جاؤ' چلے جاؤ۔"

اور لڑکی نے کرب آمیز انداز میں آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے امید کی ایک کرن نظر آگئی تھی۔ میں نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا۔

"تمہارا شکریہ! میں کل آدھی رات کے بعد تالاب پر آجاؤں گا۔"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور کوٹھڑی کی کھڑکی میں سے دوسری طرف نکل کر دالان میں آگیا۔ دالان اندھیرے میں خالی پڑا تھا۔ مندر کا عقبی دروازہ اندر سے کنڈی لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ میں آہستہ سے کنڈی کھول کر باہر نکل گیا۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ ناگ دیوی کے مندر کی طرف سے بھجن گانے اور گھنٹیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ ہندو یاتری کوٹھڑی میں نہیں تھا۔ میں اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ اس پر اسرار لڑکی نے مجھے کل رات کس لیے بلایا ہے؟ ضرور وہ مجھے میری بیوی جمیلہ کے بارے میں ہی کچھ بتانے والی ہے۔ خدا کرے کہ وہ کوئی اچھی بات بتائے۔ خدا کرے کہ جمیلہ زندہ ہو۔ اگر خدانخواستہ وہ زندہ نہیں ہوگی تو میں اس شیطانی ناگ مندر کے کسی سادھو کو پجاری دیوگری سمیت کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا اور میں سو گیا۔

دوسرا دن میں نے مندر کے احاطے میں ہی گزارا۔

مجھے مشتاق علی صاحب نے دلی میں ہدایت کی تھی کہ میں مندر کے آس پاس کے علاقے میں زیادہ نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ کیونکہ اس قسم کے مندروں میں پولیس انٹیلی جنس کے ایک دو آدمی ضرور موجود ہوتے ہیں۔ دن گزر گیا' رات آگئی۔ مندر کے بھنڈار پر ہی میں نے تھوڑا بہت کھانا کھالیا۔ ہندو یاتری شام کے وقت کوٹھڑی میں آیا اور

یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ رات ناگ مندر میں پوجا کر کے گزارے گا۔ مجھے پر اسرار لڑکی نے آدھی رات کے بعد تالاب پر آنے کو کہا تھا۔ میرے پاس کوئی گھڑی نہیں تھی۔ مندر کے چھوٹے ہال کمرے میں ایک کلاک لگا تھا۔ میں نے کلاک پر رات کے بارہ بجے کا وقت دیکھا اور خاموشی سے مندر کی عقبی دیوار والے چھوٹے دروازے کی طرف چل پڑا۔ اس طرف اندھیرا بھی تھا اور کوئی بندہ بھی نہیں تھا۔ میں چھوٹے سے دروازے سے نکل کر نشیب میں تھوڑا اترنے کے بعد تالاب کے پاس آگیا۔ تالاب چوکور تھا۔ اس کی ایک جانب مندر کی پرانی دیوار تھی اور دوسری جانب بلکہ تین جانب جنگل تھا۔ جہاں درختوں کے جھنڈ شروع ہوجاتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ پر اسرار لڑکی مندر کے چھوٹے دروازے والے دالان میں سے نکل کر ہی آئے گی۔ چنانچہ میں وہیں ایک طرف ہٹ کر تالاب کے کنارے سیڑھیوں کے پتھر پر بیٹھ گیا۔

اس طرف روشنی بالکل نہیں تھی۔ اندھیرا گھپ تھا۔ مندر کی طرف گھنٹیاں کبھی کبھی بج اٹھتی تھیں۔ اس کے بعد پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ درختوں کے درمیان میں سے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے نظر آرہے تھے۔ تالاب کا پانی بالکل ساکن تھا۔ اندھیری رات میں اس کی سطح دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ تالاب کی دوسری طرف جنگل میں سے کسی وقت ہوا کا جھونکا آتا تو اپنے ساتھ دیودار' ناریل اور مہاگنی کے درختوں کی خوشبو بھی لاتا۔ کسی جگہ جھاڑیوں میں ایک جھینگر مسلسل بول رہا تھا۔ جھینگر کی آواز مجھے پریشان کر رہی تھی۔ اچانک جھینگر خاموش ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اندھیری رات میں ایک انسانی سایہ مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ پر اسرار لڑکی ہی ہو سکتی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سایہ قریب آکر مجھ سے تین چار قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ میں نے پر اسرار لڑکی کو فرش پر بے ہوشی کی حالت میں لیٹے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ اس وقت وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اندھیرا بھی تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے دقت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا تم مندر والی لڑکی ہو؟"

لڑکی نے جواب دیا۔

"ہاں۔ میں وہی ہوں۔"

اور وہ میرے قریب آگئی۔ کہنے لگی۔"

"میرے ساتھ آؤ۔"

وہ اندھیرے میں جنگل کی طرف ہوگئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ رات کی تاریکی میں گنجان درختوں کے خاکے ہی نظر آ رہے تھے۔ وہ درختوں کے درمیان چلتی جنگل میں بائیں طرف مڑ گئی۔ ذرا آگے جا کر درختوں کے نیچے ایک کوٹھڑی سی اندھیرے میں دکھائی دی۔ لڑکی نے میری طرف مڑ کر کہا۔

"ڈرو نہیں۔ میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔"

کوٹھڑی کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ مجھے لڑکی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ صرف اس کے سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔ اندھیری میں ماچس کی تیلی جلی اور روشنی ہوئی۔ لڑکی دیوار کے ایک طاق میں رکھی ہوئی موم بتی روشن کر رہی تھی۔ موم بتی روشن کر کے اس نے طاق میں سے اٹھا کر اسے فرش پر ایک طرف لگا دیا اور وہیں بیٹھتے ہوئے بولی۔ "یہاں بیٹھ جاؤ۔"

میں اس کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔ پراسرار لڑکی وہی تھی جس کو کل رات میں نے اس حالت میں دیکھا تھا کہ وہ فرش پر نیم بے ہوشی کی حالت میں نیم عریاں پڑی تھی اور سیاہ ناگ اس کے جسم پر رینگ رہا تھا۔ لڑکی کے نقش تیکھے تھے۔ رنگ سانولا تھا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ درمیان سے مانگ نکال کر اس نے بال شانوں پر ڈال رکھے تھے اور ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کہنے لگی۔

"کیا تم واقعی اسی لڑکی کے پتی دیو ہو جس کی فوٹو تم نے مجھے دکھائی تھی؟"

میں نے کہا۔ "ہاں میں ہی اس کا خاوند ہوں۔ میں مسلمان ہوں اور میری بیوی کا نام جمیلہ ہے۔"

میں اسے جمیلہ کے اغوا کے واقعات بتانے لگا تو پراسرار لڑکی نے ہاتھ تھوڑا سا اوپر اٹھا

کر کہا۔

"مجھے یقین آگیا ہے کہ اب جو کچھ میں تمہیں بتانے والی ہوں وہ بالکل سچ ہے۔ اسے غور سے سنو۔ تمہاری بیوی جمیلہ -----"

میں نے اس کی بات کاٹ دی اور بے تابی سے پوچھا۔

"وہ زندہ ہے ناں؟"

پراسرار لڑکی نے میری طرف گھور کر دیکھا اور بولی۔

"بیچ میں نہ بولو۔ تمہاری بیوی زندہ ہے۔ جب اسے ناگ دیوی کے مندر کے تہہ خانے میں لایا گیا تھا تو وہ مجھے ملی تھی۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا تھا۔ لیکن خود میں بھی اسی حالت میں تھی۔ میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے مجھے اپنا نام جمیلہ ہی بتایا تھا۔ وہ بہت غم زدہ تھی، پریشان تھی۔ پجاری دیوگری نے تمہاری بیوی کو شتابلی اشنو کے لیے پسند کر لیا اور ناگ یگیہ کے بعد اسے سنتھاولی کے خونی ناگ مٹھ میں بھجوا دیا ہے۔ تمہاری بیوی جملہ یہاں مندر میں نہیں ہے۔ وہ اس وقت سنتھاولی کے ناگ مٹھ میں ہے۔ وہاں ایک ماہ تک اس پر خاص منتر پڑھ کر پھونکے جائیں گے۔ اس سے زبردستی تپسیا کروائی جائے گی تاکہ وہ پوری طرح شدھ ہو کر ہندو عورت بن جائے۔"

میں پریشانی کے عالم میں پراسرار لڑکی کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میری بیوی کے ساتھ ایسا سلوک بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

"خدا کے لیے اگر تم سچے دل سے میری مدد کرنا چاہتی ہو تو مجھے بتاؤ کہ یہ سنتھاولی مٹھ کس جگہ پر ہے۔ میں جان کی بازی لگا کر وہاں سے اپنی بیوی کو نکال لے جاؤں گا۔"

پراسرار لڑکی نے گہرا سانس بھر کر کہا۔

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ پجاری دیوگری نے تمہاری بیوی کو ناگ یگیہ کی رسم ادا کرنے کے بعد سنتھاولی کے مٹھ میں بھیجا ہے۔"

"اس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے پوچھا۔

پراسرار لڑکی بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ تمہاری بیوی کے جسم پر بھی پوری رات

سیاہ سانپ کو پھرانے کے بعد وہاں بھیجا گیا ہے۔ تم اپنی بیوی کو نکال کر جہاں بھی لے جاؤ گے ناگ دیوی کے سانپ اس کا پیچھا کریں گے اور اس کے ساتھ تمہیں بھی موقع ملتے ہی ڈس کر ہلاک کر ڈالیں گے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن میری بیوی کے جسم پر تو تمہارے کہنے کے مطابق صرف ایک سانپ کو پھرایا گیا ہے۔ میری بیوی کے جسم کی بو کا تو صرف ایک سانپ کو احساس ہے۔ میں اس سانپ کو ہلاک کر سکتا ہوں۔"

پر اسرار لڑکی کہنے لگی۔

"ناگ یگنہ میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک رات کالا سانپ نئی آنے والی لڑکی کے جسم پر پھرایا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ سانپ ناگ دیوی کے باقی سارے زہریلے سانپوں کو اپنی پھنکار سے لڑکی کے جسم کی بو سے روشناس کرا دیتا ہے۔ اس وقت ناگ دیوی کے مندر کے تہہ خانے میں سینکڑوں زہریلے سانپ پٹاریوں میں بند ہیں۔ یہ سارے سانپ جس طرح میرے بدن کی بو سے واقف ہو چکے ہیں اسی طرح تمہاری بیوی کے جسم کی بو سے بھی واقف ہو گئے ہیں۔ یہ بو ان سانپوں کو سینکڑوں میل کے فاصلے سے آ جاتی ہے تم ایک سانپ کو ہلاک کرو گے تو اس کی جگہ دوسرا سانپ تمہاری بیوی کی بو پر چل پڑے گا اور وہ جہاں بھی ہو گی وہاں کسی نہ کسی طرح پہنچ کر اسے مار ڈالے گا۔"

میں نے اس سے سوال کیا۔

"تم اس وقت ناگ دیوی کے مندر سے کافی دور جنگل میں آ گئی ہو۔ مگر تمہیں تو کسی سانپ نے نہیں ڈسا۔ کوئی سانپ تمہارے جسم کی بو پا کر تمہارے پیچھے پیچھے نہیں آیا۔"

پر اسرار لڑکی بولی۔

"ناگ مندر کی حد اس پرانی سمادھ کی کوٹھڑی تک ہے۔ اگر میں اس سے آگے گئی تو کوئی نہ کوئی سانپ تہہ خانے کی پٹاری سے نکل کر میرا پیچھا کرنا شروع کر دے گا اور مجھے ڈس کر ہلاک کر دے گا۔"

میں عجیب صورت حال میں پھنس گیا تھا۔ میں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ ڈھاکے

میں اپنی بیوی کے ساتھ سکون سے زندگی بسر کرتے کرتے میری زندگی میں یہ انقلاب بھی آ جائے گا اور سانپوں کی پوجا کرنے والوں کے چنگل میں پھنس جائیں گے۔ میں اور میری بیوی بھیانک قسم کے حالات کا شکار ہو چکے تھے لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ مجھے اپنے خدا پر بھروسہ تھا۔ میرے دل کو یقین تھا کہ ان پجاریوں کے سانپ مجھے اور میری بیوی کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اس کے باوجود کسی وقت یہ خیال ضرور آتا تھا کہ اگر خدانخواستہ کسی سانپ نے دشمن بن کر انجانے میں حملہ کر دیا تو میرے پاس سانپ کے زہر کا کوئی توڑ نہیں تھا۔ لیکن اس وقت سب سے اہم سوال اپنی بیوی جمیلہ کو ان شیطانی پجاریوں کے چنگل سے چھڑانا تھا۔

میں نے پر اسرار لڑکی سے کہا۔

"تم مجھے سنتھا ولی مٹھ کا راستہ بتا دو۔ میں وہاں جا کر اپنی بیوی کو نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

پر اسرار لڑکی نے جواب دیا۔

"سنتھا ولی مٹھ میں کسی مسلمان کو داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسلمان مسافر ادھر آ نکلے تو مٹھ کے سانپ اسے ڈس کر مار ڈالتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"سانپوں کو کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ مسافر مسلمان ہے؟"

لڑکی نے کہا۔

"مسلمان بتوں کی پوجا نہیں کرتے۔ وہ صرف ایک خدا کو مانتے ہیں۔ اس لیے ان کے جسم سے ہر وقت ایک خاص قسم کی خوشبو نکلتی رہتی ہے۔ دیو گری نے ناگ مندر کے اور سنتھا ولی مٹھ کے تمام سانپوں کو مسلمانوں کے جسم سے نکلنے والی اس خاص خوشبو سے واقف کرا رکھا ہے۔ جیسے ہی سنتھا ولی مٹھ کے علاقے میں کوئی مسلمان داخل ہوتا ہے تو وہاں کے سانپوں کو اس کے بدن سے نکلنے والی خاص خوشبو محسوس ہو جاتی ہے وہ اس خوشبو کا پیچھا کرتے مسلمان مسافر تک آتے ہیں اور اسے ڈس لیتے ہیں۔"

اس پر اسرار لڑکی نے مجھے یہ بتایا کہ سنتھا ولی مٹھ یہاں سے سینکڑوں میل دور ایک

ایسے خطرناک جنگل میں واقع ہے۔ جس کے چاروں طرف ویران پہاڑیاں ہیں اور جنگل میں دلدلیں ہیں اور ایسے آدم خور درخت ہیں کہ اگر کوئی آدمی ان کے قریب سے گزرے تو درخت کی شاخیں نیچے جھک کر اس آدمی کو اوپر اٹھا لیتی ہیں اور پھر اس کے جسم کا سارا خون چوس کر اس کو ہڑپ کر جاتی ہیں۔ میں نے کہا۔

”چاہے کچھ ہو جائے میں اپنی بیوی کو بچانے سنتھا ولی مٹھ میں ضرور جاؤں گا۔ تم مجھے اس جنگل کا راستہ بتاؤ۔“

پراسرار لڑکی ایک لمحے کے لیے چپ ہوگئی وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

”میں مسلمان نہیں ہوں۔ ہندو عورت ہوں۔ میں دیوی دیوتاؤں کی بدعاؤں کو مانتی ہوں۔ تم مسلمان ہو۔ تم دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتے۔“

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تمہارے دیوی دیوتاؤں کو بالکل نہیں مانتا۔“

پراسرار لڑکی بولی۔

”اسی لیے میں نے کہا تھا کہ سنتھا ولی مٹھ کے سانپ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن میری بیوی جمیلہ بھی مسلمان ہے۔ اس کے بدن سے بھی مسلمانوں والی خوشبو آتی ہوگی۔ پھر سانپوں نے اسے کیوں نہیں ڈسا؟“

لڑکی بولی۔ ”تمہاری بیوی کے جسم پر ساری رات سانپ کے پھرتے رہنے کے بعد اس کے جسم کی مسلمان والی خوشبو دب گئی ہے اور سانپ کی بو زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ اسی لیے سنتھا ولی مٹھ میں جب تمہاری بیوی کو لے جایا گیا تو سانپوں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ انہیں تمہاری بیوی کے جسم سے نکلنے والی مسلمانوں والی خوشبو محسوس نہیں ہوئی تھی۔“

جب میں نے پراسرار لڑکی سے دوبارہ اصرار کیا کہ وہ مجھے سنتھا ولی مٹھ کا پتہ بتائے تو وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ٹھنڈا سانس بھر کر بولی۔

”عورت ہونے کے ناطے میں تمہاری بیوی کے دکھ درد کو اچھی طرح محسوس کرتی ہوں۔ میں تمہاری بیوی کو سانپوں کے جہنم سے نکالنا چاہتی ہوں۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ جیسے ہی میں تمہارے ساتھ یہاں سے دس قدم آگے گئی ناگ مندر کے تین چار زہریلے سانپ اپنی اپنی پٹاریوں سے نکل کر میرا پیچھا کرنا شروع کر دیں گے اور میرے ساتھ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

میں نے اس سے کہا۔

”تم ہمارے لیے اپنی زندگی خطرے میں نہ ڈالو۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ سنتھا ولی مٹھ جس جنگل میں واقع ہے وہ یہاں سے کس طرف ہے۔ باقی میں جانوں میرا کام۔“

وہ کہنے لگی۔

”میں تمہیں اس لیے سنتھا ولی مٹھ کا پتہ نہیں بتا رہی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم وہاں پہنچ کر زندہ نہیں رہو گے۔ وہاں کے سانپ جو سنتھا ولی مٹھ کے پہرے دار ہیں جنگل میں داخل ہوتے ہی تمہیں ڈس کر مار ڈالیں گے۔ تم اپنے آپ کو ان سانپوں سے نہیں بچا سکو گے۔ وہ سانپ زمین پر بھی رینگتے ہیں اور ہوا میں اڑ کر بھی حملہ کرتے ہیں۔“

میں نے اسے کہا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں ہر حالت میں اپنی بیوی کی مدد کو وہاں جاؤں گا۔

”اگر تم نے مجھے سنتھا ولی مٹھ کا پتہ نہ بتایا تو میں کسی اور جگہ سے معلوم کر کے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنی بیوی کو ان شیطانوں کے نرغے سے نکال لانے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔“

جنگل میں تاریک رات گہری خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کے فرش پر لگائی ہوئی موم بتی کافی پگھل چکی تھی۔ پراسرار لڑکی سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ پھر اچانک اس نے سر اٹھایا اور کہنے لگی۔

”ٹھیک ہے۔ میں جمیلہ کو بچانے، اسے ناگ مندر کے راکھشوں کی قید سے نکالنے کے لیے خود تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

میں تحسین آمیز نگاہوں سے پراسرار ہندو لڑکی کا منہ تکنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”تم ہماری خاطر اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ میں اکیلا ہی اس مہم پر جاؤں گا۔“

لڑکی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"میں خود بھی اس جہنم سے نکلنا چاہتی ہوں۔ ہو سکتا ہے تمہارا خدا میری بھی مدد کرے اور مجھے بھی ان خونی پجاریوں اور سانپوں کی موت سے بدتر زندگی سے نجات مل جائے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن سانپ تمہارا پیچھا کریں گے۔"

وہ بولی۔ "یہ خطرہ تو مجھے مول لینا ہی پڑے گا۔"

میں نے کہا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟ تم نے ابھی تک مجھے اپنا نام نہیں بتایا۔"

وہ بولی۔ "میرا نام کاویری ہے۔ اس سے زیادہ مجھ سے کچھ نہ پوچھنا۔ اس سے زیادہ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "کاویری! ایک بار پھر سوچ لو۔"

وہ فیصلہ کن انداز میں کہنے لگی۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تمہاری بیوی کو سنتھاولی مٹھ سے فرار کرانے خود بھی یہاں سے فرار ہو کر تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

میں بڑا متاثر ہوا۔ یہ سانولی لڑکی بڑی بہادر تھی اور اس کا دل انسانی ہمدردی کے جذبے سے لبریز تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں اور میری بیوی مسلمان ہیں لیکن اس کے باوجود وہ میری بیوی کو ناگ دیوی کے شیطان صفت پجاریوں کے عذاب سے نجات دلانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہی تھی۔ جس طرح رات کو میں نے اس نیم عریاں بدن پر سانپ کو رینگتے اور اس کے ہونٹوں پر ڈستے دیکھا تھا اس سے میں اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ زہریلے سانپ اس لڑکی کا اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ دوسری مشکل یہ آن پڑی تھی کہ بقول پر اسرار لڑکی کاویری کے میری بیوی جمیلہ کے جسم پر بھی سانپ کو پھرایا جا چکا تھا اور اب اس کی زندگی بھی ان زہریلے سانپوں کے رحم و کرم پر تھی۔ مجھے اپنی بیوی کو بھارت سے نکال کر واپس پاکستان بھی لے جانا تھا اور ان زہریلے سانپوں کے چنگل سے بھی بچانا تھا۔ اس کا میں نے سوچ لیا تھا کہ میں پوری طرح چاق و

چوبند اور ہوشیار رہوں گا اور بھارت سے پاکستان کی طرف فرار ہوتے وقت جمیلہ کی پوری نگرانی کروں گا۔ بلکہ رات کو بھی اس کے گرد چل پھر کر پہرہ دوں گا۔ اگر کوئی دشمن سانپ نظر آگیا تو میں اسے وہیں کچل ڈالوں گا۔ جس طرح پر اسرار لڑکی توہم پرست تھی اور سانپوں کو دیوی دیوتا سمجھتی تھی میں ویسا نہیں تھا۔ میں سانپ کو محض ایک موذی کیڑا ہی سمجھتا تھا جو بہرحال انسانوں سے ڈرتا ہے اور ہم اسے ہلاک کر سکتے ہیں۔

جب کاویری نے میری بیوی جمیلہ کو بچانے کی خاطر میرے ساتھ ناگ دیوی کے مندر سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی فرش پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کاویری نے میری طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا اور بولی۔

"باہر آجاؤ۔"

میں کوٹھڑی سے باہر آگیا تو اس نے موم بتی پھونک مار کر بجھا دی اور خود بھی کھنڈر نما کوٹھڑی سے باہر نکل آئی۔ باہر رات تاریک تھی۔ ہم جنگل کے مشرقی کنارے پر تھے۔ گھنا اور خطرناک جنگل آگے جا کر شروع ہوتا تھا مگر جنگل یہاں بھی ہیبت ناک تھا اور لگتا تھا کہ ابھی کسی طرف سے کوئی شیر نکل کر ہم پر حملہ کر دے گا۔ میں نے احتیاط کے طور پر جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنے کمانڈو چاقو پر گرفت مضبوط کر رکھی تھی۔

کاویری میرے آگے آگے اندھیرے میں چل رہی تھی۔ جب ہم تالاب کے پاس پہنچے تو وہ رک گئی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"تم کل آدھی رات کے بعد اسی جگہ آجانا۔ میں بھی آجاؤں گی۔ پھر ہم یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔"

میں نے پوچھا۔

"سنتھاولی کا مٹھ یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

وہ بولی۔ "کل بتاؤں گی۔"

اتنا کہہ کر وہ مندر کی عقبی دیوار والے دروازے کی طرف چلی گئی۔

میں واپس مندر کی کوٹھڑی میں آکر لیٹ گیا۔

مجھے اس بات کا احساس تھا کہ یہ پر اسرار مگر بہادر لڑکی کاویری اس حالت میں یہاں سے فرار ہو رہی ہے کہ قدم قدم پر انتہائی زہریلے سانپ اس کا پیچھا کر رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ پجاری دیو گری کے بدمعاش پجاری بھی اس کو قتل کرنے کے لیے اس کے پیچھے لگ جائیں۔ یہ بات بھی تھی کہ وہ میرے ساتھ فرار ہو کر سنتھاولی مٹھ جا رہی تھی۔ یعنی دشمنوں کی قید سے فرار ہو کر دشمنوں کے پاس ہی جا رہی تھی۔ سنتھاولی مٹھ میں بھی زہریلے سانپ اور خونخوار قسم کے شیطانی پجاری موجود تھے۔ میں تو اپنی بیوی، اپنی عزت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہا تھا، لیکن کاویری صرف میری بیوی جمیلہ کو بچانے اور اسے خطرناک درندہ صفت پجاریوں کی قید سے نجات دلانے کے لیے سنتھاولی مٹھ جا رہی تھی۔ ورنہ وہ فرار ہونے کے بعد بھارت کے کسی دوسرے بڑے شہر کلکتہ، بمبئی یا مدراس یا دلی کی طرف بھی نکل سکتی تھی۔ اگر وہ ایک خطرے سے نکل کر دوسرے خطرے کی طرف جا رہی تھی تو صرف میری بیوی جمیلہ کو بچانے کے لیے۔ ورنہ وہاں جانے کی اسے کوئی ضرورت نہیں تھی۔

میں اس سانولی لڑکی کاویری کے اس جذبے سے بڑا متاثر ہوا۔

پاکستان کی نئی نسل بھارت کے اس علاقے کے بارے میں بہت کم جانتی ہے، جن علاقوں کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ پرانی نسل کے جو لوگ ان علاقوں سے واقف ہیں انہیں معلوم ہوگا کہ سنبھل پور اور دیو گڑھ کا علاقہ بھارت کے صوبہ مدھیہ پردیش اور صوبہ اوڑیسہ کے درمیان واقع ہے۔ اس کے جنوب میں آندھرا پردیش شروع ہو جاتا ہے۔ اس علاقے میں بھارت کے انتہائی گنجان دشوار گزار اور خطرناک پہاڑی جنگلات کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ جہاں ہر قسم کے درندے اور حشرات الارض پائے جاتے ہیں بلکہ میری معلومات کے مطابق ان جنگلات میں بعض ایسے گوشے بھی ہیں جہاں آج تک کوئی شکاری بھی نہیں جا سکا۔ یہ جنگل دیو گڑھ اور سنبھل پور سے جنوب کی طرف شروع ہو جاتے تھے اور میں اس وقت دیو گڑھ اور سنبھل پور کے درمیان ناگ دیوی کے مندر میں ہی تھا۔ مجھے انداز ہو گیا تھا کہ پر اسرار لڑکی کاویری جس سنتھاولی مٹھ کی طرف مجھے لے جانے والی ہے وہ جنوب کے جنگلوں میں ہی کسی پہاڑی جنگل میں واقع ہوگا۔ سنبھل پور اور دیو گڑھ کے جنوب مغرب میں بڑا شہر رائے پور اور شمال کی جانب بلاس پور ہی آتا تھا جو وہاں سے کافی فاصلے پر تھے۔

انہی خیالات میں الجھا میں کافی دیر تک جاگتا رہا۔ پھر مجھے نیند آگئی۔ صبح کافی دن نکل آیا تھا جب میں جاگا۔ میرا ہندو یاتری ساتھی رات کے پچھلے پہر ناگ دیوی کے مندر میں پوجا کر کے آیا تھا اور ابھی تک سو رہا تھا۔ وہ دن بھی میں نے مندر کی چار دیواری میں ہی رہ کر گزار دیا۔ رات ہو گئی تو میں نے فرار کی تیاری شروع کر دی۔ صرف ذہنی طور پر مجھے تیار ہونا تھا ورنہ میرے پاس سامان وغیرہ تو کچھ تھا نہیں۔ کئی روز سے میں نے شیو نہیں بنائی تھی۔ میں نے مندر کے احاطے کے باہر ایک حجام کے کھوکھے میں گیس کی روشنی میں بیٹھ کر شیو بنوائی۔ واپس تالاب میں جا کر غسل کیا۔ پرانی قمیض اتار کر وہیں پھینک دی اور نئی دھلی ہوئی قمیض پہن لی۔ کوٹ میں نے پہلے ہی کہیں پھینک دیا تھا۔ ٹھنڈے نیلے رنگ کے کپڑے کی معمولی سی جرسی تھی جو میں نے پہن لی۔ کیونکہ یہاں پر سردی بالکل نہیں تھی۔ جرسی اس لیے پہنتا تھا کہ اس میں چار پانچ چیزیں تھیں جن میں میں کچھ ضروری چیزیں رکھ سکتا تھا۔ جمیلہ کی فوٹو والا لفافہ میں نے اپنی پرانی پتلون کی عقبی جیب میں ڈال رکھا تھا۔ کچھ بھارتی کرنسی نوٹ جو بچ رہے تھے وہ میں نے جرسی کی اندر

والی جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ بڑا کمانڈو چاقو میری پتلون کی دائیں طرف والی جیب میں تھا۔

میں کوٹھڑی میں واپس آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند آجانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی پوری طرح بیدار تھا۔ وقت میں نے دیکھ لیا تھا۔ اسی اندازے سے میں آنکھیں بند کر کے چارپائی پر دیر تک لیٹا رہا۔ جب لیٹے لیٹے کافی دیر ہوگئی تو اٹھ کر باہر مندر کے کمرے میں گیا۔ وہاں دیوار کے ساتھ ایک کلاک لگا تھا۔ وقت رات کے دس بجے کا تھا۔ ابھی مجھے مزید گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزارنا تھا۔ کاویری کے بارے میں مجھے کل رات کا تجربہ ہوچکا تھا۔ وہ ٹھیک آدھی رات کے فوراً بعد تالاب پر آگئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب کوٹھڑی میں جا کر لیٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ میں مندر کے اس کمرے میں ہی بیٹھ گیا۔ یہ کوئی کمرہ نہیں تھا۔ ایک قدرے کشادہ کوٹھڑی تھی۔ کچھ یاتری عورتیں اور مرد ادھر ادھر چٹائیاں بچھا کر بیٹھے تھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ عام ہندو یاتریوں والے لباس یعنی لمبے لمبے کرتے اور دھوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ عورتوں نے بھی دھوتی نما ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان میں صرف میں ایک ایسا یاتری تھا جس نے پتلون قمیض اور جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔

دیوار پر جہاں کلاک لگا ہوا تھا اس کے نیچے ایک آدمی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسی نے مجھے دو تین بار گھور کر دیکھا ہے۔ بھارتی انٹیلی جینس کا مجھے شروع ہی سے خطرہ لگا ہوا تھا۔ میں انڈین نیشنل نہیں تھا' پاکستانی تھا۔ میرے پاس بھارت میں داخل ہونے کے لیے جس ویزے کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی نہیں تھا اور میں جنگی قیدیوں کی گاڑی سے چھلانگ لگا کر فرار بھی ہوچکا تھا۔ اگرچہ میں جس مصیبت میں گرفتار تھا وہ بھارت میں غیر قانونی طور پر رہنے کی مصیبت سے زیادہ بڑی اور گھمبیر تھی یعنی مجھے اپنی بیوی کی تلاش تھی۔ اس کے باوجود میں بھارت میں غیر قانونی طور پر اور ایک مفرور پاکستانی جنگی قیدی کی حیثیت سے موجود ہونے کی حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس آدمی کو اپنی طرف گھورتے دیکھا تو قدرتی طور پر محتاط ہوگیا۔ لیکن میں وہاں سے

اٹھا نہیں۔ اسی جگہ اسی حالت میں بیٹھا جائزہ لیتا رہا کہ کیا واقعی یہ شخص کوئی مشتبہ شخص ہے یا مجھے ویسے ہی شک پڑا ہے۔

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میں اس آدمی پر نظر ڈالتا تو وہ آدمی پہلے ہی سے مجھے دیکھ رہا ہوتا تھا۔ جب نگاہیں چار ہوتیں تو وہ جلدی سے نظریں دوسری طرف کر لیتا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ یہ آدمی میری نگرانی کر رہا ہے تو میں وہاں سے اٹھ کر اپنی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔ میرا ساتھی ہندو یاتری آج بھی ناگ دیوی کی پوجا کرنے گیا ہوا تھا۔ میں کوٹھڑی میں آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لیکن میں کچھ بے چین ہوگیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کاویری کے ساتھ ایک انتہائی اہم مہم پر روانہ ہونا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس مہم میں انڈین انٹیلی جینس والا بھی میرے پیچھے لگ جائے۔ ظاہر ہے وہ یہاں اکیلا نہیں ہوگا اس کا کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور اس کے ہمراہ وہاں آیا ہوگا اور ان لوگوں کے پاس اسلحہ وغیرہ بھی ہوگا۔ میں اس خطرے کو اپنے ساتھ لے کر اپنی بیوی کی تلاش کی مہم پر روانہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس شخص سے نجات حاصل کرنا ضروری ہوگیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس سے نجات کیسے حاصل کی جائے۔ یہی ایک راستہ تھا کہ میں اسے جل دے کر کسی طرح مندر کے پیچھے جنگل والے تالاب اور کوٹھڑی کی طرف نکل جاؤں۔ اگر میں اسے کسی طریقے سے ہلاک کر دیتا تو کسی نئی مصیبت کے کھڑے ہو جانے کا ڈر تھا۔ میں خواہ مخواہ خود کو اور کاویری کو کسی نئی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی وقت چھپ کر جنگل کی طرف نکل جانے کا فیصلہ کیا اور کوٹھڑی سے نکل کر اندھیرے میں مندر کے عقبی دروازے کی طرف چل پڑا۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ مندر کا یہ علاقہ دن کے وقت بھی خالی خالی رہتا تھا' رات کے وقت تو یہاں سناٹا طاری تھا۔ میں بھی مندر کے عقبی چھوٹے دروازے سے چھ سات قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ پیچھے سے مجھے آواز آئی۔

"بھیا جی! ذرا ٹھہرنا۔"

میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔ مجھے اندھیرے میں ایک آدمی اپنی طرف آتا نظر آیا۔ یہ

آدمی مندر والے مشکوک شخص کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی مندر والا مشتبہ آدمی تھا۔ اچھے قد کاٹھ کا آدمی تھا اور ادھیڑ عمر بھی زیادہ نہیں تھا۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ اپنی کھدر کی واسکٹ میں ڈال رکھا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے بھیا؟"

یہاں اندھیرا ضرور تھا مگر کچھ فاصلے پر ایک کوٹھڑی کے باہر بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی میں ہم دونوں کی شکل و صورت نظر آ رہی تھی۔ وہ میرے اور قریب ہو گیا۔ اپنا دایاں ہاتھ اس نے ابھی تک صدری کی جیب میں ہی ڈالا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس جیب میں بھرا ہوا پستول یا ریوالور ہے۔ میری کمانڈو کی ٹریننگ کی حس پوری طرح بیدار ہو گئی۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا کہ اگر اس شخص نے مجھے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا تو مجھے کیا کرنا ہو گا۔ وہ میرے اور قریب آگیا اور خاص انٹیلی جینس کے آدمیوں کے انداز میں میری طرف مسکرا کر دیکھنے لگا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے بڑے اعتماد اور کسی قدر بے نیازی سے کہا۔

"امرتسر سے ناگ دیوی کے درشنوں کو آیا ہوں۔ کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا جیسے اس کو میرے بیان پر یقین نہ آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"امرتسر میں کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "کیا بات ہے؟ تم کون ہو؟"

اس آدمی کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ کہنے لگا۔

"ذرا میرے ساتھ مندر کے باہر تک آؤ۔"

میں نے کہا۔

"کیوں آؤں؟ تم مجھے اس طرح حکم دینے والے کون ہو؟"

اسی وقت اس آدمی نے صدری کی جیب سے ہاتھ باہر نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمیں معلوم ہے کہ تم پاکستان کے جنگی قیدی ہو۔ تمہیں ہمارے ساتھ پولیس چوکی تک چلنا ہو گا۔"

اس نے ہمیں کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی اس کی ہمراہ ہیں اور وہ یہیں کہیں ادھر ادھر چھپے ہوئے ہوں گے۔ میں نے فوراً حکمت عملی تبدیل کر لی۔ کیونکہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"بھیا! تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے۔ میں پاکستانی جنگی قیدی نہیں ہوں۔ میرا نام مدن لال ہے اور امرتسر میں میری خیاری کی دکان ہے بازار مائی سیواں میں۔"

اس آدمی نے میری طرف مسلسل گھورتے ہوئے اپنے ساتھی کو آواز دی۔

"دھرم چند! آ جاؤ تم بھی۔"

دائیں جانب دیوار کے پیچھے سے ایک آدمی نکل کر ہمارے سامنے آگیا۔ آتے ہی بولا۔

"کیا کہتا ہے یہ گنگا دین؟"

پہلے والے سی آئی ڈی آفیسر کا نام گنا دین تھا۔ کہنے لگا۔

کہتا ہے میرا نام مدن لال ہے میں پاکستانی جنگی قیدی نہیں ہوں۔"

گنگا دین نے ہنس کر کہا۔

"دھرم چند جی اس کی پتلون اتروا لیتے ہیں۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ ہندو ہے یا مسلمان۔"

میں خطرے کی آخری سرحد پر آگیا تھا۔ یہاں سے فرار کا ایک ہی راستہ تھا جو میں نے سوچ لیا۔ اگر یہ لوگ میری پتلون اتروا لیتے تو ایک لمحے میں صورت حال بالکل بدل جاتی اور یہ بات ثابت ہو جاتی کہ میں وہی جنگی قیدی ہوں جو ٹرین سے چھلانگ لگا کر مفرور ہوا تھا۔ گنگا دین کہنے لگا۔

"یہ تو مجھے پاکستانی جاسوس لگتا ہے دھرمو۔"

دھرم چند نے کہا۔ "اس کی پتلون اترواؤ۔"

گنگا دین بھی جوان آدمی تھا۔ مگر جسمانی طاقت میں دونوں مجھ سے کمزور تھے۔ گنگا دین بولا۔

"پتلون یہ خود اتارے گا۔"

پھر اس نے مجھے حکم دیا۔

"چلو بھیا! ذرا اپنی پتلون تو اتارو۔"

اس دوران میں ان کی طرف دیکھ بھی رہا تھا اور میں نے یہ سوچ بھی لیا تھا کہ ان سے کس طرح نجات حاصل کرنی ہوگی۔ یہ بھارتی پولیس انٹیلی جینس کے لوگ تھے۔ صرف پستول دکھا کر دوسرے کو قابو میں کر سکتے تھے۔ انہیں علم ہی نہیں تھا کہ ان کے سامنے جو جوان آدمی کھڑا ہے اور جسے وہ پتلون اتارنے کے لیے کہہ رہے ہیں وہ پاک آرمی کا ایک سابق عہدے دار ہے اور تربیت یافتہ کمانڈو بھی ہے۔ میں نے انہیں کہا۔

"میں نہ تو پاکستانی مفرور جنگی قیدی ہوں اور نہ پاکستانی جاسوس ہوں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں پتلون اتار دیتا ہوں۔"

اور میں نے پتلون کی پٹی کھولنی شروع کر دی۔ اصل میں میں پتلون کی پٹی نہیں کھول رہا تھا بلکہ اپنے آپ کو ایک خاص زاویے پر لا رہا تھا جہاں سے مجھے دھرم چند پر اٹیک کرنا تھا۔ کیونکہ ریوالور اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اگر میرے سامنے بھارتی فوج کے جوان ہوتے تو مجھے مشکل پیش آ سکتی تھی۔ کیونکہ آرمی کے جوان کمانڈو نہ بھی ہوں تو بھی انہوں نے آرمی ٹریننگ سنٹر کی مار کھائی ہوتی ہے۔ ان پر قابو پانے کے لیے مجھے کوئی دوسری حکمت عملی سوچنی پڑتی۔ لیکن یہ انڈین انٹیلی جینس والے میرے ایسے ٹرینڈ آرمی کمانڈو کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ کہیں گھبراہٹ میں ریوالور کا فائر میری طرف نہ آ جائے۔

جب میں نے انہیں کہا تھا کہ میں خود ہی پتلون اتارے دیتا ہوں اور پتلون کی پٹی کو

جا گرا۔ وہ لوگ اناڑی تھے۔ انہوں نے یہ حماقت کی کہ وہ دونوں مجھ سے گتھم گتھا ہو گئے۔ انہوں نے کسی کو آواز نہیں دی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ان کے ساتھ کوئی تیسرا آدمی نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ مجھ سے گتھم گتھا ہوئے میں نے دونوں کی گردنیں اپنے بازوؤں کے آہنی شکنجے میں جکڑ لیں اور ایک خاص زاویے پر صرف تین جھٹکے دیے۔ میرا خیال ہے کہ میرے پہلے ہی جھٹکے میں ان کی گردنوں کے منکے ٹوٹ گئے تھے۔ ان کے جسم میری گرفت میں ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ وہ ریت کی بوریوں کی طرح نیچے گر پڑے۔ یہ حقیقت ہے کہ کمانڈو اپنے دشمن کو بھی یونہی نہیں مارتا۔ یہاں معاملہ ایسا تھا کہ اگر میں انہیں نہ مارتا تو انہوں نے مجھے مار دینا تھا۔ میں نے اپنے پیچھے دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ دونوں دشمن بڑی آسانی سے موت کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ میں اس طرف گیا جدھر ریوالور گرا تھا۔ میں نے جھک کر ریوالور اٹھا لیا۔ ریوالور کے آگے سیلنسر کی نالی لگی ہوئی تھی۔ میں نے میگزین کھول کر دیکھا۔ ریوالور بھرا ہوا تھا اور اس کا سیفٹی کیچ بھی کھلا ہوا تھا۔ یعنی صرف ذرا سا دبانے سے فائر ہو سکتا تھا۔ میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ آگے کر دیا اور ریوالور جیکٹ کی جیب میں رکھ کر باری باری دونوں لاشوں کو گھسیٹ کر مندر کی دیوار کے پاس اندھیرے میں ڈال دیا۔ مجھے اس کی فکر نہیں تھی کہ صبح جب دونوں کی لاشیں ملیں تو لوگ مجھے پکڑ لیں گے کیونکہ مجھے راتوں رات پر اسرار لڑکی کاویری کے ساتھ اس علاقے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لے دور نکل جانا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں جلدی سے مندر کی دیوار والے دروازے سے باہر نکل گیا۔ مجھے احساس تھا کہ ابھی آدھی رات نہیں ہوئی تھی لیکن دو آدمیوں کی لاشیں ڈھیر کرنے کے بعد میرا مندر میں رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ تالاب کے آس پاس رات کی تاریکی تھی۔ مجھے راستے کا علم تھا۔ میں چلتے چلتے جنگل کے شروع کے درختوں میں پہنچ گیا۔ کچھ فاصلے پر دو پرانی کھنڈر نما کوٹھڑی تھی جہاں کاویری نے مجھے آنے کے لیے کہا تھا۔ کوٹھڑی

تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ جنگل کی طرف سے دیودار اور مہاگنی کے درختوں اور دلدلوں میں اگی ہوئی گھاس کی مرطوب بو کسی وقت آجاتی تھی۔ میرا رخ تالاب کی طرف تھا۔ کیونکہ اسی طرف سے کاویری کو آنا تھا۔ اس طرف اونچے اونچے درخت تھے جن کے نیچے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہاں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی تھی جو اندھیرے میں گم تھی۔ میں اپنے طور پر حساب لگا رہا تھا کہ میں رات کے دس بجے مندر سے نکلا تھا۔ سی آئی ڈی والوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مجھے پندرہ بیس منٹ لگے ہوں گے۔ اس وقت ساڑھے دس یا پونے گیارہ کا ٹائم ہو گا۔

میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مچھر ضرور تنگ کر رہے تھے۔ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد دوبارہ چبوترے پر بیٹھ گیا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ رات آدھی گزر چکی ہے۔ پر اسرار لڑکی کاویری ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کہیں وہ کسی مشکل میں تو نہیں پھنس گئی۔ مجھے احساس تھا کہ وہ انتہائی مخدوش حالات میں سے نکل کر آنے والی ہے۔ ہو سکتا ہے عین وقت پر بدمعاش پجاری دیوگری نے اسے اپنے پاس بلالیا ہو۔ وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں کچھ بے چین سا ہوگیا۔ میں اٹھ کر ایک بار پھر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد درختوں کے نیچے جو پگڈنڈی یا ویران راستہ مندر کے تالاب کی طرف سے آتا تھا اس کو دیکھ لیتا تھا۔ وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ایک بار میری نظریں اس طرف گئیں تو مجھے کوئی چیز وہاں ہلتی ہوئی نظر نہیں آئی۔ میں رک کر غور سے دیکھنے لگا۔

ایک سایہ میری طرف آرہا تھا۔

سایہ تیزی سے قریب آرہا تھا۔ پھر اندھیرے میں مجھے کاویری آتی نظر آگئی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ اس نے ہاتھوں میں کپڑے میں لپیٹی ہوئی کوئی چیز سنبھال رکھی تھی۔ کہنے لگی۔

"ان شیطانوں سے نکل کر آنا بڑا مشکل تھا۔ چلو آگے نکل چلو۔"

وہ ڈھلان اتر کر کوٹھڑی کے کھنڈر کے پیچھے آگئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ پھر اس

بوتل نکالی، اس کا ڈھکن کھولا اور اس میں سے پانی کی طرح کی کوئی شے زمین پر اور اپنے اوپر چھڑکنے لگی۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کیا کر رہی ہو کاویری؟"

وہ بولی۔ "جتنی احیاط کر سکتی ہوں اتنی احتیاط کر رہی ہوں۔ اس میں ایک خاص جڑی بوٹی کا عرق ہے اس کی بو میرے جسم کی بو کو کسی حد تک ختم کر دے گی اور میرے پیچھے آنے والا سانپ بھٹک سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اس کی بو کتنی دیر تک رہے گی؟"

وہ بولی۔ "زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے تک میرے تعاقب میں آنے والے سانپ کو میری بو نہیں آئے گی۔ اتنی دیر میں ہم کوشش کریں گے کہ جتنی دور نکل سکتے ہیں نکل جائیں۔"

اس نے جڑی بوٹی کے عرق کی آدھی بوتل وہاں چھڑک دی۔ کہنے لگی۔

"یہاں ناگ مندر کی سرحد ختم ہوتی ہے۔ میں نے یہ حد پار کرلی ہے اور اس وقت اس تہہ خانے کی پٹاری میں بند کالے سانپ کو میرے فرار کا علم ہو گیا ہو گا اور وہ اپنے آپ پٹاری سے نکل کر میرے تعاقب میں چل پڑا ہو گا، اب ہمیں بہت تیز تیز چلنا ہو گا۔ کیونکہ سانپ کو یہاں آکر میری بو آنا بند ہو جائے گی۔ وہ دوسری طرف کو نکل کر میری بو پانے کی کوشش کرے گا۔ اس طرف بو نہیں آئے گی تو وہ دوسری طرف نکل جائے گا۔ ہمارے پاس صرف ایک گھنٹہ ہی ہے۔ اس کے بعد میری بو جنگل میں پھیل جائے گی اور ناگ مندر کا کوئی دوسرا سانپ پٹاری سے نکل کر میری تلاش میں چل پڑے گا۔ جلدی سے نکل چلو۔"

پر اسرار لڑکی کاویری لگتا تھا کہ جنگل سے پوری واقف تھی۔ وہ اندھیرے میں بھی جنگل میں بڑی آسانی سے راستہ دیکھ کر چلتی چلی جا رہی تھی۔ ہم جنگل کے اندھیرے میں جتنی تیز چل سکتے تھے چل رہے تھے۔ میں نے کاویری کو بالکل نہیں بتایا تھا کہ مندر میں

توڑی تھیں۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ دوسرے کمانڈو کبھی اپنے کارناموں کا ذکر بڑھ چڑھ کر نہیں کرتے۔ کمانڈو بہت سے راز اپنے سینوں میں دفن کر لیتے ہیں۔ جنگل ایک تو گھنا تھا' دوسرے اندھیری رات تھی۔ مگر کاویری مجھے جس راستے سے لے جا رہی تھی اس طرف اتنا جھاڑ جھنکاڑ نہیں تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم جنگل کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک جگہ کاویری سانس لینے کے لیے رک گئی۔ وہ جہاں زمین کے نیچے سے چھوٹے بڑے پتھر اور چٹانیں نکلی ہوئی تھیں وہاں بیٹھ گئیں۔ یہاں اس نے بوتل میں بچا ہوا جڑی بوٹی کا خاص پانی نکال کر زمین پر ایک طرف سے لے کر دوسری طرف چھڑکا دیا۔ کہنے لگی۔

"اگر میرا دشمن سانپ میرا تعاقب کرتا یہاں تک آ گیا تو یہاں ایک بار اسے میرے جسم کی بو نہیں ملے گی اور وہ رک جائے گا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"ابھی ہمیں کتنی دور تک چلنا ہو گا؟ کیا سنتھا ولی مٹھ اسی جنگل میں ہے؟"

کاویری نے کہا۔ "سنتھا ولی مٹھ کا جنگل یہاں سے کافی دور ہے۔ ابھی اس جنگل کے بعد ایک اور جنگل آئے گا۔ ہم کل سورج ڈوبنے کے بعد کسی وقت وہاں پہنچیں گے۔"

میں نے کاویری یعنی اس پر اسرار لڑکی سے بالکل نہ پوچھا کہ کیا وہ اتنی دور تک پیدل چل سکے گی۔ کیونکہ ابھی تک وہ جس انداز میں میرے ساتھ جنگل میں چل رہی تھی اس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ دبلی پتلی سی لڑکی بڑی سخت جان ہے اور یقیناً جنگلوں میں پیدل سفر کرنے اور مشکلیں برداشت کرنے کی عادی ہے۔ وہاں دس پندرہ منٹ بیٹھنے کے بعد ہم پھر سفر پر چل پڑے۔ عجیب اتفاق ہے کہ راستے میں ہمیں کوئی جنگلی درندہ نہ ملا۔ ایک مقام پر سے گزرتے ہوئے دور سے کسی شیر کی دو ایک بار دہاڑ ضرور سنائی دی تھی۔ اس وقت کاویری نے کہا تھا۔

"شیر نے کوئی شکار مارا ہے۔ مگر تم فکر نہ کرنا' شیر اس طرف نہیں آئے گا۔ اب وہ

پر لے جائے گا اور پھر خود سو جائے گا۔"

شیروں کے بارے میں میں نے رسالوں میں ہی کہانیاں پڑھی تھیں مگر لگتا تھا کہ اس پر اسرار لڑکی کو جنگلی درندوں کی عادات و خصائل کے بارے میں بھی کافی معلومات تھیں۔

میں نے اس سے پوچھا۔

"کاویری! تمہارا گھر کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے کہ دیوگری پجاری کے آدمی تمہیں کہاں سے پکڑ کر لائے تھے؟"

پر اسرار لڑکی کاویری نے چلتے چلتے کہا۔

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ پھر کبھی موقع ملا تو سناؤں گی۔ بس تم کو اتنا ہی بتائے دیتی ہوں کہ میرے ماتا پتا بچپن میں ہی سورگباش ہو گئے تھے۔ مجھے ایک ناگ مندر کے پجاری نے پالا تھا۔ یہ مندر مدھیہ پردیش کے سچال گڑھ کے جنگل میں تھا۔"

اتنا بتانے کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس وجہ سے وہ جنگل میں ایسی آسانی سے چل رہی ہے جس آسانی سے ہم لوگ شہر کی سڑکوں پر چلتے ہیں۔ بلکہ بعد میں مجھے جنگلوں کا جو تجربہ ہوا اس نے یہ ثابت کر دیا کہ شہر کی ٹریفک والی سڑکوں پر چلنا جتنا خطرناک اور جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے جنگلوں میں سفر کرنا اتنا خطرناک نہیں ہے۔ جنگلوں میں تو جنگلی جانور اکثر اوقات انسان کو آتا دیکھ کر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں جبکہ شہر کی سڑک پر اگر ٹرک سامنے سے آ جائے تو آپ کے اوپر چڑھ جائے گا۔ ہم کافی دیر تک چلتے رہے۔

جہاں درختوں کا گھنا پن ذرا کم ہوتا تھا تو آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے نظر آ جاتے تھے۔ ستاروں کی چمک سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ رات کا پچھلا پہر شروع ہو گیا ہے۔ ایک جگہ ہمیں ایک چشمہ ملا یہاں ہم نے پانی پیا۔ پانچ چھ منٹ بیٹھ کر آرام کیا اور دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ اگرچہ میں کبھی سخت جان کمانڈو رہ چکا تھا اور اسی کمانڈو ٹریننگ کی سخت جانی اب بھی میرے اندر موجود تھی لیکن جنگل میں پیدل چلتے چلتے میں بھی تھک گیا تھا مگر

رفتار اب ذرا سست ہو گئی تھی۔ راستے میں جہاں کہیں جنگل میں ہم کوئی موڑ گھومنے لگتے تو کاویری رک جاتی۔ پیچھے مڑ کر ہوا میں لمبے سانس کھینچ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کرتی۔ جب پہلی بار اس نے ایسا کیا تو میں نے پوچھا کہ وہ کیا سونگھ رہی ہے۔ وہ بولی۔

"میرا دشمن سانپ میری بو سونگھتا میرے پیچھے آ رہا ہے اور میں اس کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا اتنی دور سے اسے سانپ کی بو آ جاتی ہے؟"

اس نے کہا۔

"میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میرا باپ اور میری ماتا دونوں سپیرا سپیرن تھے۔ اگر میرا دشمن سانپ جو ساری رات میرے جسم پر رینگتا رہا تھا سینکڑوں میل سے میرے جسم کی بو سونگھ لیتا ہے تو میں دو تین میل سے اس کی بو ضرور سونگھ سکتی ہوں۔"

وہ چلتی جا رہی تھی اور باتیں کرتی جا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"سپیرے اور سپیرن میں ایسی ایسی شکتی یا جیسے تم لوگ اردو زبان میں طاقت کہتے ہو پیدا ہو جاتی ہے کہ عام لوگوں کو بالکل معلوم نہیں ہے۔ بھارت کے سپیرے اور سپیرنیاں بڑی پر اسرار شکتیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن یہ طاقت یا شکتی ہر سپیرے کے پاس نہیں ہوتی۔ اس کے لیے بڑے چلے کاٹنے پڑتے ہیں۔ سانپوں کے غاروں میں گھس کر ساری ساری رات تپسیا کرنی پڑتی ہے۔"

کاویری نے سامنے کی طرف سے آنے والی ہوا کو سونگھتے ہوئے کہا۔

"دریا قریب آ گیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے دریا کے پانی کی خوشبو آ گئی ہے۔ یہ تو ایک عام آدمی بھی اگر اس علاقے میں آتا جاتا رہا ہو تو بتا دے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا ہمیں دریا پار کرنا ہو گا؟"

"ہاں مگر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ اصل دریا نہیں ہے بلکہ دریا کی شاخ ہے جو

دریا سے نکل کر جنگل میں سے گزرتی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ہم دریا کی شاخ پر پہنچ گئے۔ یہ ایک بڑی نہر جتنی چوڑی تھی۔ یہاں آسمان کھلا ہونے کی وجہ سے ستاروں کی دھندلی روشنی میں دریا کا دوسرا کنارہ اور اس کے درخت بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے کاویری سے کہا۔

"مجھے تیرنا آتا ہے۔ کیا تم تیر سکتی ہو؟"

کاویری مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"تیرنا تو مجھے بھی آتا ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ میری ساڑھی بھیگ جائے۔"

"تو پھر دریا کیسے پار کریں گے۔ یہاں تو کوئی کشتی وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہی۔"

وہ بولی۔

"ہم ناؤ تیار کریں گے۔ جہاں جہاں سے درختوں کی کٹی ہوئی شاخیں ملیں انہیں یہاں لے آؤ۔"

وہ خود بھی درختوں کے نیچے جا کر شاخیں وغیرہ اٹھانے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہاں کافی کٹی ہوئی شاخیں ہم نے جمع کر لیں۔ کچھ ٹہنیاں میں نے درختوں سے توڑ لی تھیں۔ انہیں گٹھے کی شکل میں باندھا تو وہ ایک ناؤ سی بن گئی۔ ہم نے اسے دریا میں ڈال دیا اور خود اسی پر سوار ہو گئے۔ یوں ہم نے بڑے آرام سے دریا کی شاخ کا نسبتاً کم چوڑا پاٹ عبور کر لیا۔ ابھی رات کا پچھلا پہر شروع ہوا تھا اور کافی اندھیرا تھا۔ دریا کی شاخ کے دوسرے کنارے پر آ کر کاویری نے اپنی ساڑھی کو ٹھیک طرح سے باندھا اور دریا کے جس کنارے کی جانب سے ہم آئے تھے اس طرف منہ کر کے دو تین لمبے لمبے سانس لیے پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔

"ابھی تک مجھے دشمن سانپ کی بو نہیں آ رہی۔ معلوم ہوتا ہے اس نے میرے جسم کی بو کھو دی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی ہے۔"

وہ بولی۔ "لیکن تم سانپوں سے اور خاص طور پر ناگ دیوی کے مندر کے سانپوں سے

واقف نہیں ہو۔ میرا دشمن سانپ ضرور میرا پیچھا کر رہا ہو گا۔ اگر اس نے میری بو کھو بھی دی ہے تب بھی وہ میری بو کی تلاش میں ہو گا اور ہرگز واپس نہیں جائے گا۔"

وہ جنگل میں داخل ہونے سے پہلے درختوں کی طرف نظریں دوڑا رہی تھیں۔ میں خاموش اس کے پاس کھڑا تھا۔ کہنے لگی۔

"ہمیں اسی طرف چلنا ہو گا۔ میں اس جنگل میں دو بار پہلے بھی آ چکی ہوں۔ آ جاؤ میرے ساتھ۔"

جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا ہم اس طرف چل پڑے۔ میں تھک ضرور گیا تھا مگر راستے میں جو ہم کسی نہ کسی جگہ تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ کر آرام کر لیتے تھے اس سے کافی فرق پڑ جاتا تھا۔ ایک بار پھر ہم تاریک جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ اندھیرے میں ہمیں اتنا ضرور نظر آ جاتا تھا کہ ہم راستہ تلاش کر سکیں۔ راستے میں جھاڑیاں بہت زیادہ تھیں۔ ایک جگہ پہنچ کر کاویری رک گئی۔ وہ فضا میں کچھ سونگھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا دشمن سانپ کی بو آ رہی ہے؟"

وہ بولی۔ "نہیں۔ مجھے انسانوں کا خون پینے اور انسانوں کا گوشت کھانے والے آدم خور درختوں کی بو آ رہی ہے۔ ہمیں ادھر سے ہٹ کر دوسرے راستے سے چلنا ہو گا۔"

وہاں سے ہم نے راستہ تبدیل کر لیا۔ اس دبلی پتلی پراسرار لڑکی کا دم بڑا غنیمت تھا ورنہ اگر میں اکیلا ہوتا تو آدم خور درختوں کی خوراک بن جاتا۔ کاویری نے مجھے پہلے بھی ان درختوں کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ پھر بتانے لگی۔

"ہم سنتھاولی کی پہاڑیوں میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہاں جنگل میں آدم خور درختوں کی بہتات ہے۔"

میں نے کہا۔ "جب آدم خور درخت کی شاخیں انسان کو پکڑ کر اٹھاتی ہیں تو کیا آدمی اپنے آپ کو چھڑا نہیں لیتا؟ آدمی میں تو بڑی طاقت ہوتی ہے درخت کی شاخیں اس کے سامنے کیا چیز ہیں۔"

کاویری کہنے لگی۔

"بھگوان نے ان درختوں کو اپنی خوراک حاصل کرنے کے واسطے عجیب و غریب شکتی دے رکھی ہے۔ ان کی شاخوں پر چھوٹے چھوٹے بے شمار کانٹے ہوتے ہیں۔ جب یہ شاخیں نیچے سے گزرنے والے کسی انسان کو اٹھاتی ہیں تو یہ کانٹے فوراً انسان کے بدن میں چبھ جاتے ہیں اور ان کانٹوں سے ایسا زہر نکل کر انسان کے خون میں شامل ہو جاتا ہے جس سے انسان نیم بے ہوش ہو جاتا ہے اور اس کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "پھر بھی ایک طاقتور جوان آدمی ان شاخوں کو توڑ پھوڑ کر اپنا آپ چھڑوا سکتا ہے۔"

کاویری بولی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو لیکن حیرانی کی بات ہے کہ آج تک کوئی طاقتور سے طاقتور آدمی بھی ان درختوں کی شاخوں میں پھنسنے کے بعد زندہ نہیں بچ سکا۔ میں تمہیں ان درختوں کی نشانیاں بتا دوں گی تاکہ اگر تمہیں ان جنگلوں میں سے اکیلا گزرنا پڑے تو تم ان کا شکار نہ بن سکو۔"

ہمارے راستے میں بقول کاویری کے کوئی آدم خور درخت نہیں آیا تھا۔ ایک چھوتی سی ندی ضرور آئی، جس کے کنارے پر ذرا اونچائی پر کسی عمارت کا دھندلا سا خاکہ اندھیرے میں نظر آ رہا تھا۔ کاویری نے اس طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ہم یہاں باقی کی رات آرام کریں گے۔ دن نکلنے کے بعد آگے روانہ ہوں گے۔"

میں نے اس سے کہا کہ اس کا دشمن سانپ اس کے تعاقب میں ہو گا۔ اس لیے تمہیں یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ وہ اونچے ٹیلے کی طرف بڑھتے ہوئی بولی۔

"مجھے تین میل سے دشمن سانپ کی بو آ جائے گی اور میں اگر سو رہی ہوں گی تو یہ بو مجھے اٹھا دے گی۔ تم فکر نہ کرو۔"

ٹیلے پر اوپر جانے کے لیے ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ بولی۔

"یہ کسی زمانے میں اس علاقے کے راجہ کی آدھی باسی رانی کی مڑھی ہوا کرتی تھی۔ اب تو یہ ویران ہو گئی ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "آدھی باسی رانی سے کیا مطلب ہوا؟"

اس نے کہا۔ بھات کے ان جنگلوں میں سے جو جنگلی لوگ آباد ہیں ان کو آدھی باسی کہتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک روز راجہ شکار کھیلنے جنگل میں گیا تو اسے ایک آھی باسی لڑکی ملی جو بے حد خوبصورت تھی۔ راجہ نے اس سے شادی کر لی اور اپنے محل میں لے گیا۔ جب یہ رانی مر گئی تو راجہ نے جنگل میں اس ندی کے کنارے ٹیلے پر اس کی مڑھی بنا دی۔ رانی کو اسی جگہ جلایا گیا تھا اور اس کی ہڈیاں بھی اس مڑھی کے اندر دفن ہیں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ نہ راجہ رہا' نہ اس کی آدھی باسی رانی کی مڑھی رہی۔ اب یہاں صرف اس کا نشان ہی باقی ہے۔ جنگلی لوگ بھی ادھر آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہاں رات کو رانی کی بد روح پھرتی ہے۔"

یہ سن کر مجھے بھی تھوڑا سا ڈر لگا۔ آخر میں بھی انسان تھا اور بد روحوں بھوتوں سے ڈرنا انسانوں کی خصلت میں ہے۔ کاویری ٹبے کے اوپر مڑھی کے کھنڈر کے قریب آ کر رک گئی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟ فکر نہ کرو۔ جب تک تم میرے ساتھ ہو کوئی بد روح تمہیں کچھ نہیں کہے گی۔"

سامنے رات کی تاریکی میں ایک چاردیواری سی نظر آئی جس کی ایک دیوار ڈھے گئی تھی۔ ہم اس دیوار میں سے گزر کر صحن میں آ گئے۔ صحن چھوٹا تھا اور اس کے درمیان ایک چبوترے پر چھتری سے بنی ہوئی تھی۔ کاویری نے اس طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ آدھی باسی رانی کی مڑھی ہے۔ یہاں اسے چتا میں لٹا کر جلایا گیا تھا اور اسی جگہ اس کی مڑھی بنا دی گئی تھی۔"

سامنے ایک چوبارہ تھا۔ زینہ اوپر جاتا تھا۔ کاویری آگے آگے چل رہی تھی۔ دس بارہ سیڑھیاں چڑھ کر ہم ایک گیلری نما شہ نشین میں آ گئے۔ جس کے نیچے ہال کمرے کا فرش تھا۔ کاویری کہنے لگی۔

"ہم اس شہ نشین میں آرام کریں گے۔ میں اس طرف پڑ کر سو جاتی ہوں۔ تم

دوسری طرف لیٹ جاؤ۔ ہم ساری رات چلتے رہیں ہیں۔ ہمیں آرام کی سخت ضرورت ہے ورنہ کل کا دن ہم سفر نہ کر سکیں گے۔"

میں ذرا اوپر پرے ہٹ کر شہ نشین کے سخت فرش پر لیٹ گیا۔ کاویری بھی شہ نشین کی سنگی جالیوں کی طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔ مجھے تھکاوٹ کافی ہو رہی تھی مگر نیند کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ رانی کی بد روح کا خیال میرے دماغ میں گھس گیا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اگر میری آنکھ لگ گئی تو آدھی باسی رانی کی بد روح آ کر میری گردن دبا دے گی۔ ٹھیک ہے میں کمانڈو تھا' دلیر تھا' بے خوف تھا مگر یقین کریں کہ اس قسم کی آسیبی باتوں سے مجھے بچپن میں بھی بڑا ڈر لگا کرتا تھا۔ شاید کاویری بھی جاگ رہی تھی۔ مجھے اس کے دو ایک بار گہرے سانس بھرنے کی آواز آئی تھی۔ مگر میں نے اسے بلانا مناسب خیال نہ کیا۔ باہر جنگل میں چاروں طرف سناٹا طاری تھا۔ میرا خیال ہے کہ رت کے تین بجے کا ٹائم ہو گا۔ مجھے یہ خیال بھی پریشان کر رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کاویری سو جائے اور سوتے میں اسے دشمن سانپ کی بو نہ آئے اور سانپ یہاں آ کر اس کے ساتھ مجھے بھی ڈس لے۔

میں چاہتا تھا کہ جاگتا رہوں اور اگر سانپ وہاں آئے تو اسے فوراً ہلاک کر ڈالوں۔ میں نے لیٹے لیٹے جرسی کی جیب میں سے ریوالور نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ دیوار کے پرانے طرز کے روشندان کے شگافوں میں سے رات کے پچھلے پہر کے نیلے اجالے کا ہلکا ہلکا نور چھلکنے لگا تھا۔ میں نے کاویری کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ میرے پاس ریوالور بھی ہے۔ اس کے ساتھ پھر مجھے اسے یہ بھی بتانا پڑتا کہ میں نے انٹیلی جینس کے دو آدمیوں کی گردنیں توڑی تھیں۔ جب تک اسے خود معلوم نہیں ہو جاتا کہ میرے پاس ریوالور ہے' میں یہ بات اس سے پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے ہمیں لیٹے مشکل سے دس پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اچانک جنگل کی رات کی خاموش فضا گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھی۔ میں ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ ایسے لگا جیسے چھ سات گھوڑے نیچے کھنڈر کے بڑے کمرے میں کسی طرف سے آن داخل ہوئے ہیں۔

کاویری بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"یہ آواز کیسی تھی؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"نیچے ہال کمرے میں کچھ گھڑ سوار آئے ہیں۔

ہم نے پتھر کی جالیوں میں سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ اب نیچے سے آدمیوں کے اونچی اونچی بولنے اور قہقہے لگانے اور گھوڑوں کے بدکنے کی آوازیں آنے لگی تھی۔ اندھیرے میں ہمیں آدمیوں اور گھوڑوں کے خاکے دکھائی دیے۔ کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"ابے او' ہری داس! لالٹین روشن کر اور دارو کی بوتلیں کھول دے۔"

باری باری تین لالٹینیں روشن ہو گئیں۔ ان کی روشنی میں ہم نے رنگ برنگی پگڑیوں اور تنگ پاجاموں والے چھ سات آدمیوں کو دیکھا جو گھوڑوں کو ایک طرف باندھ رہے تھے۔ درمیان میں ایک جگہ چارپائی ڈال دی گئی تھی جس پر ایک پھولی ہوئی مونچھوں والا کالا بھجنگ آدمی ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر نیم دراز تھا اور ایک ملازم اس کے کاندھے دبا رہا تھا۔ باقی کے آدمی بھی اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گئے۔ شراب کی بوتلیں کھل گئیں۔ ان کے پاس لمبی لمبی بندوقیں تھیں۔ ہم یہ سارا منظر گیلری میں پتھر کی جالیوں کے ساتھ لگے دیکھ رہے تھے۔ کاویری نے سرگوشی میں کہا۔

"یہ لوگ ڈاکو ہیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا تو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ہم پیچھے کو کھسکے تو میرا پاؤں ایک پتھر پر آ گیا۔ پتھر لڑھکا تو آواز پیدا ہوئی۔ نیچے سے کسی نے کرخت آواز میں کہا۔

"کیوں بے؟ اوپر کون ہے؟ ارے ہریا' جا کر پتہ کر بے۔ اوپر رانی کی بدروح ہو تو اسے پکڑ کر نیچے لے آ۔ آج اس کے ہاتھ سے دارو پئیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی مجھے تین چار آدمیوں کے دوڑ کر گیلری والی سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ کاویری نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پیچھے کر دیا اور سرگوشی میں کہا۔

"خبردار! یہاں سے نہ ہلنا۔ چھپ کر بیٹھے رہو۔ آواز تک نہ نکالنا۔ میں ان کو سنبھال لوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ خود ہی سیڑھیوں کی طرف گئی۔ ڈاکو ابھی آدھی سیڑھیوں میں تھے کاویری نے ان کے سامنے جا کر کہا۔

"تم اوپر آنے کا کشٹ کیوں اٹھاتے ہو۔ میں خود تمہارے پاس آ گئی ہوں۔ چلو مجھے سردار کے پاس لے چلو۔"

میں گیلری میں ہی ایک طرف چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ مجھے نیچے سیڑھیوں میں ڈاکوؤں کے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ ان میں سے کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"ارے دھنیا! ارے رانی کی بدروح ایسی ہوتی ہے رے۔ ارے اسے لے چلو سردار کے پاس۔"

میں نے بیٹھے بیٹھے پتھر کی جالی میں سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ لالٹینوں کی روشنی میں تین ڈاکو کاویری کو پکڑے اندر داخل ہوئے۔ سردار اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک ڈاکو بولا۔

"سردار! رانی کی بدروح جون بدل کر آ گئی ہے۔"۔

ڈاکوؤں کے سردار نے کاویری کو دیکھ کر کہا۔

"ارے واہ واہ رے دھنیا! ارے واہ رے ہریا! ارے اس رانی کو ہمارے پاس لاؤ۔"

ڈاکوؤں نے کاویری کو دھکا دے کر سردار کی آغوش میں گرا دیا۔ سردار نے کاویری کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"رانی بائی! آج تو دھن راج ڈاکو کے دربار میں آئی ہے۔ پہلے ہمیں دارو پلا۔ ارے ہریا! اسے بوتل دے دے۔"

میں نے ریوالور پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں اوپر گیلری کے مورچے میں سے کتنے ڈاکوؤں کو مار سکتا تھا اور پھر کاویری ان کے قبضے میں تھی۔ وہ آسانی سے اسے ہلاک کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان سارے ڈاکوؤں کے پاس بندوقیں تھیں۔ وہ مجھے گھیرے میں لے کر بے بس کر سکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ

کاویری نے ہاتھ اونچا کر کے سردار سے کہا۔

"سردار! کیا تو دھن راج ڈاکو ہے؟"

سردار نے ہنس کر کہا۔

"ارے تو میں تمہیں کیا آدھی باسی لگتا ہوں۔ یہ بتا کہ تو رانی کی بد روح ہے یا کوئی اور ہے؟"

کاویری نے کہا۔ "سردار! میں رانی کی بد روح نہیں ہوں۔ آدھی باسی مچھیرے کی بیٹی ہوں۔ جنگل میں لکڑیاں چننے آئی تھی۔ راستے میں رات ہو گئی شیر باگھ کے ڈر سے اس مڑھی میں لیٹ گئی کہ رات گزر جائے تو گھر واپس جاؤں گی۔"

سب ڈاکو قہقہے لگا کر ہنس پڑے۔ سردار نے کہا۔

"اری آج تو ہماری رانی ہے۔ چل پہلے شراب پلا۔ اس کے بعد تجھ سے دو دو باتیں ہوں گی۔"

کاویری کمال جرأت اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"سردار! میری بڑی خواہش تھی کہ کبھی دھن راج ڈاکو کے درشن ہوں۔ میرے دھن بھاگ ہیں کہ تمہارے درشن ہو گئے۔ میں خود تمہیں اپنے ہاتھ سے شراب پلاؤں گی۔"

کاویری نے ایک ڈاکو کے ہاتھ سے بوتل لے لی۔ پھر ایک گلاس میں شراب ڈال کر سردار کو دی۔ سردار نے مسکراتے ہوئے گلاس لے لیا اور بولا۔

"اری واہ ری رانی! تو نے تو کمال کر دیا ہے۔"

سب ڈاکو بولے۔

"ہمیں بھی اپنے ہاتھ سے شراب دو۔ ہم بھی رانی کے ہاتھ سے شراب پئیں گے۔"

اور کاویری سب کے گلاسوں میں شراب ڈالنے لگی۔ کاویری سب ڈاکوؤں کو گلاسوں میں شراب ڈال ڈال کر پلا رہی تھی۔ ڈاکو جھوم رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔ سردار نے کاویری کو بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا اور بولا۔

"اری رانی! تو بھی پی۔ یہ لے۔"

کاویری نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"سردار میں دارو نہیں پیتی۔"

سردار نے غصے کے ساتھ کہا۔

"نہیں پیتی تو دھن راج کے ساتھ آج تو بھی پیئے گی۔ دیکھتا ہوں کیسے نہیں پیتی؟"

کاویری فوراً راضی ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"اچھا سردار! میں بھی دارو پیتی ہوں مگر تمہاری خاطر صرف ایک گھونٹ پیوں گی۔"

سردار نے بلند قہقہہ لگایا۔

"اری ایک گھونٹ ہی سہی۔ یہ لے۔ پی جا۔"

میں کاویری کو مسلسل دیکھ رہا تھا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ وہاں ابھی ایسی صورت حال پیدا نہیں ہوئی تھی کہ فائر کرنے کی نوبت آتی۔ سردار نے اپنا گلاس کاویری کی طرف بڑھایا۔ کاویری نے شراب کا گلاس اپنے ہونٹوں کے ساتھ ایک دو سیکنڈ تک لگائے رکھا پھر گلاس سردار کو واپس کر دیا۔ تمام ڈاکو خوشی سے اچھل پڑے اور ایک ساتھ نعرہ لگا کر بولے۔

"رانی ہمیں بھی اپنی جوٹھی شراب پلائے گی۔؟"

میں بڑا حیران ہوا کاویری نے کوئی اعتراض نہ کیا اور بولی۔

"میں تم سب کو اپنی جوٹھی شراب پلاؤں گی۔"

ڈاکوؤں نے اپنے اپنے گلاس بلند کر دیے۔ کاویری بوتل لے کر ہر ایک ڈاکو کے پاس جاتی۔ گلاس میں شراب ڈالتی۔ گلاس کو اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگا کر اوپر کو اٹھاتی۔ جیسے شراب کا گھونٹ بھر رہی ہو اور گلاس ڈاکو کو واپس کر دیتی۔ ڈاکو فوراً شراب پی جاتا۔ سردار کو اس نے دوسری بار بھی اپنی جوٹھی شراب پلائی۔ سردار نے نعرہ لگایا۔۔

"رانی! ہمیں ڈانس کر کے دکھاؤ۔"

میں نے دیکھا کہ کاویری نے فوراً سردار کا حکم مان لیا اور آہستہ آہستہ رقص کرنے

لگی۔ وہ سانپ کا رقص کر رہی تھی۔ جس طرح بین کی آواز پر سانپ جھومتا ہے کاویری اسی طرح اپنے جسم کو لہرا رہی تھی۔ سردار اور ڈاکو تو خوشی سے اچھل اچھل کر داد دینے لگے۔

اب اچانک ایسا ہوا کہ پہلے ایک ڈاکو مدہوش ہو کر جہاں بیٹھا تھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا پھر تیسرا اور پھر چوتھا ڈاکو ڈھیر ہو گیا۔ سردار نے چیخ کر کہا۔

"ارے تم لوگ اتنی جلدی کیسے دھت ہو گئے؟"

سردار اپنے ساتھیوں کو گالیاں دینے لگا۔ کاویری نے رقص کرنا بند کر دیا تھا۔ وہ سردار کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ سردار نے گلاس بلند کرتے ہوئے کہا۔

"اری میری طرف کیا دیکھ رہی ہے۔ لا۔ اس میں اور شراب ڈال۔"

اس کے ساتھ ہی سردار کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر گر پڑا اور وہ بھی چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ میں یہی سمجھا کہ ان لوگوں کو شراب کا نشہ چڑھ گیا ہے۔ جب سارے ڈاکو سردار سمیت نشے میں بے سدھ ہو گئے تو کاویری دوڑ کر ہال کمرے سے نکل گئی اور سیڑھیاں چڑھ کر میرے پاس آ کر بولی۔

"کرم داد! ہمیں اب یہاں سے نکل چلنا چاہیے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ اتنی جلدی کیسے نشے میں دھت ہو گئے؟"

وہ بولی۔

"انہیں میں نے بے ہوش کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے بعد انہیں ہوش آ جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "تم نے بے ہوش کیا ہے؟"

"ہاں۔ کاویری سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔"

اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ آسمان پر صبح کاذب کا نیلا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ باہر آ کر وہ مڑھی کے صحن کی طرف مڑ گئی۔ کہنے لگی۔

"ہم آگے گھوڑوں پر سفر کریں گے۔"

صحن میں ڈاکوؤں کے چھ سات گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ کاویری نے دو گھوڑے بندھے رہنے دیئے، باقی سارے گھوڑے کھول کر انہیں مڑھی کے صحن سے باہر بھگا دیا۔ گھوڑے صحن سے نکلتے ہی جنگل میں ایک طرف دوڑ پڑے۔ کاویری ایک گھوڑے پر اور میں دوسرے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ راستے میں میں نے کاویری سے پوچھا۔

"تم نے ان ڈاکوؤں کو بے ہوش کیسے کیا تھا؟"

کہنے لگی۔ "اس جنگل سے نکلنے کے بعد بتاؤں گی۔"

ہمارے گھوڑے قدم قدم نہیں بلکہ دلکی چال چل رہے تھے جس کی وجہ سے راستہ جلدی طے ہو رہا تھا۔ جنگل میں صبح کی سفیدی پھیل رہی تھی۔ ہم جنگل کے جس علاقے سے گزر رہے تھے وہاں اتنے گنجان درخت نہیں تھے۔ آگے جا کر کاویری نے اپنے گھوڑے کو ایک ٹیلے کی طرف موڑ لیا۔ میرا گھوڑا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم اسی طرح گھوڑوں پر سفر کرتے چھوٹے چھوٹے کئی ٹیلوں میں سے گزرے۔ ایک جگہ کھلی وادی آ گئی۔ یہ سارا علاقہ جنگل کا تھا اور کہیں کوئی آبادی نہیں تھی۔ کہیں کہیں جنگلی لوگوں کی دو چار جھونپڑیاں دور سے نظر آ جاتی تھیں۔ سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ ہمیں سفر کرتے کافی وقت گزر گیا تھا۔

راستے میں دو تین ندیاں بھی ہم نے گھوڑوں پر بیٹھے بیٹھے عبور کی تھیں۔ ایک ندی آئی تو کاویری نے اس کے کنارے کے ساتھ گھوڑا ڈال دیا۔ ندی کوئی چھ سات میل آگے جا کر دائیں جانب جنگل میں مڑ گئی۔ کاویری نے گھوڑا روک لیا۔ میں نے بھی گھوڑے کی باگ کھینچ لی۔ وہ کہنے لگی۔

"یہاں سے سنتھا ولی کا جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ اگر ہم پیدل سفر کرتے تو ہم شام کو سنتھا ولی مٹھ پہنچتے۔ لیکن گھوڑوں پر سفر کرنے کی وجہ سے اب ہم شام ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ لیکن ہمیں آگے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہو گی۔ کیونکہ سنتھا

ولی مٹھ کے پہرے دار سانپ آس پاس کے جنگل میں پھر رہے ہوں گے۔"

اس کے بعد کاویری نے منہ پیچھے کی طرف کر کے دو تین گہرے سانس لیے اور مسکرا کر کہنے لگی۔"

"جڑی بوٹیوں کے خاص عرق کی وجہ سے میرا دشمن سانپ لگتا ہے بھٹک گیا ہے۔ اسے ابھی تک میرا سراغ نہیں مل سکا۔ مجھے اس کی بو نہیں آ رہی۔ کم از کم تین چار میل پیچھے وہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"سنتھا ولی مٹھ کے پہرے دار سانپوں سے کس طرح بچیں گے؟ وہ تو ہمارے گھوڑوں پر بھی حملہ کر دیں گے؟"

کاویری کہنے لگی۔

"ہم پہرے داروں کی سرحد شروع ہونے سے پہلے گھوڑے چھوڑ دیں گے اور وہاں سے ایک خفیہ راستے سے سنتھا ولی مٹھ کی طرف جائیں گے۔"

ہم ندی کے ساتھ ہی گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔

اب ہمارے گھوڑے قدم قدم چل رہے تھے۔ درختوں کی شاخیں جہاں نیچے تک جھکی ہوئی ہوتیں وہاں ہمیں جھک کر نکلنا پڑتا تھا۔ یہ کافی گھنا جنگل تھا۔ مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی اور بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کاویری سے کہا۔

"کاویری! کیا تمہیں بھوک پیاس نہیں لگتی؟"

وہ بولی۔ "کیوں نہیں لگتی فکر نہ کرو۔ آگے جنگلی پھلوں کا ایک ذخیرہ آتا ہے۔ ہم وہاں کچھ کھا پی بھی لیں گے اور آرام بھی کریں گے۔"

جنگلی پھلوں کا یہ ذخیرہ ایک گھنٹہ جنگل میں سفر کرنے کے بعد آیا۔ ہم گھوڑوں سے اتر گئے۔ یہاں کیلوں اور جنگلی بیروں کے بے شمار درخت تھے۔ کاویری ندی سے ذرا ہٹ کر گھاس پر بیٹھ گئی۔ گھوڑوں کو ہم نے کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ بھی گھاس اور ندی کے پانی سے پیٹ بھر لیں۔ میں کچھ بیر اور جنگلی کیلوں کا ایک گچھا توڑ کر لے آیا۔ ہم دونوں کیلے اور بیر کھانے لگے۔ میں نے کاویری سے پوچھا۔

"اب مجھے بتاؤ کاویری کہ تم نے ڈاکوؤں کو بے ہوش کیسے کیا تھا؟"

وہ کہنے لگی۔

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرا جنم سپیروں کے گھر میں ہوا تھا۔ میرے ماتا پتا سپیرے اور سپیرن تھے۔ وہ جب سورگباش ہو گئے تو مجھے ایک ناگ مندر کے پجاری نے پال پوس کر بڑا کیا۔ شروع سے ہی سانپوں کے ساتھ میری بڑی دوستی رہی ہے۔ کئی بار سانپوں نے مجھے کاٹا مگر پجاری جی نے دوائی پلا کر مجھے اچھا کر دیا۔ میں جوان ہوئی تو ایک ناگ مندر کی ناگ داسی بنا دی گئی۔ وہاں مہینے میں ایک بار ناگ اتسو یعنی ناگ میلا لگتا تھا جس میں ہر ناگ داسی کو سانپ سے ڈسوایا جاتا تھا مگر ڈسوانے سے پہلے ہمیں ایک خاص قسم کی دوائی پلا دی جاتی تھی جس سے ہم پر زہر کا پورا اثر نہیں ہوتا تھا۔ ہر ماہ سانپ سے ڈسوانے کے بعد میرے جسم میں سانپ کے زہر کا تھوڑا بہت اثر آ گیا ہے۔ اب ایسا ہوتا ہے کہ جب میں چاہوں اپنے جسم کے زہر کو اپنی زبان پر لے آتی ہوں۔ تب اگر میں کسی کو اپنا جھوٹا پانی پلا دوں تو اس کے جسم میں زہر کا اثر داخل ہو جاتا ہے اور وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ وہ مرے گا نہیں لیکن کچھ دیر کے لیے بے ہوش ضرور رہے گا۔ میں نے ان ڈاکوؤں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا۔ جب انہوں نے مجھے کہا کہ میں انہیں اپنی جھوٹی شراب پلاؤں تو اچانک مجھے خیال آ گیا کہ کیوں نہ میں انہیں اپنے زہر سے بے ہوش کر دوں۔ چنانچہ میں نے جب شراب کے گلاس کو اپنے منہ سے لگایا تو ظاہر یہ کیا جیسے میں شراب پی رہی ہوں۔

مگر میں نے شراب کا ایک قطرہ بھی نہیں پیا۔ بلکہ اپنی زبان پر لایا ہوا زہر شراب میں داخل کر دیا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے سارے ڈاکو بے ہوش ہو گئے۔"

میں بڑی حیرانی اور تعجب کے ساتھ کاویری کی باتیں سن رہا تھا۔ اس قسم کی باتیں میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ اس قسم کی عورت بھی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کسی وقت مجھے محسوس ہوتا کہ میں الف لیلیٰ کی دنیا میں نکل آیا ہوں اور میرے ساتھ وہی

کچھ ہو رہا ہے جو پرانی داستانوں میں سفر پر نکلے ہوئے مسافروں اور شہزادوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

ہم نے سیر ہو کر جنگلی پھل کھایا۔ ندی پر جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا۔ اس دوران ہمارے گھوڑے بھی گھاس وغیرہ کھا کر اور پانی پی کر تازہ دم ہو چکے تھے۔ کاویری نے اپنے سر کے بال بھی ندی میں دھوئے۔ انہیں اسی طرح نچوڑ کر اس نے سر کے پیچھے جوڑا بنا لیا۔ کہنے لگی۔

"میری ساڑھی میلی ہو گئی ہے مگر میرے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہیں ہے۔"

اچانک وہ باتیں کرتی کرتی رک گئی۔

اس نے اپنا چہرہ اس طرف پھیر لیا جس طرف سے ہم چل کر آئے تھے۔ ایک دو لمبے لمبے سانس لینے کے بعد وہ پریشان سی ہو کر بولی۔

"مجھے میرے دشمن سانپ کی بو آ رہی ہے۔"

وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لگتا ہے اس نے میری بو کا سراغ لگا لیا ہے۔ مگر ابھی وہ مجھ سے کافی دور ہے۔ ہمیں اتنی دیر میں یہاں سے جتنی دور نکل سکتے ہیں نکل جانا چاہیے۔"

ہم گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور گھوڑوں کو ندی کے ساتھ ساتھ جنگل کے راستے پر ڈال دیا۔

کاویری کے اس انکشاف سے کہ اس کے دشمن سانپ نے اسی کے جسم کی بو پا لی ہے اور وہ اس کے تعاقب میں چلا آ رہا ہے۔) مجھے بھی پریشان کر دیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں میں بھی کاویری کے ساتھ ہی نہ مارا جاؤں۔ مجھے ابھی مرنا نہیں تھا۔ زندہ رہنا تھا اور اپنی بیوی جمیلہ کو اس جھنجھٹ سے نکال کر پاکستان لے جانا تھا۔

ندی کے کنارے پر درخت نہیں تھے۔ کاویری گھوڑے کو تیز دوڑا رہی تھی۔ میرا گھوڑا بھی اس کے پیچھے پیچھے تیز دوڑنے لگا تھا۔ کاویری واقعی دشمن سانپ کی بو سونگھ کر گھبرا گئی تھی۔ جتنا تیز وہ گھوڑے کو دوڑا رہی تھی اتنا تیز اس نے سارا رستہ گھوڑے کو

نہیں دوڑایا تھا۔ کافی آگے جا کر ندی جنگل میں بائیں طرف گھوم گئی۔ یہاں کاویری نے ندی کا کنارہ چھوڑ دیا اور ایک پہاڑی کی طرف روانہ ہو گئی۔ گنجان درخت دور دور ہو گئے تھے۔ زمین ایسی تھی کہ کہیں اونچی ہو جاتی اور کہیں نشیب آ جاتا۔ ساری زمین جنگلی جھاڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس وقت آسمان پر بادل آنا شروع ہو گئے تھے۔ سورج کے آگے بادلوں کا کوئی ٹکڑا آ جاتا تو دھوپ غائب ہو جاتی اور ہر طرف سایہ سا چھا جاتا۔ ہم پہاڑی کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ کاویری نے گھوڑے کو پہاڑی پر ڈال دیا۔ پہاڑی کی ڈھلان پر گھوڑے قدم قدم چلنے لگے۔ میں نے کاویری کو آواز دے کر کہا۔

"اس پہاڑی کی دوسری طرف کیا ہے۔"

اس نے بلند آوز میں جواب دیا۔

"تم خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

میں نے اس کے بعد کوئی بات نہ کی۔ پہاڑی کی چڑھائی پر جگہ جگہ پتھر اور جھاڑیاں تھیں۔ گھوڑے ان کے درمیان بڑے سنبھل سنبھل کر چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ ہم پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ کاویری نے اپنے گھوڑے کو پہاڑی کی دوسری طرف نشیب میں ڈال دیا۔

پہاڑی کی اترائی اترنا زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ اترائی اتنی سیدھی نہیں تھی مگر اتنی آسان بھی نہیں تھی۔ ہم پہاڑی پر سے اتر آئے۔ آگے ایک کھائی تھی۔ کاویری نے کھائی میں گھوڑے کو ڈال دیا اور میری طرف گھوم کر کہا۔

"ہوشیار رہنا تھوڑی دیر میں سنتھا ولی مٹھ کے جنگل کی سرحد شروع ہونے والی ہے۔"

میں صرف اس طرح ہوشیار رہ سکتا تھا کہ سنتھا ولی مٹھ کے جنگل کی سرحد میں داخل ہوتے ہی اپنی ٹانگیں اوپر کر لوں تاکہ مٹھ کے زہریلے پہرے دار سانپوں سے محفوظ رہ سکوں۔ لیکن سانپ گھوڑوں کو بھی ڈس سکتے تھے۔ میں نے پاؤں اوپر تو نہیں کیے تھے لیکن گھوڑے پر بیٹھا جھاڑیوں میں دونوں جانب نظر رکھے ہوئے تھا۔ لیکن سانپ آخر سانپ

ہوتا ہے اور پھر کاویری نے بتایا تھا کہ سنتھا ولی مٹھ کے محافظ سانپ زمین سے اوپر کو اڑ کر حملہ کرتے ہیں اور درختوں پر سے بھی حملہ آور ہوتے ہیں۔ میری قسمت نے مجھے ایسے حالات میں پھنسا دیا تھا جن کا مجھے پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا اور دھوپ کے غائب ہونے سے دن کی روشنی کم ہوگئی تھی۔ کاویری کو دہرا خطرہ تھا۔ ایک تو اس کے پیچھے اس کا دشمن سانپ لگا ہوا تھا دوسرے سنتھا ولی مٹھ کے محافظ سانپوں کا خطرہ تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ واقعی بڑی دلیر لڑکی تھی۔ گھوڑے پر بیٹھی اس کی باگیں تھامے ایک مہارانی کی طرح لگ رہی تھی۔

ہم پہاڑی کے دامن میں آگئے۔ یہاں ایک جگہ سیاہ رنگ کا کھیت تھا۔ کاویری نے گھوڑے کو روک لیا اور بولی۔

”یہ بڑی خطرناک دلدل ہے گھوڑے کو میرے پیچھے رکھنا۔“

دلدلیں میں نے مشرقی پاکستان کی جنگل میں بھی دیکھی تھیں مگر اتنی سیاہ دلدل میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ دلدل میں سے بخارات اٹھ رہے تھے اور وہ غیر محسوس طور پر اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ میرے خدا! قدرت کے راز قدرت کو ہی معلوم ہیں۔ ان بھیانک دلدلوں کا کیا مصرف ہے؟ کیا فائدہ ہے؟ یہ صرف قدرت ہی جانتی تھی۔ دلدل سے آگے بانس کے جھنڈ شروع ہوگئے۔ اس کے بعد ایک ندی آگئی۔ ہم نے گھوڑے ندی میں ڈال دیے۔ ندی کے دوسرے کنارے پر لے جا کر کاویری نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پھر دو تین لمبے لمبے سانس لیے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ دشمن سانپ کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

”دشمن سانپ کی بو غائب ہوگئی ہے۔“

میں نے کہا۔

”چلو ایک دشمن سے تو جان چھوٹی۔“

وہ کہنے لگی۔ ”یہ دشمن سانپ میرا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہے۔ وہ یا مجھے مارے گا یا خود مر جائے گا۔ یہ اس کی ایک چال ہے۔ قدرت نے ان سانپوں کو بڑی عقل دی ہے۔

وہ مجھے دھوکے میں ڈال کر جنگل میں تین چار میل دوسری جانب ہٹ گیا ہے اور ممکن ہے آگے سے آکر حملہ کردے۔ اگر وہ آگے سے آگیا تو مجھے اس کی بو نہیں آسکے گی۔ کیونکہ جنگل میں ہوا پیچھے سے آگے کی طرف چل رہی ہے۔’

میں خود بھی اس بک بک سے تنگ آگیا تھا۔ مگر مجبور تھا۔ میں نے کسی قدر بیزاری سے کہا۔

”تو پھر میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔“

کاویری نے میری طرف گھور کر دیکھا۔

”کیا تم مذاق اڑا رہے ہو؟ ہم بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ کیا تم اپنی بیوی کو لیے بغیر یہاں سے بھاگنا چاہتے ہو؟ میں عورت ہو کر نہیں گھبرا رہی اور تم مرد ہو کر ڈر رہے ہو۔“

میں نے فوراً" معذرت کا لہجہ اختیار کر لیا۔

”نہیں نہیں کاویری میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہم یہاں سے کسی دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔“

کاویری نے کوئی جواب نہ دیا اور گھوڑا آگے کی طرف چلا دیا۔ مجھے اپنے رویے پر بڑی ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ بانس کا جنگل ختم ہوا تو کاویری رک گئی۔ سامنے کچھ فاصلے پر اونچے اونچے ناریل تاڑ اور دیودار کے درختوں کے جھنڈ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ کاویری ان درختوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”وہاں سے سنتھا ولی مٹھ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔“

میں نے ان درختوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا سنتھا ولی مٹھ ان درختوں کے اندر ہے؟“

وہ بولی۔ ”ہاں۔“

وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بالکل ساکت ہو کر بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں سنتھا ولی مٹھ کے درختوں کے جھنڈوں پر لگی ہوئی تھیں۔ جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ کہنے لگی۔

"ہم ایک خفیہ راستے سے سنتھا ولی مٹھ میں داخل ہوں گے۔"

"کیا یہ خفیہ راستہ پہرے دار سانپوں سے محفوظ ہو گا۔"

"کسی حد تک محفوظ ہو گا۔ لیکن ہمیں چوکس رہنا پڑے گا۔ چلے آؤ۔"

اور ہم نے گھوڑوں کو دور نظر آنے والے درختوں کے جھنڈوں کی طرف بڑھا دیا۔

آپ ضرور سوچتے ہوں گے کہ میں کیسی ناقابل یقین قسم کی داستان سنا رہا ہوں۔ مگر یقین کریں انڈیا کے جنگلوں میں اس سے بھی زیادہ ناقابل یقین واقعات ان ناگ مندروں میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ بعد میں تجربات نے ثابت کر دیا کہ جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا وہ آنے والے حیران کن واقعات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں کسی طلسمی ہیرے یا کسی خفیہ خزانے کی تلاش میں یہ مصیبتیں نہیں اٹھا رہا تھا۔ میں تو صرف اپنی بیوی کو واپس لانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا کر اس موت کے سفر پر نکلا ہوا تھا۔

سنتھا ولی مٹھ کے سرحدی درختوں کے جھنڈ قریب آ گئے تھے۔ یہاں جنگلی لوگوں کی بھی آبادی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ ہم ایک پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے۔ بادل گھرے ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی وقت بھی بارش شروع ہو جائے گا۔ یہ پگڈنڈی درختوں کے جھنڈوں میں داخل ہوئی تو اچانک ایک زبردست پھنکار کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ سانپ آ گئے ہیں۔ پھنکار کی آواز پر گھوڑے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ کاویری میرے قریب آ گئی تھی۔ اس نے گھوڑے کی باگ کو کھینچ لیا۔ میرا گھوڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سامنے پگڈنڈی کے عین درمیان ایک سرخ اور سبز رنگ کا بہت بڑا سانپ زمین سے پانچ فٹ اوپر اٹھ کر پھن پھیلائے کھڑا تھا۔ کاویری اسے گھور کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر گھوڑا ڈر کر بار بار پاؤں اوپر اٹھا رہا تھا۔ میں نے جیب سے ریوالور نکال کر سانپ کے سر کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ چونکہ ریوالور کے آگے شائی سلینسر چڑھا ہوا تھا اس لیے دھماکے کی

آواز نہ آئی۔ مگر فائر کی آواز ضرور آئی۔ میرا نشانہ کمانڈو ٹریننگ کے دوران میں سب سے اچھا ہوا کرتا تھا۔ ریوالور سے نکلی ہوئی گولی نے سانپ کے سر کے پرخچے اڑا دیے۔

کاویری نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"یہ پستول تمہارے پاس کہاں سے آگیا؟"

میں نے کہا۔ "میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔ رانی کی مڑھی میں ایک بے ہوش ڈاکو کے پاس پڑا تھا۔ میں نے اٹھالیا۔ اس وقت یہ ریوالور بڑے کام آیا ہے۔"

کاویری بولی۔ "ہاں واقعی تم ٹھیک کہتے ہو۔ ورنہ یہ بڑا سانپ ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑتا۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ وہی دشمن سانپ تھا جو اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"نہیں جو سانپ میرا تعاقب کر رہا ہے اس کا رنگ سیاہ ہے اور اس کی گردن پر سرخ دھاریاں ہیں۔ تم بھی یاد رکھنا اگر تمہیں ایسا سانپ نظر پڑے تو اسے اسی طرح فوراً ہلاک کر دینا جس طرح تم نے اس سانپ کو مارا ہے۔ یہ سنتھا ولی مٹھ کا بڑا محافظ سانپ تھا۔

وہ درختوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

"ہمیں دوسری طرف سے اس جنگل میں داخل ہونا چاہیے تھا۔ اس طرف آ جاؤ۔"

ہم گھوڑوں پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے گھوڑے دوسری طرف بڑھا دیئے۔ اب ہم جنگل کے اندر جانے کی بجائے جنگل کے کنارے کنارے جو درخت تھے' ان کے قریب سے ہو کر جنوب کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے کاویری سے پوچھا کہ جس خفیہ راستے کا اس نے ذکر کیا تھا' وہ کہاں ہے؟ کہنے لگی۔

"مشکل یہ ہے کہ وہ جنگل کے اندر جا کر ہے۔"

"اور سنتھا ولی کا مٹھ کہاں ہے؟ مجھے تو یہاں سوائے درختوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

اس نے کہا۔ "اس جنگل کے وسط میں ایک پتھر کی چار دیواری ہے۔ سنتھا ولی مٹھ اس چار دیواری کے اندر بنایا گیا ہے۔"

میں نے سوال کیا۔ "اس مٹھ میں کیا ہوتا ہے؟"

وہ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"وہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ وہاں ایسی ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ تم سنو گے تو تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ اس پوتھی کو بند ہی رہنے دو۔"

میں نے فکر مند لہجے میں پوچھا۔ "میری بیوی کے ساتھ تو کوئی برا سلوک نہیں ہو رہا یہاں؟"

کاویری نے کہا۔ "وہ اس لیے بچی ہوئی ہے کہ اسے پجاری دیوگری نے اپنے لیے پسند کرلیا ہوا ہے اور یہاں اسے ناگ اتسو سے پہلے خاص رسم ادا کرنے کے لیے بھیجا ہے۔"

"وہ خاص رسم کیا ہو سکتی ہے؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

کاویری کہنے لگی۔

"میں یہ تمہیں نہیں بتاؤں گی۔ تم اتنا سمجھ لو کہ تمہاری بیوی جمیلہ یہاں زندہ حالت میں ہے اور ہم پوری کوشش کریں گے کہ اسے یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائیں۔"

میں دل میں خدا سے دعا مانگنے لگا کہ وہ نارمل حالت میں ہو۔ اتنا مجھے کاویری نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ناگ دیوی کے مندر میں جب پجاری دیوگری اسے لایا تھا تو اس کے جسم پر سانپ کو پھرا دیا جاتا تھا تاکہ سانپ اس کے جسم کی بو اپنے اندر جذب کرلے اور اگر جمیلہ فرار ہو جائے تو سانپ اس کی بو لیتا ہوا اس کے پیچھے نکل پڑے اور موقع پا کر اسے ڈس کر ہلاک کر دے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں جمیلہ کو لے کر جیسے بھی ہو گا سرحد پار کر کے پاکستان چلا جاؤں گا۔ وہاں اول تو بھارت کا سانپ نہیں آسکے گا اگر آ بھی گیا تو میں اسے مار ڈالوں گا اور یوں قصہ ختم ہو جائے گا لیکن جمیلہ کو ناگ اتسو کے واسطے جس کسی خاص تپسیا اور رسومات میں سے گزارا جا رہا تھا اس کے بارے میں' میں اندر ہی اندر پریشان

تھا۔ کاویری کی مثال میرے سامنے تھی۔ اس لڑکی کے اندر سانپوں کے ماحول میں رہنے اور سانپ کے جسم پر ساری رات رینگنے کی وجہ سے زہر پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنی مرضی سے یہ زہر اپنی زبان کی نوک پر لا کر دوسرے کو ہلاک کر سکتی تھی۔ یہ سانپ ہی کی ایک صفت تھی جو اس میں پیدا ہو گئی تھی۔ اگر ایسی ہی کوئی چیز میری بیوی جمیلہ میں بھی پیدا ہو گئی تو یہ آگے چل کر میرے لیے مزید پریشانیاں پیدا کر سکتی تھی۔ عجیب عجیب قسم کے خیالات اور خدشے میرے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ ان میں کچھ توہمات بھی تھے اور کچھ حقیقتیں بھی تھیں جن کا مظاہرہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ چکا تھا۔

ایک جگہ تنگ سی گھاٹی جنگل کے اندر کو جاتی تھی۔

کاویری رک گئی۔ اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے باری باری اپنے چاروں طرف منہ کر کے گہرے سانس لیے۔ وہ اپنے دشمن سانپ کی بو کا سراغ لگا رہی تھی۔ میں نے بھی گھوڑا روک لیا تھا۔ کہنے لگی۔

”دشمن سانپ کو جتنا میں چالاک سمجھ رہی تھی وہ اس سے زیادہ چالاک ہے۔ کسی وقت اس کی ہلکی سی بو آتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا۔“ میں نے پوچھا۔

کاویری نے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمن سانپ نے مجھے تلاش کر لیا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے بھی اس کی بو آ جائے گی۔ چنانچہ وہ مجھے دھوکہ میں مارنا چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے کسی تالاب یا ندی کے جوہڑ میں اس طرح اپنے آپ کو چھپا لیا ہے کہ صرف اس کی گردن پانی کی سطح سے باہر ہے۔ جس کی وجہ سے سانپ کی پوری بو مجھے نہیں آ رہی۔ لیکن میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔“

”تو پھر تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیونکہ اگر دشمن سانپ نے ہمیں غافل پا کر حملہ کر دیا تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔“

کاویری نے کہا۔

”ایک ہی ترکیب میرے ذہن میں آتی ہے اور وہ ترکیب یہ ہے کہ میں اپنا گھوڑا یہاں کسی درخت سے باندھ دیتی ہوں اور تمہارے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ کر آگے چلی جاتی ہوں۔“

”اس سے کیا فرق پڑے گا۔“

میرے اس سوال پر کاویری نے کہا۔

”جس گھوڑے پر میں سواری کرتی آ رہی ہوں، جس کی پیٹھ پر میں اتنی دیر سے بیٹھی رہی ہوں، اس گھوڑے کے بدن میں میرے جسم کی بو رچ بس گئی ہے۔ یہ بو اس گھوڑے کے بدن سے کم از کم آدھ گھنٹے تک نکلتی رہے گی۔ اس طرح دشمن سانپ اگر یہاں آ بھی گیا تو اسے گھوڑا ہی ملے گا میں نہیں ملوں گی۔“

جتنی دیر میں دشمن سانپ کو یہاں آ کر میری بو کا سراغ ملے گا اتنی دیر میں ہم سنتھا ولی مٹھ والی خفیہ غار میں داخل ہو چکے ہوں گے اور غار کے اندر سے میرے جسم کی بو بہت ہلکی ہو کر باہر نکلے گی۔ سانپ اتنی آسانی سے مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا۔“

اس کے ساتھ ہی کاویری گھوڑے پر سے اتر پڑی۔

اس نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا اور میرے گھوڑے پر میرے آگے بیٹھ گئی۔ اس نے گھوڑے کی باگیں تھام لیں۔ اسے آہستہ سے ایڑھ لگائی اور گھوڑا گھاٹی میں اتر گیا۔

گھاٹی میں جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ اس کے دونوں کنارے اونچے تھے۔ ہمارا گھوڑا جھاڑیوں میں چلتا جا رہا تھا۔ کافی آگے جا کر گھاٹی ختم ہو گئی اور ہم ہموار زمین پر آ گئے جہاں درخت ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہاں گھوڑا بالکل نہیں گزر سکتا تھا۔ کاویری نے کہا۔ ”ہمیں یہ گھوڑا بھی یہاں چھوڑنا ہو گا۔“

ہم گھوڑے سے اتر پڑے۔ کاویری نے گھوڑے کو باندھنے کی بجائے کھلا چھوڑ دیا اور ہم درختوں کے درمیان اگی ہوئی جھاڑیوں اور اونچی گھاس میں ہاتھوں سے راستہ بناتے آگے چلنے لگے۔ کاویری کہنے لگی۔

"یہ علاقہ سنتھاولی مٹھ کی چار دیواری سے دور ہے اس طرف مٹھ کے محافظ سانپ نہیں آتے۔ اس لیے ہم بے فکر ہو کر چل سکتے ہیں۔"

جھاڑیوں میں راستہ بناتے اور رک رک کر چلتے آخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں درختوں کا گھنا پن کسی حد تک چھٹ گیا تھا اور کالے سیاہ رنگ کی ہیبت ناک چٹانیں زمین سے نکل کر ایک دوسری کے اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ کاویری یہاں دو قدم آگے جا کر ذرا جھک کر چٹانوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ میں تھک کر وہیں بیٹھ گیا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی مگر خاموش تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہاں پانی کہیں بھی نہیں ہے۔ کاویری ایک سیاہ چٹان کے پیچھے چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پھر واپس نکل کر آئی اور مجھے اشارے سے بلایا۔ میں اٹھ کر اس کے پاس گیا تو وہ بولی۔

"مجھے خفیہ غار مل گیا ہے۔ یہ غار کافی لمبا ہے تم اس میں سے گزرتے ہوئے گھبراؤ گے تو نہیں؟ کیونکہ غار میں جالے بھی لٹک رہے ہوں گے کیڑے مکوڑے بھی ہوں گے اور اندھیرا بھی ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "کاویری! اگر تم عورت ہو کر اس اندھیرے غار میں سے گزر سکتی ہو تو میں کیوں نہیں جا سکتا؟"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

"آ جاؤ۔"

غار کا دہانہ چٹان کی دوسری طرف تھا جس کو جنگلی جھاڑیوں کی بڑے بڑے پتوں والی شاخوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کاویری نے جھاڑیوں کو پرے ہٹایا تو مجھے ایک اندھیرا شگاف نظر آیا۔ کاویری اس اندھرے شگاف میں داخل ہو گئی۔ میں بھی اللہ کا نام لے کر اس کے پیچھے شگاف میں داخل ہو گیا۔ غار میں گھپ اندھیرا تھا اور عجیب ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ کاویری اس غار میں پہلے بھی آ چکی ہے۔ وہ میرے آگے تھے۔ کہنے لگی۔

"ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

میں نے کہا۔ "بالکل نہیں۔"

غار کی چھت اونچی ہی ہو گی کیونکہ ہمارے سر اس کے ساتھ نہیں لگ رہے تھے۔ جالے ضرور منہ کے آگے آتے جن کو میں ہاتھوں سے پرے ہٹا دیتا۔ زمین پر بجری سی بچھی ہوئی تھی۔ میں نے دونوں بازو پھیلائے تو ایک طرف میرا ہاتھ دیوار سے لگ گیا۔ دوسری طرف ہاتھ دیوار سے نہ لگا۔ میں دیوار پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ ایک دو بار میں کاویری سے ٹکرا گیا تو اس نے کہا کہ اتنی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غار میں کوئی گڑھا وغیرہ نہیں ہے۔ میں یہاں سے دو تین بار گزر چکی ہوں۔ میں نے جوگر بوٹ پہن رکھے تھے۔ مجھے کیڑے مکوڑوں کا زیادہ ڈر نہیں تھا۔ خطرہ تھا تو صرف یہ کہ کسی طرف سے کوئی سانپ نہ نکل آئے۔ جب میں نے کاویری سے اس خطرے کا ذکر کیا تو وہ بولی۔

"اس غار میں سانپ نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہاں سے نکلنے والی زمین کی کڑوی بو ہے۔ سانپ اس بو سے گھبراتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "پھر تو تمہارا دشمن کالا سانپ بھی اس غار میں نہیں آئے گا۔"

وہ بولی۔ "تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ اس لیے میں نے سوچ رکھا ہے کہ ہم اس غار کے دوسرے منہ کے پاس جا کر اپنا ٹھکانہ بنائیں گے۔"

"کیا مطلب تمہارا یعنی اس غار میں رہنا پڑے گا؟"

میں نے مایوسی کے انداز میں پوچھا۔

کاویری نے کہا۔

"تو اور کیا' تمہارا خیال ہے کہ ہم سیدھے سنتھاولی مٹھ میں جائیں گے اور تمہاری بیوی بالکل تنہا بیٹھی ہو گی اور ہم اسے لے کر واپس چلے جائیں گے؟ تمہاری بیوی نہ صرف محافظ سانپوں بلکہ مٹھ کے ہٹے کٹے پجاریوں کے پہرے میں ہو گی۔ اسے یہاں سے نکالنے کے لیے مجھے بڑی عقل اور کسی ترکیب سے کام لینا پڑے گا۔"

میں نے یہی سوچ لیا تھا کہ ریوالور میرے پاس ہے۔ اس میں ابھی گیارہ بارہ گولیاں تو

ضرور بھری ہوئی ہوں گی۔ کوئی صورت نظر نہ آئی تو میں فائرنگ کر کے چھ سات پجاریوں کو ڈھیر کر دوں گا اور جمیلہ کو نکال کر لے جاؤں گا۔ چھ سات پجاریوں کی لاشیں گریں تو باقی سب بھاگ جائیں گے۔ ڈر صرف ان زہریلے سانپوں کا تھا جو بقول کاویری کے میری بیوی کی نگرانی کر رہے تھے۔ کیونکہ اس جگہ میری بیوی ناگ پوجا کرنے والوں کی خاص رسم کے مرحلے میں سے گزر رہی تھی۔ لیکن میری بیوی کی محبت اور اسے ان شیطانوں کے جہنم سے نکال لے جانے کا جذبہ اس قدر طاقتور تھا کہ مجھے سانپوں کی بھی زیادہ پروا نہیں تھی۔ یہ خیال ضرور تھا کہ کہیں کوئی سانپ جمیلہ کو نہ ڈس لے۔

ہم غار کے اندر گھپ اندھیرے میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ایک دوسرے کے پیچھے باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ اندھیرا اتنا سیاہ تھا کہ نہ کاویری مجھے نظر آ رہی تھی اور نہ میں اسے نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد کاویری نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کندھے پر رکھ لیا اور کہا۔

"اس طرح تمہیں چلنے میں آسانی رہے گی۔"

غار شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ مجھے سانس لینے میں بھی اس طرح دشواری پیش آ رہی تھی کہ کھینچ کھینچ کر سانس لینا پڑتا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ غار کی فضا انتہائی بوجھل اور مرطوب تھی۔ آخر خدا خدا کر کے مجھے دور روشنی کا ایک نقطہ دکھائی دیا۔ میں نے کاویری سے کہا۔

"شاید غار کا دوسرا سرا آ گیا ہے۔"

روشنی کا نقطہ اس نے بھی دیکھ لیا تھا۔

"ہاں ہم غار کے دوسرے سرے پر پہنچنے والے ہیں۔"

روشنی کا نقطہ آہستہ آہستہ پھیلتا چلا گیا۔ پھر مجھے کاویری کا سر اور اس کے بدن کا خاکہ اندھیرے میں ابھرتا دکھائی دیا۔ فضا میں بھی تازہ ہوا شامل ہونے لگی تھی۔ ہم غار کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ کاویری کے کندھے سے میں نے ہاتھ اٹھا لیا۔ غار کا دہانہ زیادہ فراخ نہیں تھا۔ یہاں بھی غار کے منہ کو آدھے کے قریب جنگلی جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا

تھا۔ دن کافی ڈھل چکا تھا اور بادلوں کی وجہ سے باہر زیادہ روشنی تھی۔ کاویری غار کے دہانے کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ میں بھی بیٹھ گیا' وہ باہر دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"ہمیں جنگل میں شام کا اندھیرا پھیل جانے کا انتظار کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"کیا تم اکیلی جاؤ گی؟"

وہ بولی۔

"تو کیا تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی۔ تم تو بڑی آسانی سے کسی سانپ کا شکار بن جاؤ گے۔ مجھے تو محافظ سانپوں کی بُو خبردار کر دے گی۔"

مَیں مزید سوال کرنے لگا تو کاویری نے کہا۔

"تمہیں کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب میں جاؤں تو تم خاموشی سے یہاں بیٹھے رہنا۔ اِس طرف کوئی محافظ سانپ نہیں آئے گا۔ ہاں غار سے باہر نکلے تو ضرور کوئی نہ کوئی سانپ تمہیں ڈس لے گا۔"

مَیں نے کہا۔

"مَیں تمہارے کہنے پر پورا عمل کروں گا لیکن یہ تو بتاؤ کہ سنتھا ولی کا مٹھ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"زیادہ دور نہیں ہے۔ بیچ میں راون کا مرگھٹ آتا ہے۔ اس کے آگے سنتھا ولی مٹھ کی چار دیواری شروع ہو جاتی ہے۔"

"میری بیوی یہیں ہو گی ناں؟"

میں نے بڑے جذباتی لہجے میں پوچھا۔ وہ بولی۔

"تم فکر کیوں کرتے ہو؟ تمہاری بیوی یہیں ہے۔ میں اس کا پورا پتہ لگا کر آؤں گی کہ ناگ اتسو کے لیے اسے ناگ کے پجاریوں نے کہاں رکھا ہُوا ہے۔"

میں نے اس سے راون کے مرگھٹ کے بارے میں پوچھا کہ کیا راون راجہ کو اسی

مرگھٹ میں جلایا گیا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"نہیں۔ راون تو لنکا کا راجہ تھا۔ وہ سیتا میّا کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ رام چندر جی نے لنکا پر چڑھائی کر کے راون کو مار دیا تھا اور سیتا میا کو چھڑا کر لے آئے تھے۔ اس جگہ کسی زمانے میں لوگ راون کا پتلا بنا کر جلایا کرتے تھے۔ اس وجہ سے اس کا نام راون کا مرگھٹ پڑ گیا۔ راون کے پتلے کو چبوترے پر لٹا کر اس کی چتا بنائی جاتی تھی۔"

اس طرح باتیں کرتے کرتے باہر اندھیرا ہونے لگا۔

کاویری اٹھتے ہوئے بولی۔

"اب میں چلتی ہوں، تم غار کے اندر ہی بیٹھے رہنا۔ غار کے اندر اس کی خاص بو کی وجہ سے کوئی سانپ وغیرہ اس طرف کا رخ نہیں کرتا۔ یاد رکھنا باہر سنتھا ولی کے محافظ سانپ موجود ہیں۔ اگر تم باہر نکلے انہیں تمہارے جسم کی اجنبی بو فوراً آ جائے گی اور وہ تمہیں اسی وقت ڈس کر ہلاک کر دیں گے۔ اس لیے جب تک میں نہ آؤں تم غار سے باہر مت نکلنا۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو بڑی پیاس لگ رہی ہے۔"

وہ کہنے لگی۔ "پیاس تو مجھے بھی لگی ہے۔"

وہ سوچنے لگی۔ پھر کہا۔

"تم ٹھہرو مجھے یاد ہے یہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر شریفے کے جنگلی درخت ہیں اور پانی کا ایک جھرنا بھی ہے۔ میں وہاں سے پانی پی کر تمہارے لیے بھی لاتی ہوں۔ تم باہر مت نکلنا۔"

وہ چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ غار کے دہانے سے نکل کر فوراً ایک طرف مڑ گئی تھی۔ میں غار کے منہ سے کوئی دو قدم پیچھے ہٹ کر بیٹھا تھا۔ باہر شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ باہر جنگل کے درخت ایک دوسرے کے اوپر چڑھتے ہوئے لگتے تھے اور رات کے بڑھتے پھیلتے اندھیرے بھی تاریک ہوتے جا رہے تھے۔ تعجب کی بات ہے کہ ان درختوں پر سے کسی پرندے کے بولنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ عجیب طرح کے آسیبی درخت تھے۔ جنگل پر قبرستانوں والا آسیبی سکوت طاری تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میری بیوی جمیلہ کو تو یہاں بڑا ڈر لگ رہا ہو گا۔ اس کو اس قسم کے آسیبی ماحول میں رہنے کی بھلا کہاں عادت تھی۔ اپنی بیوی جمیلہ کے خیال سے میرا دل بھر آیا۔

اولاد کی محبت، بیوی کی محبت، بہن بھائیوں اور ماں باپ کی محبت یہ انسان کی بڑی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ لاکھ اختلاف ہوں آپس میں لاکھ لڑائی جھگڑے ہوں لیکن یہ محبتیں کبھی کم نہیں ہوتیں اور مصیبت کا وقت پڑنے پر یہی یاد آتے ہیں۔ میں فوجی آدمی ہوں اور فوج میں بھی کمانڈو فورس میں رہ چکا تھا۔ پکا کمانڈو تھا، سخت جان تھا، جسم بھی مضبوط تھا۔ روح بھی مضبوط تھی لیکن جمیلہ کو یاد کر کے میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔ میں نے اتنا ضرور کیا کہ فوراً اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور آنسوؤں کو آنکھوں سے باہر نہیں آنے دیا۔

کاویری واپس آ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کچھ پکڑ رکھا تھا۔ اندھیرے میں دور سے کچھ پتہ نہ چلا۔ قریب آئی تو معلوم ہوا کہ اس نے کیلے کے ایک بڑے پتے کا کٹورا سا بنا کر اس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"تم پانی پیئو، میں تمہارے لیے جنگلی شریفے اور کیلے لاتی ہوں۔"

پتے کا کٹورا میرے ہاتھ میں دے کر وہ دوبارہ واپس چلی گئی۔ میں نے پانی پیا تو مجھے ہوش سا آ گیا۔ حلق واقعی خشک ہو رہا تھا۔ اس بار کاویری واپس آئی تو اپنی ساڑھی کی جھولی میں جنگلی شریفے ڈال رکھے تھے زرد جنگلی کیلوں کا ایک گچھا اس کے ہاتھ میں تھا۔ کہنے لگی۔

"تم اپنی بھوک مٹاؤ میں نے وہیں تھوڑا بہت کھا کر پانی پی لیا تھا۔ باقی جو کچھ بچے رکھ لینا۔ ہو سکتا ہے ہمیں دو ایک روز اسی غار میں رہنا پڑے۔ میں جاتی ہوں میری نصیحت یاد رکھنا۔ غار سے باہر قدم مت نکالنا۔"

یہ کہہ کر وہ غار سے نکل کر رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

میں شریفے اور کیلے کھانے لگا۔ کیلے چھوٹے چھوٹے تھے۔ ان میں ہری چھیل کے

کیلوں والی خوشبوں نہیں تھی میٹھے ضرور تھے۔ شریفے بھی تھوڑے کھٹ مٹھے تھے مگر اس وقت یہ بڑی نعمت معلوم ہو رہے تھے۔ میں غار کے دہانے سے تھوڑا پیچھے ہو کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کاویری واپس آ جائے گی؟ اگر وہ کسی مصیبت میں پھنس گئی تو میرے لیے مشکل پیدا ہو جائے گی۔ جمیلہ مجھ سے اور دور ہو جائے گی۔ میں ریوالور سے مٹھ کے پجاریوں کو تو ختم کر لوں گا لیکن یہاں جو زہریلے سانپ انہوں نے چھوڑ رکھے ہیں ان کا مقابلہ کیسے کر سکوں گا۔

رات کا اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا۔ جنگل کی خاموشی اور زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ اس بات کا مجھے اطمینان تھا کہ غار میں کوئی سانپ باہر سے نہیں آئے گا۔ لیکن مچھر اور چیونٹیاں مجھے تنگ کرنے لگی تھیں۔ میں بار بار جگہ بدلتا اور مچھروں کو ہاتھوں سے ادھر ادھر ہٹا دیتا۔ آسمان پر بادل ضرور تھے مگر نہ ہوا چل رہی تھی، نہ ابھی بارش ہی شروع ہوئی تھی۔ وقت کا کچھ اندازہ نہیں رہا تھا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ بس جاگتا رہا۔ مچھروں کو مارتا رہا۔ چیونٹیوں کو مسلتا رہا اور رات گزرتی چلی گئی۔ کاویری کو گئے میرے اندازے کے مطابق دو ڈھائی گھنٹے ہو گئے تھے۔ غار کے دہانے کی تاریکی جنگل کی تاریکی میں گھل مل گئی تھی۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ غار کا دہانہ کہاں ختم ہوتا ہے اور جنگل کا اندھیرا کہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ ایک دو بار مچھروں نے زیادہ تنگ کیا تو بے اختیار جی چاہا کہ غار سے باہر نکل جاؤں۔ کم از کم باہر کھلی فضا تو ہو گی۔ پھر خیال آتا کہ کاویری نے منع کیا ہوا ہے۔ کہیں بیچ میں کسی طرف سے کوئی سانپ نکل کر حملہ نہ کر دے۔

رات یقیناً آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی کہ مجھے باہر پتوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سانس روک کر غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں کوئی شے حرکت کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کون ہو؟"

ریوالور میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دوسری طرف سے کاویری کی آواز آئی۔

"میں ہوں۔ کاویری۔"

میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ جلدی سے پوچھا۔ "میری بیوی کا کچھ پتہ چلا؟ تم اس سے ملی ہو؟"

کاویری میرے قریب بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"ذرا سانس لینے دو۔ سب کچھ بتاتی ہوں۔"

لگتا تھا کہ وہ بہت سی معلومات حاصل کر کے آئی ہے۔ دل میں دعا مانگنے لگا کہ یا خدا یہ کوئی خیر کی خبر لائی ہو۔ کاویری کہنے لگی۔

"تمہاری بیوی زندہ ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"وہ کہاں ہے؟ مجھے بتاؤ وہ جہاں بھی ہو گی میں اسے وہاں سے نکال کر لے آؤں گا۔"

کاویری کے چہرے پر کچھ فکر و پریشانی کے اثرات تھے۔ کہنے لگی۔

"وہ جہاں پر ہے تم آسانی سے وہاں نہیں پہنچ سکو گے؟"

"کیوں نہیں پہنچ سکوں گا۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے بتاؤ تو سہی میں اسے تلواروں کی چھاؤں سے نکال کر لے آؤں گا۔"

کاویری میرے پاس بیٹھ گئی تھی۔ غار کے باہر جنگل میں ابھی تک تاریکی تھی۔ مجھے اسی کے جسم کا دھندلا خاکہ ہی نظر آ رہا تھا۔ گہری سانس لے کر کہنے لگی۔

"سنتھا ولی مٹھ کے پجاری سپیروں نے تمہاری بیوی پر ناگ اتنتو کا چلہ پورا کر دیا ہے۔"

"پورا کر دیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ میری بیوی زندہ تو ہے میں دن نکلنے سے پہلے اسے وہاں سے نکال لاؤں گا۔ میرے پاس بھرا ہوا ریوالور ہے۔ یہ پجاری سپیرے میرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ میں پہرہ دینے والے سانپوں سے بھی نمٹ لوں گا۔"

کاویری اندھیرے میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ چپ تھی۔ مجھے کاویری کے اس انداز کو دیکھ کر بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔

”کاویری تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں کہ اصل بات کیا ہے؟“

تب مجھے کاویری نے اصل مصیبت بتاتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بیوی زندہ ضرور ہے مگر اس کے اندر ناگ اتسو کی رسمیں پوری کرنے کے بعد ناگن کی ساری خصلتیں پیدا ہو گئی ہیں۔“

میرا جسم خوف اور تشویش سے جیسے سرد پڑنے لگا۔ میں اندھیرے میں کاویری کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ میری بیوی میں ناگن کی خصلتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ میں نے پوچھا۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

وہ بولی۔

”کرم داد! تمہیں یہ بتاتے ہوئے مجھے بڑا دکھ محسوس ہو رہا ہے کہ تمہاری بیوی آدھی ناگن بن چکی ہے۔ ابھی اس میں یہ قابلیت پیدا نہیں ہوئی کہ عورت سے ناگن بن جائے لیکن جو پر اسرار منتر اس پر پھونکے گئے ہیں اور پجاری سپیروں نے اس پر جو ناگ جادو کیا ہے اس کے اثر سے شاید کچھ وقت گزرنے پر تمہاری بیوی میں عورت سے ناگن سانپ بن جانے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔“

میں رات کے اندھیرے میں بت بنا کاویری کی حیرت انگیز اور یقین میں نہ آنے والی باتیں سن رہا تھا۔ کسی وقت لگتا کہ یہ سچ کہہ رہی ہے۔ کسی وقت محسوس ہوتا کہ یہ فضول باتیں ہیں۔ جمیلہ مسلمان ہے اور ایک مسلمان پر ان توہمات اور جادوگریوں کا کبھی اثر نہیں ہو سکتا۔ میں نے کاویری کے بیان کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کاویری! میں مسلمان ہوں اور مسلمان اس قسم کے توہمات پر کبھی یقین نہیں کر سکتا۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ میری بیوی سنتھا ولی مٹھ میں کس جگہ پر ہے باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔“

کاویری بولی۔

”میں نے تمہیں بتا بھی دیا تو تم کیسے وہاں پہنچو گے؟ راستے میں قدم قدم پر بے حد

زہریلے سانپ پہرہ دے رہے ہیں۔ وہ تمہیں راستے میں ہی ڈس کر ہلاک کر دیں گے۔“

میں نے کاویری کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور منت سماجت کے لہجے میں کہا۔

”کاویری! تمہیں اپنے بھگوان کی قسم ہے۔ مجھے میری بیوی کے بارے میں بتا دو کہ وہ مٹھ میں کس جگہ پر ہے۔ یقین کرو سانپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میں جمیلہ کو نکال کر زندہ سلامت واپس آ جاؤں گا۔“

کاویری سوچ میں پڑ گئی۔ کہنے لگی۔

”کرم داد! تم اپنی بیوی کو واپس لا کر ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ اس پر جو پر اسرار اور خونی منتر پھونکے گئے ہیں اور شیش ناگ کے جس چلے میں سے اسے گزارا گیا ہے اس کے بعد تمہاری بیوی ناگ دیوتا کی خاص ناگ داسی بن چکی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی یادداشت بھی غائب ہو گئی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں بالکل نہ پہچانے۔ اس کے باوجود اگر تم اسے کسی طرح نکال کر اپنے ساتھ لے بھی گئے تو سنتھا ولی مٹھ کا بڑا پجاری سپیرا خود اس کی کھوج میں نکل پڑے گا کیونکہ مٹھ کی خاص ناگ داسی کا فرار ہو جانا ناگ دیوتا کی بہت بڑی توہین ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اپنی بیوی کو نکال کر لے جاؤ تو تمہاری بیوی موقع پا کر خود ہی سنتھا ولی مٹھ میں واپس آ جائے۔ اگر وہ خود واپس نہ آئی تو پجاری سپیرا سیاہ ناگ کے ساتھ خود اس کی تلاش میں نکل پڑے گا۔ پجاری سپیرے کو اور اس کے سیاہ ناگ کو تمہاری بیوی کی بو آ جائے گی۔ تمہاری بیوی جہاں کہیں بھی ہو گی پجاری سپیرا وہاں پہنچ جائے گا اور تمہاری بیوی کو قابو کر کے واپس لے آئے گا۔ اگر تم نے مزاحمت کی تو وہ اپنے سیاہ ناگ سے ڈسوا کر تمہیں بھی ہلاک کر دے گا۔“

یہ باتیں مجھے ہزاروں برس پہلے کے جنگلی انسانوں کی باتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ کاویری جو کچھ بیان کر رہی تھی مجھے اس پر ذرا سا بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرے سامنے صرف ایک ہی خیال تھا میری بیوی زندہ ہے۔ وہ شیطان اور بدمعاش لوگوں کے قبضے میں ہے اور مجھے ہر حالت میں اسے ان بدمعاش لوگوں کے چنگل سے چھڑانا ہے۔ کاویری جب

اپنی رام کتھا سنا چکی تو میں نے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

”کاویری! اگر تمہیں مجھ سے اور میری بیوی سے تھوڑی بہت بھی ہمدردی ہے اور تم واقعی میری مدد کرنا چاہتی ہو تو اپنے بھگوان کے لیے مجھے صرف اتنا بتا دو کہ میری بیوی جمیلہ کو سنتھا ولی مٹھ کے بدمعاشوں نے کہاں قید میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ پھر میں جانوں اور میرا کام۔“

کاویری نے اب میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بڑی دردمندی کے ساتھ بولی۔

”یہ تمہاری ہمدردی اور تمہیں تمہاری بیوی کے ساتھ ملانے کا خیال ہی تھا جو مجھے یہاں کھینچ کر لے آیا ہے۔ ورنہ میں دیوگری کے مندر سے فرار ہو کر جھانسی بھوپال کی طرف بھی جا سکتی تھی۔ میں جو کچھ تمہیں کہہ رہی ہوں اس پر یقین کرو۔ اگر تمہاری بیوی کو وہاں سے نکالنا آسان ہوتا تو میں اسے اپنے ساتھ ہی لے کر آتی۔“

یہ بات بھی میرے پیش نظر تھی کہ کاویری کو اپنی جان کا خطرہ بھی لگا ہوا ہے۔ ناگ دیوی کے مندر کا ایک موذی سانپ اس کو ہلاک کرنے کے لیے برابر اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس طرح کاویری کی توجہ دو طرف بٹ چکی تھی۔ ایک تو وہ میری بیوی کو مشکل سے نکالنا چاہتی تھی، دوسرے اسے اپنی جان کی بھی فکر تھی۔ اس کے پیچھے لگا ہوا سانپ کسی بھی وقت جنگل میں اسے ڈس کر ہلاک کر سکتا تھا۔ وہ مجھے بتا چکی تھی کہ اس کا دشمن سانپ اس کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس نے سانپ کی بو محسوس کر لی تھی۔ اس کے باوجود یہ دلیر عورت میرے لیے وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ ورنہ وہ بڑی آسانی سے بھارت کے کسی بھی شہر، کسی بھی صوبے کی طرف فرار ہو سکتی تھی۔

کاویری نے مجھے اتنا بتا دیا تھا کہ میری بیوی سنتھا ولی مٹھ کے تہہ خانے میں بند ہے اور مٹھ کے پجاری سپیرے اور ان کے سانپ اس پر پہرہ دے رہے ہیں۔ میں ان سپیروں سے تو نمٹ سکتا تھا مگر سانپوں کا مقابلہ کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ ایک دو سانپ ہوتے تو میں انہیں ختم کر دیتا مگر یہاں تو بقول کاویری کے زہریلے سانپ کیڑے مکوڑوں کی طرح چل پھر رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان سانپوں سے بچ کر میں اپنی بیوی کے تہہ خانے تک کیسے پہنچوں گا اور پھر وہاں سے اپنی بیوی کو نکال کر سانپوں سے بچاتے ہوئے کیسے واپس آؤں گا۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے مجھے کاویری کی راہنمائی کی سخت ضرورت تھی۔ میں نے بے بسی کے ساتھ کہا۔

”تو پھر تم مجھے کیا مشورہ دیتی ہو؟ کیا تم اسے کسی طرح نکال کر یہاں تک نہیں لا سکتیں؟“

اس نے کہا۔

”میں خود اسی سوچ میں ہوں۔ آج کا دن گزر جائے۔ رات کا اندھیرا ہوتے ہی میں دوبارہ سنتھا ولی مٹھ کی طرف جاؤں گی اور اس بات کا جائزہ لوں گی کہ میں تمہاری بیوی کو وہاں سے کس طرف سے اور کس طریقے سے نکال سکتی ہوں؟“

وہ دن ہم نے غار میں بیٹھ کر ہی گزار دیا۔ آسمان اسی طرح ابر آلود تھا مگر بارش نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران کاویری فضا کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد سونگھ لیتی تھی۔ کہنے لگی۔

”کسی وقت مجھے اپنے دشمن سانپ کی بو آتی ہے اور کسی وقت دور ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دشمن سانپ یہاں سنتھا ولی مٹھ کے سانپوں کی وجہ سے جنگل میں آگے بڑھتے ہوئے گھبرا رہا ہے۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

کاویری نے جواب میں کہا۔

”سنتھا ولی مٹھ کے سانپ بڑے زہریلے اور غصیلے سانپ ہیں۔ باہر سے کوئی بھی سانپ آ جائے وہ اس پر ضرور حملہ کر دیتے ہیں۔ شاید اسی خیال سے میرا دشمن سانپ یہاں تک آتے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔ مگر اتنا مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ اسی جنگل میں ہے اور اس انتظار میں ہے کہ میں اسے کہیں نظر آ جاؤں اور وہ وہیں مجھے ڈس کر ہلاک کر دے۔“

جب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا اور جنگل میں بادلوں اور درختوں کے گنجان ہونے کی وجہ سے رات ہونے سے پہلے ہی رات کی تاریکی چھا گئی تو کاویری میری بیوی کے فرار کا جائزہ

لینے کے لیے سنتھا ولی مٹھ کی طرف چل دی۔ جانے سے پہلے میں نے اسے کہا۔

"کاویری! دشمن سانپ سے ہوشیار رہ کر جانا اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ اگر میرے دشمن سانپ کو میری بو آجاتی ہے تو مجھے بھی اس کی بو آجاتی ہے وہ اتنی آسانی سے مجھے اپنا شکار نہیں بنا سکے گا۔"

کاویری چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد مجھے بار بار یہی خیال آنے لگا کہ دشمن سانپ جنگل میں موجود ہے کہیں وہ کاویری کو غافل پاکر ڈس نہ لے۔ اگر ایسا ہوگیا تو مجھے تو کچھ پتہ نہیں ہے کہ سنتھا ولی مٹھ کس جگہ پر ہے اور شیطان صفت پجاری سپیروں نے میری بیوی کو جس جگہ قید کر رکھا ہے میں وہاں تک کس طرح پہنچوں گا۔

میں خود اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس کے پیچھے جا سکتا۔ جس غار میں ہم نے پناہ لے رکھی تھی وہاں سے لے کر سنتھا ولی کے مٹھ تک زہریلے سانپوں کی حکومت تھی۔ کاویری تو پھر سانپوں کی بو پاکر ان سے بچاؤ کا کوئی طریقہ اختیار کر سکتی تھی۔ لیکن میرے لیے ان سے بچنا مشکل تھا۔ اس کے باوجود یہ اس بہادر عورت کی ہمت تھی کہ وہ محض میرے اور میری بیوی کے ساتھ انسانی ہمدردی کی وجہ سے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے ہوئے تھی۔

میں انہی خیالات میں الجھا رہا اور گزری ہوئی رات کی طرح وہ رات بھی آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ وقت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ مچھر اور چیونٹیاں حملہ آور ہو رہی تھیں اور میں ان کا مقابلہ بھی کر رہا تھا اور جنگل کی خاموشی پر کان بھی لگا رکھے تھے کہ کب کاویری کے آنے کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ کافی وقت گزر گیا۔ کاویری نہ آئی۔ میں غار میں اٹھ کر

دھوئیں کی بو پجاری سپیروں تک جا سکتی تھی اور وہ یہ معلوم کرنے وہاں آسکتے تھے کہ علاقے میں آگ کس نے جلائی ہے اور ہمارا بھید کھل سکتا تھا۔ جنگل پر ایک بار پھر رات کی گہری خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ اس خاموشی میں کسی کسی وقت سیٹی کی باریک سی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ کاویری نے مجھے بتایا تھا کہ یہ جنگل میں پہرہ دینے والے محافظ سانپوں کی آواز ہے۔ اس آواز کو سن کر میرے جسم میں خوف کی سرد لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ سانپ انسان کا ایسا دشمن ہے کہ جس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب کس طرف سے آکر اچانک حملہ کر دے اور اس جنگل کے سانپ ایسے زہریلے تھے کہ بقول کاویری کے جس کو ڈس لیں اس کی اسی وقت موت واقع ہو جاتی ہے۔

آخر مجھے جنگل کی خاموشی میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں آنکھیں پھاڑ کر جنگل کے اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ تاریکی میں سے ایک سایہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سایہ قریب آیا تو میں نے کاویری کو پہچان لیا۔ اس کا سانس کچھ پھولا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"ایک سانپ نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔"

"کیا وہ تمہارا دشمن سانپ تھا؟"

"نہیں۔" کاویری نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی بو میرے دشمن سانپ کی نہیں تھی۔ وہ سنتھا ولی کا محافظ سانپ ہی تھا۔ عین وقت پر مجھے اس کی بو آگئی اور میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔"

جب اس کا سانس ٹھیک ہوگیا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ سنتھا ولی مٹھ کا پورا جائزہ لے آئی ہے۔

"جمیلہ ابھی تک اسی تہہ خانے میں قید ہے۔ قید نہیں کہنا چاہیے کیونکہ ناگ یگیہ کی رسمیں ادا ہو چکنے کے بعد اس کی اپنی آدھی شخصیت ختم ہوگئی ہوگی اور اب اس کے دل میں وہاں سے فرار ہو جانے کا خیال نہیں آتا ہوگا۔ کچھ ناگ دیوی کے پجاریوں نے جمیلہ

تھیں، باقی کی کسر سنتھا ولی مٹھ کے پجاری سپیروں نے اس بے چاری پر سانپوں کے خفیہ منتر پھونک کر اس کو سانپوں کے چلے کے مراحل سے گزار کر پوری کر دی۔ بہرحال چونکہ تم ہر حالت میں اپنی بیوی کو یہاں سے نکال کر ساتھ لے جانا چاہتے ہو اس لیے ہم اسے نکالنے کی پوری کوشش کریں گے۔”

میں نے پوچھا۔

“تم نے وہاں سے جمیلہ کو نکال لانے کی کوئی ترکیب بھی سوچی ہے؟ تم تو ساری جگہ خود دیکھ کر آئی ہو۔”

وہ کہنے لگی۔

“سنتھا ولی مٹھ کے پیچھے ایک گہری کھائی ہے۔ میں نے اس کھائی میں اتر کر دیکھا ہے، یہ زیادہ گہری نہیں ہے۔ یہ کھائی آگے جا کر ایک نہر کے کنارے پر نکل آتی ہے۔ نہر وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ جمیلہ کو تہہ خانے سے نکالنے کی صورت میں ہمیں اسی کھائی سے گزر کر نہر پر آنا ہوگا۔ یہی راستہ مجھے سب سے زیادہ محفوظ لگتا ہے۔ کیونکہ کھائی میں سے گزرتے ہوئے مجھے کسی سانپ کی بو نہیں آئی۔ نہر زیادہ بڑی نہیں ہے۔ پچھم کی طرف نہر کے پار جٹا دھاریوں کا چھ کوس کا جنگل ہے۔ اس جنگل کے آگے ڈھایا گڑھ کا ریلوے سٹیشن آتا ہے۔ ایک بار ہم وہاں تک پہنچ گئے تو سنتھا ولی مٹھ کے سانپوں اور پجاری سپیروں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ ہاں تمہاری بیوی کے فرار کا جب ان لوگوں کو پتہ چلے گا تو پجاری سپیرا اس کی تلاش میں نکل پڑے گا۔ پھر صرف اسی ایک سپیرے اور اس کے سانپوں کا خطرہ ہوگا۔”

میں نے کہا۔

“ہم جمیلہ کو مٹھ کے تہہ خانے سے نکالیں گے کیسے؟”

کاویری نے کہا۔

“اس کی صرف ایک ہی صورت ہے تم میرے ساتھ چلو گے اور جہاں میں تمہیں چھپنے کو کہوں تم وہاں چھپ کر میری واپسی کا انتظار کرو گے۔ بھگوان نے چاہا تو میں تمہاری بیوی کو ساتھ ہی لے کر آؤں گی۔”

میں نے کہا۔

“کیا ہم ابھی نہ مہم پر نکل چلیں؟”

کاویری بولی۔

“یہ کام ہمیں آج رات ہی کرنا ہوگا مگر ابھی نہیں۔ میں ادھر دیکھ کر آئی ہوں۔ ابھی وہاں پجاری سپیرے بھجن کیرتن کر رہے ہیں۔ ان کا بھجن کیرتن جو وہ سانپوں کے آگے کرتے ہیں آدھی رات تک جاری رہے گا۔ ہم رات کے پچھلے پہر یہاں سے نکلیں گے۔”

کاویری کو وقت کا اندازہ تھا۔ وہ سنتھا ولی مٹھ میں پجاری سپیروں کو سانپوں کے آگے بھجن کیرتن کرتے دیکھ آئی تھی۔ کم از کم اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ ان کا بھجن کیرتن کس وقت ختم ہوگا۔ سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم غار کے دہانے کے قریب اندر کی طرف بیٹھے رہے۔ کسی وقت مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ کاویری مٹھ کے تہہ خانے میں سے میری بیوی کو نکال لائے گی۔ وہاں کے جو حالات اس نے بتائے تھے وہ بڑے خطرناک تھے۔ جب میں نے کاویری کے آگے اس بارے میں شک شبے کا اظہار کیا تو اس نے فوراً کوئی جواب نہ دیا۔ پھر آہستہ سے بولی۔

“بھگوان نے چاہا تو میں تمہاری بیوی کو وہاں سے نکال لاؤں گی۔ اگر میں واپس نہ آئی تو تم سمجھ لینا کہ میں زندہ نہیں ہوں۔ پھر تم ایک منٹ بھی ضائع نہ کرنا اور وہاں سے ڈھایا گڑھ کے سٹیشن کی طرف بھاگ جانا کیونکہ میرے مر جانے کی صورت میں تمہاری زندگی بھی خطرے میں ہوگی۔”

میں نے کہا۔

“کاویری! ایک بات میں تمہیں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں میں اب اس منحوس جنگل سے اپنی بیوی کو ساتھ لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔”

کاویری چپ ہو گئی۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ ایک غیرت مند اور محبت کرنے والے

خاوند کی حیثیت سے مجھے یہی کرنا چاہیے۔ ہم کافی دیر تک دھیمی آواز میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس کچھ رقم بچی ہوئی ہے۔ ہم ڈھایا گڑھ سے ریل گاڑی کے ٹکٹ خرید سکیں گے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"جمیلہ بہن کے واپس مل جانے کے بعد تم یہاں سے کس طرف جاؤ گے؟ میں تو راجستھان کی طرف چلی جاؤں گی۔ وہاں ہمارے رشتے داروں کا گھر ہے۔"

میں نے کہا۔

"مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ ڈھایا گڑھ سے ریل گاڑیاں کس کس طرف کو جاتی ہیں۔ میرا ارادہ جمیلہ کو اپنے ساتھ لے کر دلی جانے کا ہے۔ وہاں میرا ایک ہمدرد دوست رہتا ہے۔ دلی سے ہم پنجاب کی طرف جائیں گے اور وہاں سے بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچنے کی کوشش کریں گے۔"

اسی طرح باتیں کرتے کرتے کافی رات گزر گئی۔

تب کاویری بولی۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں اپنی مہم پر نکل پڑنا چاہیے۔"

غار کے باہر آ کر اس نے فضا کو تین جانب سے سونگھا۔ وہ اپنے دشمن سانپ کی بو لے رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"دشمن سانپ کی بو کسی وقت آتی ہے کسی وقت غائب ہو جاتی ہے۔ وہ برابر میری تلاش میں ہے لیکن میں پوری طرح سے ہوشیار ہوں۔"

اس کے بعد ہم جنگل میں چل پڑے۔

رات کی تاریکی نے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جنگل میں چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے وہاں بانس کے گھنے جھنڈوں نے چھت ڈال رکھی تھی اور اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ کاویری مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ اس کے گزرنے سے جھاڑیوں کی ٹہنیوں کی جو آواز آتی تھی میں اس آواز کے اندازے سے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ میں بزدل نہیں تھا

اور پھر وہ میری بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ اس کے باوجود مجھے سانپوں کا ڈر لگا ہوا تھا۔ ایک دو بار میں نے اس خیال سے زمین پر زور سے پاؤں مارا کہ اگر ادھر ادھر کوئی سانپ ہو تو وہ ڈر کر بھاگ جائے۔ اس پر کاویری رک گئی۔ اندھیرے میں مجھے بالکل پتہ نہ چلا کہ وہ چلتے چلتے رک گئی ہے۔ میں اس سے ٹکرا گیا۔ اس نے دبی آواز میں مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم زمین پر زور سے پاؤں کیوں مارتے ہو؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"اس لیے کہ اگر راستے میں کوئی سانپ ہو تو وہ بھاگ جائے۔"

کاویری نے سرگوشی میں کہا۔

"سانپ تمہارے پاؤں کی ڈھمک سے بھاگے گا نہیں بلکہ تم پر ضرور حملہ کر دے گا۔ یہ مٹھ کے محافظ سانپ ہیں۔ پاؤں دبا کر چلو۔"

اور وہ چل پڑی۔ اس وقت کاویری میرے بالکل قریب تھی۔ اس کا چہرہ مجھے دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ جب وہ آگے چلی تو دوبارہ اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ میں اس کے کوئی ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔

بانسوں کا جھنڈ ختم ہو گیا۔ ذرا کھلی جگہ آ گئی۔ یہاں اندھیرے میں کاویری اکا سایہ مجھے دکھائی دینے لگا۔ وہ ایک طرف مڑ گئی۔ یہ جگہ نشیب میں تھی۔ آگے پھر تھوڑی سی چڑھائی آ گئی اور زمین دوبارہ ہموار ہو گئی۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گئی۔ چونکہ اندھیرے میں مجھے اس کے جسم کا ہیولا نظر آ رہا تھا اس لیے میں بھی رک گیا۔ اس بار میں اس کے اوپر نہیں گرا۔ اپنا چہرہ میرے قریب لا کر اس نے سرگوشی میں کہا۔

"آگے پتھر کی چھ سات سیڑھیاں ہیں۔ دھیان سے اترنا۔ یہ ایک خشک تالاب ہے۔"

چند قدم چلنے کے بعد وہ نیچے اتر گئی۔ میں بھی سنبھل سنبھل کر نیچے اترنے لگا۔ یہ پتھریلی سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد ہم خشک تالاب میں جگہ جگہ اگی ہوئی گھاس کی جھاڑیوں میں چلنے لگے۔ گھاس رات بھر شبنم کے گرنے سے گیلی ہو رہی تھی۔

یہ کوئی پچاس ساٹھ فٹ چوڑا خشک تالاب تھا۔ آگے پھر پتھر کی سیڑھیاں آگئیں جن پر سے گزر کر ہم تالاب کے دوسرے کنارے پر آ گئے۔

یہاں کاویری نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سامنے کی جانب کچھ دکھاتے ہوئے کہا۔

"وہ روشنی دیکھ رہے ہو؟"

سامنے دور تک تاریکی ہی تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں کسی وقت روشنی کی دھیمی سی لو ابھر کر غائب ہو جاتی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہ سنتھاولی مٹھ کے دروازے پر جلنے والی مشعال ہے۔ ہم بڑے خطرناک علاقے میں داخل ہوگئے ہیں۔ میری بائیں جانب ہو کر میرے ساتھ ساتھ چلو۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ مجھے سنتھاولی مٹھ کے دروازے کی سمت سے دائیں جانب ہو کر لے جا رہی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد مشال کی روشنی نظر آنا بند ہوگئی۔ یہاں بڑے بڑے چٹانوں کے سائز کے پتھر زمین پر جگہ جگہ ابھرے ہوئے تھے۔ ہم ان پتھروں کے درمیان سے ہو کر گزر رہے تھے۔ اچانک کاویری نے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا' میں بالکل اس کے ساتھ لگ گیا بلکہ خود اس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ پھر کندھے سے دبا کر مجھے نیچے بٹھا دیا۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ میں گھبرا گیا کہ خدا جانے کیا ہوگیا ہے۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"خاموش رہنا۔"

جنگل کی رات بڑی ڈراؤنی اور چڑیلوں کے قبرستان کی طرح خاموش تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے کاویری کے سانس کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کے دل کے دھڑکنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ بھی چپ تھی۔ اچانک مجھے ایک لمبی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ یہ سانپ کی سیٹی کی آوز تھی۔ جن لوگوں کو کبھی وسطی ہند کے جنگلوں میں رات کو گزرنے کا اتفاق ہوا ہے' صرف وہی ان جنگلوں کی راتوں کی ہیبت ناک آسیبی

پھر سناٹا چھا جاتا۔ کاویری نے اپنے منہ سے سیٹی کی بڑی باریک اور تیز آواز نکالی۔ وہ وقفے وقفے سے یہ آواز نکالتی رہی۔ اس کے بعد جنگل میں سے جو سیٹی کی آواز سنائی دی تھی' خاموش ہوگئی۔ جب دو تین منٹ تک سانپ کی سیٹی کی آواز نہ آئی تو کاویری نے اٹھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ مٹھ کے محافظ سانپ کی آواز تھی۔ آ جاؤ' آگے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

ہم ایک پتھریلی ڈھلان اترنے لگے۔ ڈھلان ختم ہوئی تو سامنے ایک سیاہ دیوار آگئی۔ کاویری میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوسری طرف لے گئی۔ یہ سیاہ دیوار اصل میں ایک بہت بڑی چٹان تھی۔ یہاں ایسی آواز آنے لگی جیسے پانی نیچے گر رہا ہو۔ کاویری نے میرے کان کے پاس منہ لا کر کہا۔

"یہاں سے ایک جھرنا بہتا ہے۔ ہم اسی طرف جائیں گے۔"

جھرنے کے پانی کے قریب آ گئی۔ اندھیرے میں مجھے جھرنا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کاویری تھوڑی دیر بعد رک جاتی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کر لیتی۔ اسے ڈر تھا کہ جنگل کی انتہاہ تاریکی میں کہیں بھٹک نہ جاؤں۔ جھرنے کی آواز جب تھوڑی پیچھے رہ گئی تو مجھے اندھیرے میں درختوں کے درمیان ذرا اونچی جگہ پر کسی جھونپڑی کا دھندلا سا خاکہ دکھائی دیا۔ کاویری چبوترے کی چڑھائی چڑھ کر اوپر آ گئی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ چبوترے پر ایک جھونپڑا سا بنا ہوا تھا۔ کاویری جھونپڑ کے باہر بیٹھ گئی۔ میں بھی اندھیرے میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"تمہیں یہاں ٹھہر کر میری واپسی کا انتظار کرنا ہوگا۔ اپنے خدا سے پرارتھنا کرنا کہ میں تمہاری بیوی کو زندہ سلامت لے کر واپس آ جاؤں۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"زیادہ دیر نہ لگانا کاویری! جس طرح بھی ہو سکے میری بیوی کو لے کر واپس آنا۔"

وہ بولی۔

لگے اور میں واپس نہ آئی تو سمجھ لینا کہ میں زندہ نہیں ہوں۔ پھر تم ویسے ہی کرنا جیسے میں نے تمہیں کہا ہے۔ اب میں جاتی ہوں۔ یہاں سے ہرگز ہرگز ادھر ادھر مت ہونا۔"

وہ چبوترے کی ڈھلان اتر گئی۔ میں نے تاریکی میں اس کو سائے کی طرح چبوترے سے اتر کر سامنے والے درختوں کے اندھرے میں گم ہوتے دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں جھونپڑے کے باہر ہی بیٹھا تھا۔ جھونپڑے کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ جھونپڑے کے اندر اندھیرا تھا۔ میں باہر بیٹھا ہوا تھا اور چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔ جس طرف پانی کا جھرنا تھا اسی طرف سے تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک جھینگر کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ میں ایک عجیب کش مکش کی حالت میں تھا۔ کبھی لگتا کہ کاویری جمیلہ کو لے کر آ جائے گی۔ کبھی لگتا کہ نہ وہ آئے گی' نہ جمیلہ ہی آئے گی۔ اس خیال سے دل اتھاہ غم میں ڈوب سا جاتا اور میں بے اختیار ٹھنڈا سانس بھر کر رہ جاتا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں یہ دن بھی دیکھنے پڑیں گے اور میری تقدیر میں یہ ہولناک واقعات بھی لکھے ہوئے ہیں۔

رات گزر رہی تھی۔ آسمان پر بادل ہی بادل تھے۔ جو نظر نہیں آ رہے تھے۔ اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ میری نظریں بار بار اسی طرف اٹھ جاتیں جدھر کاویری درختوں کے اندھیرے میں غائب ہو گئی تھی۔ اسے اسی جگہ سے میری بیوی کو لے کر واپس آنا تھا۔ مگر ابھی تک اس کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ کافی وقت گزر گیا۔ میں بے چین ہو کر کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا' کبھی بیٹھ جاتا۔ ایک دفعہ جو میری نگاہ درختوں کی طرف گئی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے اندھیرے میں سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ میں آنکھیں پھاڑے اس طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ سایہ اندھیرے میں میری طرف آ رہا تھا۔ پھر مجھے ایسے لگا جیسے یہ دو سائے ہیں جو ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ کیا کاویری میری بیوی کو ساتھ لے آئی ہے؟ دونوں سائے چبوترے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب دونوں سائے چبوترے کے پاس آئے تو میں نے اپنی بیوی جمیلہ کو پہچان لیا۔ اس کی شکل اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر میں نے اس کی چال سے اسے

پہچان لیا۔

میں بے تاب ہو کر چبوترے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ کاویری اس کے ساتھ تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"اوپر ہی رہو۔"

میں وہیں رک گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری بیوی کی چال میں ایک قسم کی نقاہت سی ہے۔ اس نے کاویری کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ میرے سامنے آتے ہی میری بیوی روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا بدن تیز ہوا میں لرزنے والی ٹہنی کی طرح کانپ رہا تھا۔ مجھے اس کے جسم سے عجیب نامانوس کی بو آئی۔ اس وقت میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ وہ پنجابی میں کہنے لگی۔

"اس سے تو میں مرجاتی تو اچھا تھا۔ مرجاتی تو اچھا تھا۔"

میں اس کو پیار سے تسلیاں دینے لگا۔

"جو ہونا تھا ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے ہم ایک بار پھر مل گئے۔ اب کچھ نہیں ہو گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

کاویری ہمارے پاس کھڑی بار بار جنگل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔ اب نکل چلو۔" جمیلہ نے مجھ سے کہا وہ مجھ سے چلا نہیں جاتا۔

میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"میں تمہیں سہارا دوں گا۔ ذرا ہمت سے کام لو۔ بس ایک جنگل عبور کرنا ہے پھر ہم ریل گاڑی میں بیٹھ کر دلی پہنچ جائیں گے۔"

جمیلہ نے سرد سانس بھر کر کہا۔

"اب کیا فائدہ ہے' اب کیا فائدہ ہے۔"

میری سمجھ میں یہی آیا کہ وہ جن حالت میں گزر کر آئی ہے۔ یہ انہی سنگین حالات کا اثر ہے اور یہ حقیقت بھی تھی۔ میں اسے سہارا دے کر چبوترے کی سیڑھیوں پر سے نیچے لے آیا۔ کاویری ہماری آگے آگے تھی۔ نیچے آتے ہی کاویری ایک طرف کو مڑ گئی۔ جمیلہ

پہلے سے کچھ دبلی ہو گئی تھی۔ وہ میری آغوش میں سے نکل آئی۔ کہنے۔

"میں خود چلوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔"

تاریک جنگل کی رات میں ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ لیکن یہ سفر کامیابی کی منزل کی طرف تھا۔ میں اپنی بیوی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جمیلہ کو میں اپنے ساتھ لے کر چل رہا تھا۔ اس مختصر سے لمحے میں ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ جمیلہ میں کچھ تبدیلی ضرور واقع ہوئی ہے۔ کسی کسی وقت چلتے چلتے وہ گردن موڑ کر پیچھے دیکھ لیتی تھی۔ ایک بار اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میں نے اسے کہا۔

"جمیلہ! فکر نہ کرو۔ ہم خطرے سے باہر ہو چکے ہیں۔ ہمارے پیچھے کوئی نہیں آ رہا۔"

کاویری ہم سے صرف ایک قدم آگے چل رہی تھی۔ اس نے میرا جملہ سنا تو پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا۔ اس نے کوئی بات نہ کی اور چلتی چلی گئی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کاویری جانتی تھی کہ جمیلہ بار بار پیچھے مڑ کر سنتھا ولی کے مٹھ کی طرف کیوں دیکھتی ہے۔ عجیب پر اسرار سا ماحول بن گیا تھا۔ میں اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھا کہ سنتھا ولی کے مٹھ میں میری بیوی پر پجاری پپیروں نے بڑے منتر پھونکے ہیں۔ اس کے جسم پر نہ جانے کتنی راتوں کو کیسے کیسے زہریلے سانپ چلائے ہیں۔ کاویری نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ ان ساری رسومات کے بعد تمہاری بیوی آدھی ناگن بن چکی ہے۔ اس میں سانپوں والی خصلت پیدا ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس کا انسانی پہلو اس کی ناگنوں والی خصلت پر ابھی تک غالب ہے۔ لیکن آگے چل کر ناگ منتروں کا طلسم اپنا اثر دکھا سکتا ہے۔ اس وجہ سے بھی میں پریشان تھا لیکن میرا خدا پر کامل یقین تھا اور میں نے عہد کر رکھا تھا کہ جمیلہ پر اگر کسی منتر کا طلسمی اثر ہو بھی گیا ہے تو میں اسے اپنی قوت ارادی سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گا۔

ہم ایک کھائی میں اتر گئے۔

کاویری نے کہا۔

"اس کھائی کے آگے چھوٹی نہر ہے جس کے پار جٹا دھاریوں کا جنگل ہے۔ اس جنگل میں سے گزر گئے تو پھر ہمیں اپنے دشمنوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔"

مجھے ایسے لگا جیسے جمیلہ چلتے چلتے تھک گئی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تھک گئی ہو تو ہم یہاں رک جاتے ہیں۔"

جمیلہ ذرا جھک کر چل رہی تھی۔ وہ یک دم سیدھی ہو گئی کہنے لگی۔

"نہیں میں بالکل نہیں تھکی۔"

جب ہم کھائی سے نکل کر چھوٹی نہر پر آئے تو جمیلہ نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے گھنا جنگل تھا۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔

"پیچھے کیا دیکھ رہی ہو؟"

جمیلہ کا چہرہ اندھیری رات میں اس وقت مجھے عجیب اجنبی سا لگا۔ اس نے سانس بھر کر کہا۔

"کچھ نہیں۔ تم کیوں پوچھتے ہو؟"

اس طرح کا جواب مجھے جمیلہ نے کبھی نہیں دیا تھا۔ میں شرمندہ سا ہو گیا۔ میں نے کھسیانا سا ہو کر کہا۔"

"ویسے ہی خیال آیا کہ تم پیچھے مڑ مڑ کر کیوں دیکھتی ہو۔ خیر کوئی بات نہیں اب ہم سٹیشن سے زیادہ دور نہیں ہیں۔"

کاویری نہر کے کنارے چلتے چلتے رک کر بولی۔

"آگے چھوٹا سا پل ہے۔ ہم وہاں سے نہر پار کریں گے۔"

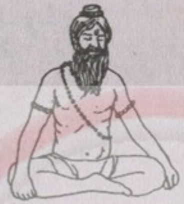

پل پر سے نہر پار کر کے ہم جٹا دھاریوں کے جنگل میں داخل ہو گئے۔ ہمارے فرار کا یہ آخری خطرناک مرحلہ تھا۔ کاویری نے خبردار کیا تھا کہ یہ جنگل پجاری سپریوں کی آخری سرحد ہے اور یہاں انہوں نے ہر قسم کے زہریلے سانپ چھوڑ رکھے ہیں۔ ان کے ڈر سے یہاں دن کے وقت بھی کوئی آدمی داخل نہیں ہوتا۔ جنگل میں داخل ہونے سے پہلے میں نے کاویری سے پوچھا کہ کیا کوئی راستہ نہیں ہے جہاں سے گزر کر ہم ڈھایا گڑھ کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ جائیں۔ اس نے کہا یہ خطرناک جنگل مشرق اور مغرب کی طرف دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم جس طرف سے بھی جائیں گے ہمیں اس جنگل میں سے ضرور گزرنا پڑے گا۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

جمیلہ چپ چپ سی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چلنے کے انداز سے لگتا تھا کہ اس کے دل میں جنگلوں اور ان میں چھوڑے ہوئے زہریلے سانپوں کا کوئی خوف نہیں ہے۔ یہ بہت بڑی تبدیلی تھی جو میری بیوی میں پیدا ہو گئی تھی ورنہ پہلے وہ سانپ کا نام سن کر ہی کانپ جاتی تھی اور گھر کے اندھیرے کمرے میں بھی جاتے ڈرا کرتی تھی۔ کاویری آگے آگے تھی۔ وہ تھوڑی دور چلنے کے بعد رک کر فضا کو سونگھ لیتی تھی۔ ایک دو بار اس نے منہ سے سانپ کی سیٹی کی آواز بھی نکالی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس سیٹی کی

تھی۔

جٹا دھاریوں کے جنگل کا پھیلاؤ شمال جنوب کی طرف چھ کوس سے زیادہ نہیں تھا۔ کاویری ہمیں ایک آسان اور مختصر راستے سے لے جا رہی تھی جو گھاٹیوں اور کھڈوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ جمیلہ نے اس علاقے کا پہناوا ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ وہاں کی عورتوں کے انداز میں اس نے بالوں کا جوڑا پیچھے باندھ رکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ شروع شروع میں جب وہ میرے پاس آئی تھی تو اس پر ہلکی سی نقاہت طاری تھی مگر اب وہ بالکل چاق و چوبند نظر آ رہی تھی۔ یہ بات بھی میرے لیے بڑی حیران کن تھی۔ وہ وقت ان باتوں کی طرف دھیان دینے کا نہیں تھا۔ اس وقت مجھے صرف ایک ہی تشویش تھی کہ جس طرح بھی ہو اس خطرناک جنگل میں سے نکل جائیں۔ جنگل میں کہیں درخت ہی درخت آ جاتے، کہیں صرف اونچی اونچی جھاڑیاں آ جاتیں اور درخت ایک طرف ہٹ جاتے۔ کاویری ہماری راہنمائی کر رہی تھی۔

ایک جگہ کاویری ایک دم رک گئی۔ ہم بھی رک گئے۔ جنگل کے اندھیرے میں کاویری کی چمکیلی آنکھیں بڑے تجسس سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے کاویری؟"

اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ جنگل کی خاموشی میں کسی آواز کو سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بار بار سانس اوپر کھینچ کر فضا بھی سونگھ رہی تھی۔ اس نے ہمیں جھاڑیوں کی اوٹ میں بٹھا دیا اور جھک کر آہستہ سے کہا۔

"لگتا ہے میرا دشمن سانپ ہمارے بہت قریب آ گیا ہے۔ اگر میں تمہارے ساتھ ساتھ چلتی رہی تو وہ میرے ساتھ تم دونوں کو بھی ہلاک کر دے گا۔"

"ہم راستہ بدل لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ سرگوشی میں بولی۔

"اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ صرف ایک ہی صورت ہے میں پیچھے جاتی ہوں اور دشمن

سانپ کو یہاں سے دوسری طرف لے جاتی ہوں۔ جس طرف میں جاؤں گی وہ میری بو پر اسی طرف آئے گا۔ میں اسے جنگل کے دلدلی علاقے کی طرف لے جاؤں گی۔ دلدل کی بو رات کے وقت بڑی تیز ہو جاتی ہے یہ بو میرے جسم کی بو کو فضا میں زائل کر دے گی۔ یوں دشمن سانپ بھٹک جائے گا۔ تم دونوں اسی جگہ بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔ میں سانپ کو غلط راستے پر ڈال کر اوپر سے ہو کر تمہارے پاس آ جاؤں گی۔ اگر ایک آدھ گھنٹے تک میں نہ آئی تو تم دونوں یہاں سے نکل جانا۔ ڈھایا گڑھ کا سٹیشن جنگل سے نکلتے ہی تھوڑے فاصلے پر ہے۔ تم میرا انتظار نہ کرنا۔"

اس سے پہلے کہ میں کاویری سے مزید کوئی بات کرتا وہ تیزی سے جنگل میں ایک طرف اندھیرے میں گم ہو گئی۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"کاویری بڑی بہادر اور ہماری بڑی ہمدرد لڑکی ہے۔ اگر مجھے یہ نہ ملتی تو میں تمہیں دوبارا حاصل نہیں کر سکتا تھا۔"

جمیلہ نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے ڈر ہے کاویری واپس نہ آ سکے گی۔ ناگ دیوی کا سانپ جو اس کے پیچھے لگا ہے اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے جمیلہ سے کہا۔

"کاویری نے مجھے بتایا تھا کہ سنتھاولی مٹھ سے اگر کوئی ناگ داسی فرار ہو جائے تو سانپ اس کا پیچھا کرتے ہیں کیا کوئی سانپ تمہارا ابھی پیچھا کر رہا ہو گا؟"

کاویری نے تو مجھے بڑے اعتماد سے بتایا تھا کہ اگر جمیلہ مٹھ سے فرار ہو گئی تو نہ صرف مٹھ کا سانپ اس کا تعاقب شروع کر دے گا بلکہ مٹھ کا پجاری سپیرا بھی اس کے پیچھے لگ جائے گا لیکن میں جمیلہ کی زبان سے اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اس نے میری بات سن کر پہلے تو کوئی جواب نہ دیا اور چپ بیٹھی جنگل کے اندھیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ جب میں نے اپنے سوال کو دہرایا تو وہ خشک سی آواز میں بولی۔

"کاویری نے ٹھیک کہا تھا۔"

میں نے کہا۔

"پھر تو ہم بھی یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ ہمیں یہاں نہیں رکنا چاہیے تھا۔"

جمیلہ نے اسی پراسرار اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ہمیں ہر حالت میں کاویری کا انتظار کرنا ہو گا۔"

جمیلہ آخر میری بیوی تھی۔ کوئی غیر یا اجنبی عورت نہیں تھی۔ مجھے اس کے بارے میں تشویش تھی۔ کاویری نے اس پر پھونکے گئے سانپ کے منتروں کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا تھا اس کی وجہ سے میری تشویش میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ جمیلہ آگے چل کر کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ اس وقت ہم دونوں اکیلے تھے۔ میں نے جمیلہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

"تم تو جانتی ہی ہو مجھے تم سے کتنا پیار ہے اور مجھے تمہاری زندگی کس قدر عزیز ہے۔ یہ تمہارا پیار ہی تھا جو مجھے چلتی تلواروں میں ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرواتا تمہارے پاس لے آیا ہے۔"

جمیلہ نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے میں بھی تم سے اتنا ہی پیار کرتی ہوں۔"

میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ جمیلہ اس وقت مجھے بالکل نارمل حالت میں لگ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"کاویری کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان لوگوں نے تم پر کچھ منتر بھی پھونکے ہیں اور پجاری دیوگری کے مندر میں رات بھر تمہارے ننگے بدن پر سانپ کو بھی پھرایا گیا ہے۔"

جمیلہ نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ان منتروں کا اور سانپ کے تمہارے جسم پر پھرنے کا تم پر کوئی اثر تو نہیں ہوگیا؟"

جمیلہ چپ رہی۔ میں نے جمیلہ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"میری جان! میں یہ صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔"

میں نے جمیلہ کو اپنے ساتھ ضرور لگالیا تھا مگر میں نے محسوس کرلیا کہ اس میں وہ پہلے والی گرم جوشی نہیں تھی بلکہ وہ مجھ سے اپنا جسم بے معلوم انداز میں چھڑانے کی کوشش کررہی تھی۔ جب میں نے اپنے سوال کو دہرایا تو اس نے کہا۔

"نہیں۔ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔"

کیا تم میرے ساتھ جانے پر خوش ہو ناں؟"

اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ خوش ہوں۔"

پھر اس نے اپنا چہرہ اونچا کرلیا اور بولی۔

"ہمارے آس پاس کوئی سانپ ہے۔"

میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ جیسے اسے سانپ کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں جمیلہ، آؤ کوئی دوسری جگہ ڈھونڈھتے ہیں۔ یہاں کے سانپ بڑے زہریلے ہیں۔"

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ کہنے لگی۔

"کاویری نے ہمیں یہاں بیٹھنے کو کہا ہے۔ ہمیں یہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن تم نے خود بتایا ہے کہ یہاں کوئی سانپ موجود ہے۔"

وہ بولی۔

"فکر نہ کرو۔ سانپ ہمیں کچھ نہیں کہے گا۔"

وہ اندھیرے میں جیسے بیٹھی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ میری مردانہ غیرت نے گوارا نہ کیا کہ بیوی وہیں بیٹھی ہو اور میں سانپ کے ڈر سے بھاگ جاؤں۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہاں کوئی سانپ ہے؟"

مجھے معلوم تھا کہ اس نے فضا میں سانپ کی بو سونگھی تھی۔ مگر میں یہ بات جمیلہ کی زبانی کہلوانا چاہتا تھا۔ کہنے لگی۔

"اس قسم کے سوال نہ ہی پوچھو تو بہتر ہے۔"

"کیوں نہ پوچھوں؟" میں نے کسی قدر خفگی سے کہا۔ "کیا میں تمہارا جیون ساتھی نہیں ہوں؟ کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں ہے؟"

جمیلہ نے سر جھکایا ہوا تھا۔ میری بات سن کر اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر مجھے گھور کر دیکھا۔ وہ چند لمحے بالکل ساکت ہو کر مجھے دیکھتی رہی۔ اندھیرے میں مجھے اس کی آنکھیں اس طرح چمکتی دکھائی دے رہی تھیں جیسے اس کی آنکھوں میں ہیرے موتی جڑے ہوئے ہوں۔ آہستہ سے کہنے لگی۔

"سانپوں میں رہ کر مجھے سانپوں کی بو آجاتی ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے دوسرا سوال کردیا۔

میں نے سنا ہے کہ سنتا ولی مٹھ سے جو عورت فرار ہوتی ہے ایک سانپ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے اور موقع پا کر اسے ڈس لیتا ہے۔ مجھے تمہاری زندگی کی فکر ہے جمیلہ۔ کیا یہ سچ ہے؟"

جمیلہ نے جنگل کی تاریکی میں اس طرف دیکھا جس طرف کاویری گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ سانپ ہمیں کچھ نہیں کہے گا۔ اس کی تم فکر مت کرو۔"

اچانک اس نے موضوع بدلتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"ہم پاکستان کا بارڈر کس طرح کراس کریں گے؟ پاکستان باڈر فورس کے آدمی ہم پر فائرنگ نہیں کریں گے؟"

میں نے کہا۔ "بارڈر کراس کرانا میرا کام ہے تم بے فکر رہو۔"

وہ بڑبڑائی۔

"بارڈر پر تو اس وقت دونوں طرف فوجیں بیٹھی ہیں۔ فوج کے مورچوں سے بچ کر نکل جانا ناممکن ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ آخر ہمیں اپنے ملک پاکستان بھی تو جانا ہے۔"

وہ بڑے سکون سے کہنے لگی۔

"ایک بار پھر سوچ لو۔ سانپوں سے تو ہم شاید بچ جائیں مگر فوج کی فائرنگ سے بچنا مشکل ہے۔"

اس کی باتوں سے مجھے ہلکا سا شبہ ہوا کہ وہ انڈیا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔ جب میں نے اس سے اس بارے میں سوال کیا تو وہ کہنے لگی۔

"انڈیا ہمارا ملک نہیں ہے۔ بھلا میں یہاں کیوں رہنے لگی؟"

ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کاویری ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا کہ وہ کسی حادثہ کا شکار نہ ہو گئی ہو۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"کاویری نے اتنی دیر کہاں لگا دی ہے۔"

وہ کہنے لگی۔

"میرا نہیں خیال کہ اب وہ واپس آئے۔ وہ جس سانپ کی بو سونگھ کر اس سے پیچھا چھڑانے گئی تھی وہ کاویری سے ہزار گنا زیادہ چالاک سانپ ہے۔ اس نے کاویری کو مار دیا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"ہم تھوڑی دیر اور انتظار کر لیتے ہیں۔"

کہنے لگی۔

"میں اسے تلاش کرنے جاتی ہوں۔"

اس نے جس اشتیاق سے یہ بات کہی تھی اس سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ واپس سنتھا ولی جنگل میں جانے کو بے تاب ہے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ اسے سنتھا ولی مٹھ کے سانپ واپس بلا رہے تھے۔ اب تک اس کے پیچھے کوئی سانپ یا پجاری سپیرا نہیں لگا تھا۔ اس لیے کہ ابھی وہ سنتھا ولی مٹھ کے حدود کے اندر تھی۔ کاویری کے کہنے کے مطابق جٹا دھاریوں کے جنگل کے بعد سنتھا ولی مٹھ کی سرحد ختم ہو جاتی تھی۔ جیسے ہی ہم جٹا دھاریوں کے جنگل سے باہر آئیں گے مٹھ کے پجاری اور سانپ سو بھی رہے ہوں گے تو انہیں کوئی غیبی طاقت جگا کر خبردار کر دے گی کہ مٹھ کی کوئی ناگ داسی فرار ہو گئی ہے۔ میں نے جمیلہ کو بڑے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟ تمہارے دشمن سارے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ چلو ہم یہاں سے آگے چلتے ہیں۔ کاویری نے خود کہا تھا کہ اگر مجھے زیادہ دیر ہو گئی تو تم دونوں نکل جانا۔ میرا انتظار نہ کرنا۔ آؤ آگے روانہ ہوتے ہیں۔ صبح ہونے والی ہے۔"

جمیلہ میرے اصرار پر اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے ساتھ چلنے لگی۔ مجھے کاویری نے بتایا تھا کہ جٹا دھاری جنگل آگے ختم ہونے والا ہے۔ اس کے بعد ایک ریلوے لائین ملے گی جو سیدھی ڈھایا گڑھ کے ریلوے سٹیشن کو جاتی ہو گی۔ اب ہم تیز تیز چل رہے تھے، جنگل بھی ختم ہونے کو تھا۔ درختوں کے جھنڈ چھٹنے لگے تھے۔ آخر ہم جنگل سے باہر آ گئے۔ جنگل سے باہر نکلتے ہی مجھے خوشی بھی ہوئی اور فکر بھی لگ گئی۔ خوشی اس لیے ہوئی کہ خطرناک جنگل کی مصیبت سے نجات مل گئی ہے۔ فکر یہ لگی کہ ہم سنتھا ولی مٹھ کے جنگل کی سرحد پار کر آئے ہیں اور اگر کاویری کا کہنا صحیح ہے تو پیچھے سنتھا ولی کے سانپوں اور پجاری سپیروں کو جمیلہ کے فرار کا علم ہو گیا ہو گا اور کوئی نہ کوئی سانپ یا سپیرا جمیلہ کی بو پر اس کے پیچھے چل پڑا ہو گا۔

جنگل کے ختم ہوتے ہی ایک میدان پھیلا ہوا تھا۔ آگے ایک اونچی جگہ تھی۔ ہم اس پر چڑھ گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ یہ وہاں ریل کی پٹڑی بچھی ہوئی تھی۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"یہی ریل کی پٹڑی ڈھالیا گڑھ سٹیشن کو جاتی ہے۔"

ہم ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ رات کی تاریکی میں چھائے ہوئے بادلوں کے پیچھے صبح کاذب کی ہلکی ہلکی روشنی جھلکنا شروع ہو گئی تھی۔ مجھے کاویری ایسی بہادر اور ہمدرد لڑکی سے بچھڑ جانے کا افسوس تھا لیکن اس نے خود کہا تھا کہ ایک خاص وقت گزر جانے کے بعد میرا انتظار نہ کرنا اور جمیلہ کو لے کر وہاں سے نکل جانا۔ اس لیے مجبوراً مجھے جمیلہ کو لے کر وہاں سے نکلنا پڑا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو کاویری کے کہنے کے باوجود جنگل میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا اور بہت ممکن تھا کہ خود اس کی تلاش میں نکل پڑتا۔ لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ کاویری کو اس کے دشمن سانپ نے ہلاک نہیں کیا ہو گا۔ سنتھاولی جنگل کی سرحد پار کر آنے کے بعد خود مجھے جمیلہ کی فکر پڑ گئی تھی۔ کیونکہ ایک دشمن سانپ یا دشمن پجاری سپیرا اسے پکڑنے یا مار ڈالنے کے لیے اس کے بھی پیچھے لگ گیا تھا۔ تاہم ریل کی پٹڑی اور دور سے ریلوے سگنل کی روشنی کو دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں مہذب دنیا میں آ گیا ہوں اور اب اس قسم کے توہمات فضول ہیں۔

میں نے جمیلہ کو بتایا کہ میرے پاس ایک کمانڈو چاقو اور ایک بھرا ہوا ریوالور بھی ہے۔ وہ کہنے لگی۔

"ان چیزوں کو پھنک دو۔ پولیس کو معلوم ہو گیا تو وہ ہمیں پکڑ لے گی۔ ہم پہلے ہی انڈیا میں بغیر پاسپورٹ کے داخل ہوئے ہیں اور تمہیں تو انڈیا کی ملٹری پولیس بھی تلاس کر رہی ہو گی کیونکہ وہ تمہیں پاکستانی فوج کا مفرور قیدی سمجھتی ہے۔"

میں نے جمیلہ کو ساری داستان سنا دی تھی کہ کس طرح مجھے محمد پور واپس آ کر معلوم

تمہیں اٹھا کر لے گئے ہیں۔ پھر میں کس طرح بنگلہ دیش کے بارڈر پر پکڑا گیا اور بھارتی فوجیوں نے مجھے پاک آرمی کا فوجی سمجھ کر جنگی قیدیوں کی گاڑی میں بند کر دیا اور پھر کس طرح جب ٹرین انڈیا میں پہنچی تو میں نے رات کے اندھیرے میں ٹرین کی کھڑکی میں سے چھلانگ لگا دی تھی۔

میں نے جمیلہ سے کہا۔

"میں ابھی ریوالور اور چاقو اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تو میں ریوالور کہیں پھینک دوں گا لیکن چاقو اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ یہ شکاری چاقو ہے۔ اس پر پولیس کو کوئی شک نہیں پڑے گا۔"

چاروں طرف پو پھٹنے کی ہلکی نیلی روشنی پھیل رہی تھی۔

ڈھالیا گڑھ کے سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے صبح ہو گئی۔ سورج کی روشنی نے جنگل کے توہمات میرے ذہن سے جالوں کی طرح صاف کر دیئے۔ میں نے اپنی بیوی کو حاصل کر لیا تھا۔ اب مجھے ناگ دیوی کے مندر اور اس کے سانپ اور پجاری سپیرے اور ان کی جاہلانہ رسومات بے حقیقت لگنے لگی تھیں۔ ڈھالیا گڑھ کا سٹیشن تقریباً خالی پڑا تھا۔ معمولی سا دیہاتی سٹیشن تھا جہاں ایک بھی مسافر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں کوئی میل ٹرین نہیں ٹھہرتی۔ برانچ لائن کا سٹیشن ہے۔ صرف دو پسنجر ٹرینیں آتی ہیں۔ ایک دن کے سوا دس بجے اور دوسری رات کو آتی ہے۔ میں جمیلہ کو لیے پلیٹ فارم پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

جب دن کافی چڑھ آیا تو پلیٹ فارم پر کچھ دیہاتی قسم کے مسافر نظر آنے لگے۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔ شاید کچھ کھانے پینے کو مل جائے۔ تم یہاں سے مت ہلنا۔"

سٹیشن سے باہر ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ یہاں سے میں نے دو بند مکھن اور چائے کے مٹی کے گلاس لیے اور جمیلہ کے پاس آ گیا۔ ہم نے زمین پر بیٹھے بیٹھے ناشتہ کیا۔ دن

میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ وہ اتنی کمزور کیوں ہو گئی ہے۔ یہ پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ قریبی نلکے پر ہم نے منہ ہاتھ دھویا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ جب ٹرین آنے میں آدھا گھنٹہ رہ گیا تو میں ٹکٹ لینے پلیٹ فارم سے باہر آ گیا۔ بکنگ کلرک نے بتایا کہ وہاں سے کوئی گاڑی سیدھی دلی نہیں جاتی۔ معلوم ہوا کہ یہ گاڑی مجھے بلاس پور تک لے جائے گی۔ بلاس پور سے مجھے جبل پور والی گاڑی پکڑنی ہو گی۔ جبل پور سے دلی جانے والی گاڑی مل جائے گی میں نے دو ٹکٹ دلی کے لے لیے۔

ٹرین لیٹ تھی۔ جب آئی تو مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ اس میں کوئی زنانہ ڈبہ نہیں تھا۔ میرے پاس تھرڈ کلاس کے ٹکٹ تھے۔ تھرڈ کلاس کے ٹکٹ میں نے اس لیے خریدے تھے کہ یہ کلاس ایک مفرور قیدی کے لیے نسبتاً" محفوظ ہوتی ہے۔ ہم بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گئے۔ یہ سفر بھی کافی لمبا سفر تھا۔ بہرحال پہلے ہم بلاس پور پہنچے وہاں سے جبل پور جانے والی گاڑی پکڑی، جبل پور بڑا شہر تھا۔ ہم رات کے وقت جبل پور پہنچے تھے۔ پلیٹ فارم پر پولیس کے سپاہی چل پھر رہے تھے۔ ایک جگہ میں نے انڈین ملٹری پولیس کے جوان بھی دیکھے۔ میں محتاط ہو گیا۔ ریوالور ابھی تک میری پتلون کی جیب میں تھا۔ اسے پھینکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اپنے بچاؤ کے لیے یہی ایک کارگر ہتھیار تھا۔ جب تک دلی جانے والی گاڑی نہیں آئی میں اور جمیلہ پلیٹ فارم پر ہی دوسرے مسافروں کے درمیان چھپ کر بیٹھے رہے۔ اس طرح کسی پولیس کے سپاہی کو ہم پر شک نہیں پڑ سکتا تھا۔ دلی جانے والی گاڑی رات کے دو بجے آئی۔ ہم دونوں اس میں سوار ہو کر دلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

ساری رات اور اگلا دن سفر میں گزر گیا۔ راستے میں بھارت کے جبل پور، کان پور اور الہ آباد ایسے کئی بڑے شہر آئے۔ ریوالور ابھی تک میری جیب میں تھا۔ میں نے احتیاطاً" اسے پتلون کی جیب سے نکال کر جیکٹ کی اندر والی جیب میں رکھ لیا تھا۔ راستے میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آیا جس سے مجھے احساس ہوتا کہ میں انٹیلی جینس والوں کی نظروں میں آ گیا ہوں۔ ڈھاکہ فال کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور مشرقی پاکستان سے فرار

ہو کر بہاری اور دوسرے غیر بنگالی بھارت میں داخل ہو رہے تھے اور سی آئی ڈی ان کی تلاش میں رہتی تھی۔ الہ آباد کے سٹیشن پر میں پلیٹ فارم پر تھوڑی دیر کے لیے اترا تو میں نے ایک سویلین کپڑوں والے آدمی کو دیکھا۔ میری تجربہ کار نظروں نے اسے فوراً" پہچان لیا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے مگر اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ میں دوسری طرف سے ہو کر ڈبے میں چڑھ گیا تھا۔

ٹرین دلی سٹیشن میں داخل ہوئی تو میں نے جمیلہ سے کہا۔

"یہاں ہم زیادہ دن نہیں ٹھہریں گے۔ مشتاق علی صاحب ہمیں کسی نہ کسی طرح پاکستان بھجوانے کا ضرور انتظام کر دیں گے۔"

جمیلہ خاموش رہی۔ کسی وقت اس کو چپ سی لگ جاتی تھی۔ میں اسے بلاتا تو وہ اس طرح چونک پڑتی جیسے کسی گہرے خیال میں گم ہو۔ اس میں یہ بھی ایک نمایاں تبدیلی آ گئی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ پاکستان پہنچنے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہاں وہ اپنے لوگوں سے ملے گی تو بھارت میں گزارے ہوئے ڈراؤنے دنوں کی یاد اس کے دل سے محو ہو جائے گی۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ رات کے آٹھ سوا آٹھ بج رہے تھے۔ جب ٹرین دلی پہنچی۔ پہلے میں نے سوچا کہ جمیلہ کو ساتھ لے کر سیدھا مشتاق صاحب کے ہوٹل چلا جاتا ہوں۔ پھر اچانک خیال آگیا کہ مشتاق صاحب کے ہوٹل میں ممکن ہے دلی کے سب سے بڑے جرائم پیشہ بدمعاش شری راج کے جاسوس موجود ہوں اور وہ اسے جا کر خبر کر دیں کہ جس عورت کو آپ نے اپنے گورو دیوگری کے حوالے کیا تھا وہ مشتاق صاحب کے ہوٹل میں واپس آ گئی ہے۔ میں نے جمیلہ کو عورتوں کے سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں بٹھایا اور خود پلیٹ فارم پر آ کر مشتاق صاحب کو فون کیا۔ وہ ہوٹل میں موجود تھے۔ میری آواز پہچان گئے۔ کہنے لگے۔

"کب آئے ہو؟"

میری بیوی جمیلہ بھی میرے ساتھ ہے تو انہوں نے پہلا سوال یہی کیا کہ تمہارے آس پاس تو کوئی موجود نہیں ہے؟ میں نے کہا کہ میں ٹیلی فون بوتھ میں ہوں اور اکیلا ہوں۔ وہ بولے۔

"تم نے بڑی عقلمندی کی کہ سیدھا ہوٹل نہیں آ گئے۔ اب تم ایسا کرو کہ پلیٹ فارم پر ٹیلی فون بوتھ کے پاس ہی رہو۔ میں آ رہا ہوں۔"

انہوں نے مجھ سے پلیٹ فارم کا نمبر پوچھا اور فون بند کر دیا۔ میں نے ویٹنگ روم میں جا کر جمیلہ کو بتایا کہ میرے دوست مشتاق صاحب ہمیں لینے آ رہے ہیں۔ جمیلہ نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ میں نے کہا۔

"وہ پلیٹ فارم پر آئیں گے۔ میں باہر جاتا ہوں۔ تم آرام سے بیٹھی رہو۔"

آدھے گھنٹے کے بعد مشتاق صاحب آ گئے۔ آتے ہی بولے۔

"تمہاری بیگم کہاں ہیں؟"

میں نے کہا۔ "ویٹنگ روم میں ہے۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"سٹیشن کے سامنے بائیں جانب ہارڈنگ لائبریری ہے۔ تم نے دیکھی ہے؟"

"جی ہاں، مجھے معلوم ہے۔"

"بس میں گاڑی لے کر لائبریری کے گیٹ کے پاس ہوں گا۔ تم جمیلہ بھابھی کو لے کر وہاں آ جاؤ۔"

اتنا کہہ کر مشتاق صاحب پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف چل دیے۔ میں نے ویٹنگ روم میں آ کر جمیلہ کو ساتھ لیا اور گیٹ کی طرف بڑھا۔ چلنے سے پہلے میں نے ماحول کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں ریلوے سٹیشن کے سنتری ضرور ادھر ادھر کھڑے تھے مگر ملٹری پولیس کا کوئی جوان نہیں تھا۔ جمیلہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وہ ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ ہندو عورت لگتی تھی۔ پلیٹ فارم کے گیٹ پر ٹکٹ چیکر کو میں نے دونوں ٹکٹ دیے تو قریب ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے سگریٹ پیتے ہوئے ہمیں غور سے دیکھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ یہ انٹیلی جینس کا آدمی ہے۔ میں نے ذرا سی بھی گھبراہٹ کا اظہار نہ کیا۔ ٹکٹ چیکر سکھ تھا۔ وہ ہمارے ٹکٹ لینے کے بعد ہمارے پیچھے آنے والے مسافروں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

میں جمیلہ کے ساتھ بڑے سکون سے چلتا سٹیشن کی ڈیوڑھی میں آ گیا جہاں بہت مسافر تھے اور شور سا مچا ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ انٹیلی جینس والے کی نظریں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ نیچے گرا دیا۔ جمیلہ رک گئی۔ میں نے لفافہ اٹھانے کے بہانے پیچھے گیٹ پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ وہ آدمی کرسی پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں مطمئن ہو گیا کہ اس شخص کی نگاہوں میں نہیں آیا۔ سٹیشن سے باہر آ کر میں بائیں جانب ہو گیا۔ ہر طرف روشنیاں تھیں۔ سڑک پر بہت ٹریفک تھی۔ لیڈی ہارڈنگ لائبریری سٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ہم فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لائبریری کے قریب آ گئے۔ لائبریری کے بڑے گیٹ کی ایک جانب پرانے ماڈل کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ گاڑی کے باہر کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں جمیلہ کے ساتھ گاڑی کی طرف بڑھا۔ قریب جا کر دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر مشتاق صاحب بیٹھے تھے۔ کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار کر بولے۔

"دونوں پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

انہوں نے شیشہ اوپر کر دیا۔ کیونکہ دلی میں کافی سردی تھی۔ ہم گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مشتاق صاحب نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ گاڑی سٹیشن سے نکل کر دلی کی سڑکوں پر آئی تو مشتاق صاحب نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھابھی جان آداب۔"

میں نے جمیلہ کو کہنی ماری۔ جمیلہ ایک بار پھر کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ چونک پڑی۔ میں نے کہا۔

"مشتاق صاحب نے سلام کیا ہے۔"

جمیلہ نے آہستہ سے وعلیکم السلام کہا اور خاموش ہو گئی۔ مشتاق صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

"تم نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا ہے کرم داد! تمہاری داستان آرام سے بیٹھ کر سنوں گا۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا ہم ہوٹل جا رہے ہیں؟"

"نہیں" انہوں نے کہا۔ "جمیلہ بھابھی کو ساتھ لے کر تمہارا ہوٹل میں ٹھہرنا خطرناک بات ہوگی۔ ہوٹل شری راج کے آدمی آتے جاتے رہتے ہیں۔"

جمیلہ میرے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ شری راج کا نام سن کر اس نے ایک جھرجھری سی لی تھی۔ وہ بچی تھی۔ شری راج ہی وہ بدمعاش تھا جس کے آدمی جمیلہ کو کلکتے سے خرید کر دلی لے گئے تھے اور شری راج ہی نے جمیلہ کو پجاری دیوگری کے حوالے کیا تھا۔

گاڑی دلی کی روشن روشن سڑکوں پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ میں اس شہر کی سڑکوں سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ گاڑی شہر کی زیادہ ٹریفک والی سڑکوں سے نکل کر ایک نسبتاً کم ٹریفک والی سڑک پر آگئی تھی۔ میں نے مشتاق صاحب سے بالکل نہ پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ظاہر تھا کہ وہ ہمیں کسی ایسی جگہ لے جا رہے ہیں جہاں ہم شری راج اور انٹیلی جینس والوں کی نگاہوں سے محفوظ ہوں گے۔ گاڑی ایسے علاقے سے گزر رہی تھی جہاں دور دور کوٹھیوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ سڑک پر ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ کافی دیر کے بعد گاڑی بڑی سڑک کو چھوڑ کر ایک چھوٹی سڑک پر آگئی۔ یہاں فاصلے فاصلے پر مکانوں کی روشنیاں تھیں۔ اونچے اونچے درخت بھی تھے۔ گاڑی ایک مکان کے آگے رک گئی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ ایک منزلہ مکان تھا۔ آگے دیوار تھی، دیوار میں دروازہ تھا جو بند تھا۔ مکان پر اندھیرا چھایا تھا۔ صرف ایک جانب شاید کچن یا غسل خانے کی بتی جل رہی تھی۔

ہم گاڑی سے باہر آگئے۔ مشتاق صاحب نے کہا۔

بالکل محفوظ ہوگے۔"

مشتاق صاحب نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دوسری بار بٹن دبانے سے اندر برآمدے کی بتی روشن ہوگئی۔ کسی مرد کی آواز آئی۔ "میاں کون ہو؟"

مشتاق صاحب نے کہا۔

"چچا دروازہ کھولو۔"

"آگیا حضور۔"

اور فوراً دروازہ کھل گیا۔ ایک بوڑھے آدمی نے بڑے ادب سے ہمیں سلام کیا اور مشتاق صاحب سے پوچھا۔

"حضور! مہمانوں کا سامان گاڑی میں ہی ہے۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"نہیں چچا خیردین، سامان نہیں ہے۔ تم جا کر بیڈ روم کھول دو۔"

مختصر سا آرام دہ اور الگ تھلگ مکان تھا۔ بیڈ روم میں دو پلنگ ساتھ ساتھ لگے تھے۔ بچھونا بچھا ہوا تھا۔ ملازم خیردین نے بجلی کا ہیٹر اون کر دیا۔ مشتاق صاحب بولے۔

"چچا! مہمانوں کے کھانے کا انتظام کرو۔"

"جی حضور۔"

ملازم چلا گیا۔ جمیلہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس نے صرف ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے شانوں پر کمبل ڈال دیا۔ مشتاق صاحب کہنے لگے۔

"بھابھی کے لیے گرم کپڑوں کا بندوبست ہو جائے گا۔ باتھ روم ساتھ ہی ہے۔ وہاں گرم پانی بھی ہے۔ تم لوگ منہ ہاتھ دھو لو۔ میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔"

مشتاق صاحب کے جانے کے بعد میں نے جمیلہ سے کہا۔

"تم اندر جا کر نہا لو۔ میں تمہارے بعد نہاؤں گا۔"

ہیٹر قریب کر کے پلنگ پر بیٹھا رہا۔ وہ نہانے کے بعد باہر آئی تو بالوں کو تولیے سے خشک کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم بھی نہالو۔"

میں نے بھی غسل کیا۔ گرم پانی نے جسم کو پھر سے تروتازہ کر دیا۔ غسل خانے میں نیا ٹوتھ برش کنگھی تولیہ وغیرہ سب کچھ موجود تھا۔ اتنے میں مشتاق صاحب آ گئے۔ کہنے لگے۔

"تم لوگوں کے لیے نئے کپڑے اب صبح ہی آئیں گے۔ کھانا تیار ہو گیا ہے۔ آؤ کھانا کھالو۔"

ساتھ والے چھوٹے سے کمرے میں زمین پر قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین پر دسترخوان بچھا تھا اور کھانا ملازم نے لگا دیا تھا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں نے مشتاق صاحب کو اپنی ساری رام کہانی سنا دی لیکن جمیلہ کے جسم پر سانپوں کے چلانے اور سانپوں کے منتر پھونکنے کا بالکل ذکر نہ کیا۔ یہی کہا کہ ناگ دیوی کے مندر میں جمیلہ کو پجاری دیوگری نے جمیلہ کو دوسری دیوداسیوں کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ گیا اور جمیلہ کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

مشتاق صاحب میری داستان سن کر بولے۔

"بڑی ہمت کی تم نے کرم داد۔ خدا کا شکر ہے کہ بھابھی کو ان کافروں کی قید سے نجات ملی۔ بس اب تم لوگوں کو صرف اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ بلا ضرورت اس مکان سے باہر نہ جانا۔ بھابھی کے فرار کا شری راج کو ضرور پتہ چل جائے گا۔ دیوگری پجاری چونکہ بدمعاش شری راج کا گرو ہے اس لیے اس کے آدمی بھابھی کی تلاش میں چاروں طرف نکل پڑیں گے۔ شری راج کے بعض آدمیوں نے بھابھی کو دیکھ رکھا ہے۔ اس لیے میں بھابھی کو بھی ہدایت کروں گا کہ بھابھی تم اس مکان کے اندر ہی رہنا۔"

میں نے مشتاق صاحب سے کہا۔

"مشتاق صاحب! آپ کے ہم پر پہلے ہی بڑے احسان ہیں۔ ایک احسان اور کر دیجئے اور ہمیں کسی طرح پاکستان پہنچا دیں۔"

کھانا ہم کھا چکے تھے۔ مشتاق صاحب بولے۔

"میاں ہاتھ دھو لو، بیٹھ کر بات کریں گے۔"

اس وقت بوڑھا ملازم خیردین سلفچی رکھ کر ہمارے ہاتھ دھلا رہا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو ہم دیوار کے ساتھ لگے پرانے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ مشتاق صاحب نے جمیلہ سے کہا۔

"بھابھی! آپ اندر جا کر آرام کریں۔ آپ بہت تھکی ہوئی ہیں۔"

میں نے بھی جمیلہ سے کہا کہ وہ بیڈروم میں جا کر سو جائے۔ جمیلہ اٹھ کر چلی گئی۔ مشتاق صاحب میرے پاس ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ اس کمرے میں بھی بجلی کا ہیٹر چل رہا تھا جس کی وجہ سے کمرے کی فضا سرد نہیں رہی تھی۔ مشتاق صاحب بولے۔

"کرم داد بھائی! تم لوگوں کے پاکستان پہنچانے کا کام اتنا آسان نہیں ہے بلکہ اگر سوچا جائے تو جو حالات اس وقت ہیں ان حالات میں تمہارا بارڈر کراس کرنا ناممکن ہے۔ بھارت اور پاکستان کی جنگ اگرچہ ختم ہو چکی ہے مگر دونوں ملکوں کی فوجیں سرحدوں پر مورچہ بند ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہم پاکستانی سفارت خانے چلے جائیں تو ہماری مشکل حل ہو سکتی ہے۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں حالات کی سنگینی کا بالکل علم نہیں ہے۔ میاں کرم داد! دونوں ملکوں کے سفارت خانے ابھی تک بند ہیں۔ پاکستانی سفارت خانہ کھلا ہوتا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔"

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم بارڈر کراس کرنے کی بجائے یہاں سے برما یا دوبئی کی طرف نکل جائیں۔"

مشتاق صاحب بولے۔

”ہوائی اڈوں اور بندرگاہوں پر بھی چیکنگ بڑی سخت ہوگی۔ وہاں تو تم لوگ فوراً پکڑے جاؤ گے۔ جہاں تک تمہارے انڈیا سے برما کی طرف نکلنے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں حاجی فرید احمد صاحب ہی کچھ بتا سکیں گے۔ کیونکہ وہ کلکتے میں رہتے ہیں اور برما کی طرف بحری جہاز کلکتے کی بندرگاہ سے ہی چلتے ہیں۔ میں ان سے فون پر بات کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اس پوزیشن میں ہوئے تو تمہاری ضرور مدد کریں گے۔ تب تک تم اسی مکان میں رہو۔“

رات دس بجے کے قریب مشتاق صاحب چلے گئے۔ میں بیڈ روم میں گیا تو جمیلہ لحاف اوڑھے گہری نیند سو رہی تھی۔ سونے سے پہلے اس نے بجلی کا ہیٹر بند کر دیا تھا۔ میں دوسرے پلنگ پر لیٹ گیا۔ ذہن میں طرح طرح کی ترکیبیں آ رہی تھیں مگر انڈیا سے کوئی راہ فرار دکھائی نہیں دیتی تھی۔ دوسرے روز میری جلدی آنکھ کھل گئی۔ دن نکلا ہی تھا۔ جمیلہ ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ خیال کیا۔ نہ جانے وہ کب سے جاگ رہی تھی۔ ملازم چچا خیردین کچن میں چائے تیار کر رہا تھا۔ سردی اپنے جوبن پر تھی۔ خیردین نے ناشتے کا پوچھا تو میں نے کہا کہ بیگم سو رہی ہیں۔ اٹھیں گی تو ناشتہ کریں گے۔ میں نے صرف چائے کی ایک پیالی پی اور واپس بیڈروم میں آگیا۔ جمیلہ نے پہلو بدلا۔ میں نے اسے نہ بلایا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے لحاف ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ پھر خود ہی اٹھ بیٹھی۔

میں نے پوچھا۔ ”اب طبیعت کیسی ہے جمیلہ؟“

وہ اپنے بالوں کو پیچھے باندھتے ہوئے بولی۔

”بڑی مدت بعد گہری نیند سوئی ہوں۔ تم کب آئے؟“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے۔“

ہم نے بیڈروم میں ہی ناشتہ کیا۔ میں نے وہ ساری باتیں جمیلہ کو بتا دیں جو میرے اور مشتاق صاحب کے درمیان باڈر کراس کرنے کے سلسلے میں ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ کہنے لگی۔

”کیوں نہ ہم واپس بنگلہ دیش چلے جائیں۔ وہاں کے حالات اب ٹھیک ہو گئے ہوں گے۔ وہاں ہمارا مکان بھی ہے، دکان بھی ہے۔“

میں نے کہا۔

”بنگلہ دیش گئے تو مجھے فوراً گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس طرف واپس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں ایک امید ہے کہ شاید کلکتے والے فرید احمد صاحب ہمارے رنگون کی طرف نکل جانے کا کوئی بندوبست کرا دیں۔ بحری جہاز میں نہ سہی ہم برما کی سرحد بھی کراس کر سکتے ہیں۔ اس طرف تو باڈر سیکورٹی اتنی سخت نہیں ہوگی۔“

جمیلہ نے کوئی جواب نہ دیا، اپنی کوئی رائے ظاہر نہ کی۔ گیارہ بجے مشتاق صاحب گاڑی میں آ گئے۔ وہ جمیلہ کے لیے اور میرے لیے نئے کپڑے لائے تھے۔ کہنے لگے۔

”بھابھی کے لیے میں دو ساڑھیاں ہی لایا ہوں۔ یہاں یہی پہناوا ٹھیک رہے گا۔ ایک گرم اونی جرسی اور لیڈیز کوٹ بھی لایا ہوں۔“

جمیلہ نے مشتاق صاحب کا شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے۔

”بھئی آپ ہماری بھابھی بھی ہیں اور ہمارے بچوں کی طرح بھی ہیں۔ میاں کرم داد! تمہارے لیے یہ گرم پتلون اور قمیضوں کا جوڑا ہے۔ جیکٹ تمہارے پاس پہلے ہی سے ہے۔ اگر کہو گے تو نئی گرم جیکٹ بھی آ جائے گی۔“

میں نے کہا۔

”مشتاق صاحب میری یہ پرانی جیکٹ کافی گرم اور ٹھیک ٹھاک ہے۔ نئی کی ضرورت نہیں ہے۔“

کہنے لگے۔

”میں نے کلکتے حاجی فرید صاحب کو فون کیا تھا وہ دکان پر نہیں تھے۔ نوکر نے کہا مارکیٹ گئے ہیں۔ دوپہر کے بعد پھر فون کروں گا جو بات ہوئی تمہیں رات کو آ کر بتاؤں گا۔“

کچھ دیر بیٹھ کر مشتاق صاحب چلے گئے۔

جب شام کا اندھیرا ہو گیا تو جمیلہ نے مجھ سے کہا۔

"کیوں نہ تھوڑی دیر باہر چل پھر لیں۔ میں تو یہاں بیٹھی بیٹھی بور ہو گئی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "مشتاق صاحب نے باہر نکلنے سے منع کر رکھا ہے۔"

وہ بولی۔

"شام ہو گئی ہے یہاں اندھیرے میں ہمیں کون دیکھے گا۔ آؤ تھوڑی دیر باہر ٹہلتے ہیں۔ میرا تازہ ہوا میں جانے کو دل چاہتا ہے۔ ہم مکان کے قریب ہی رہیں گے۔"

میں نے سوچا ہم مکان کے پیچھے جو ویران جگہ ہے وہاں تھوڑی دیر ٹہل لیتے ہیں۔ اس طرح جمیلہ کی طبیعت بہل جائے گی۔ میں اسے لے کر مکان کے پیچھے آ گیا۔ یہ ایک غیر آباد کھلا میدان تھا جہاں کسی تاریخی عمارت کا شکستہ کھنڈر تھا۔ میں نے اس کھنڈر کو دن کے وقت دیکھا تھا۔ جھٹ پٹے کی فضا تھی۔ شام کافی گہری ہو گئی تھی۔ سخت سردی کی وجہ سے کہرا پھیلا ہوا تھا۔ جمیلہ نے گرم لیڈی کوٹ پہن رکھا تھا۔ میں نے بھی جیکٹ کے بٹن اوپر تک بند کیے ہوئے تھے۔ ہم مکان کے قریب ہی ٹہلنے لگے۔ میں اسے کہنے لگا خدا نے چاہا تو ہم بہت جلد پاکستان پہنچ جائیں گے۔ بڑی مصیبت کٹ گئی ہے۔ یہ دن بھی گزر جائیں گے۔

اندھیرے میں کافی دور دور مکانوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے بوسیدہ کھنڈر تک چلے گئے۔ وہاں سے واپس آنے لگا تو جمیلہ بولی۔

"یہ کوئی تاریخی جگہ معلوم ہوتی ہے۔"

رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں کھنڈر کی بارہ دری ایک بھوت کی طرح لگ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"دلی شہر اس قسم کے کھنڈرات سے بھرا پڑا ہے۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "اس کھنڈر کے اندر جا کر دیکھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "پاگل ہو گئی ہو۔ وہاں سوائے مٹی اور پتھروں کے اور کیا ہو گا۔"

سے اپنے ساتھ لگایا اور کہا۔

"جمیلہ رات کے وقت ایسی جگہوں پر نہیں جایا کرتے۔ کیا خبر وہاں کوئی جن بھوت ہو۔ ایسی جگہیں آسیبی ہوا کرتی ہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور میرے ساتھ واپس مڑ گئی۔ میں ٹہلتے ٹہلتے دوبارہ کھنڈر کی طرف نہ گیا بلکہ دوسری طرف نکل گیا۔ ہم کوئی پچاس قدموں کے اندر اندر ٹہل رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ جمیلہ بار بار نگاہیں اٹھا کر کھنڈر کی طرف دیکھ لیتی تھی جو اب رات کی تاریکی میں کسی سیاہ فام چڑیل کا سر معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"سردی زیادہ ہو گئی ہے۔ واپس آ جاؤ۔"

مکان میں آ کر وہ بستر میں لیٹ گئی اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں کچن میں چلا گیا جہاں ملازم بوڑھا کھانا تیار کر رہا تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے مکان کے پچھواڑے والے کھنڈر کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا۔

"اس کھنڈر کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہاں بادشاہ اکبر کا ہاتھی دفن ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ مرہٹہ سردار ہولکر کی سپیرن بیوی کی مڑھی ہے۔ ہم نے تو اپنے بچپن کے زمانے سے اسی طرح دیکھا ہے۔"

سپیرن کے نام سے میں چونکا۔ میں نے مزید کریدتے ہوئے پوچھا۔

"مرہٹہ سردار کی سپیرن بیوی کون تھی؟"

چچا خیر دین بولا۔

"میاں! کہتے ہیں کہ جب مرہٹے دلی پر ہلے بول رہے تھے اور ان کا یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا تو ایک بار مرہٹہ سردار ہولکر نے یہاں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ یہاں سپیروں کی بستی تھی۔ اس نے ایک سپیرن کو دیکھا جو بہت خوبصورت تھی۔ سردار ہولکر نے اس سے شادی کر لی۔ کہتے ہیں شادی کی پہلی رات سپیرن کو کسی ناگ نے ڈس لیا اور وہ مر گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ناگ اسی سپیرن سے محبت کرتا تھا جو خود بھی ایک ناگن تھی۔ سردار

چنانچہ اس کھنڈر کو لوگ ناگن کی مڑھی کہہ کر بھی پکارتے ہیں۔"

میرے دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ جمیلہ پر سانپوں کے جو منتر پھونکے گئے ہیں کہیں انہوں نے اپنا اثر دکھانا شروع تو نہیں کر دیا۔ میں پریشان سا ہو کر واپس کمرے میں آیا تو جمیلہ سو رہی تھی۔ رات بھر میں پوری طرح سے نیند نہ لے سکا۔ مشتاق صاحب نے رات کو آنے کا کہا تھا مگر وہ دوسرے دن دوپہر کے وقت آئے۔ کہنے لگے۔

"کلکتے میں حاجی فرید احمد سے میری بات ہو گئی ہے۔ میں نے انہیں ساری بات سمجھا دی تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ کرم داد اور بھابھی کو ابھی دلی میں ہی کچھ روز رکھو۔ اتنی دیر میں یہاں معلوم کرتا ہوں کہ انہیں برما کی طرف بھجوانے کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

کچھ امید بندھ گئی تھی۔

مشتاق صاحب نے مزید کہا۔ "حاجی صاحب کو بھابھی کے واپس مل جانے کی بڑی خوشی ہوئی ہے۔ وہ تمہیں مبارک باد دے رہے تھے۔"

میں نے باتوں باتوں میں مشتاق صاحب سے بھی سپیرن کی مڑھی کے کھنڈر کے بارے میں پوچھا تو وہ بولے۔

"ارے میاں یہاں مغلوں سے پہلے کے کسی ہندو راجہ کی پالتو بلی سفر کے دوران مر گئی تھی۔ راجہ نے اس جگہ اس کی چتا بنا کر اسے باقاعدہ ہندوؤں کی رسم کے مطابق جلایا تھا۔ پھر اس نے بلی کی مڑھی بنا دی۔"

میں نے کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ یہ کسی سپیرن کی مڑھی ہے جو اصل میں ناگن تھی۔"

مشتاق صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ بولے۔

"بھائی کرم داد! دلی میں تمہیں بڑے داستان گو ملیں گے۔ ہر ایک کے پاس نئی کہانی ہو گی۔ اس کھنڈر میں دن کے وقت ایک کمہار اپنے گدھے باندھتا ہے۔ بے شک جا کر دیکھ لو۔"

مشتاق صاحب پر مجھے اعتماد تھا۔ ان کی باتوں نے میرے توہمات کو میرے ذہن سے نکال دیا۔ میرا یہ شک بھی ختم ہو گیا کہ جمیلہ پر سانپ منتروں کا اثر نمودار ہونا شروع ہو گیا ہے۔ دراصل میں جن حالات سے گزر کر آیا تھا اور جن حالات میں پھنسا ہوا تھا یہ ان کا تقاضا تھا کہ میرے دل میں اس قسم کے شک پیدا ہوں۔

مشتاق صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ان کا وہ آدمی جو دلی کے سب سے بڑے بدمعاش شری راج کا دست راست ہے اور ان کا واقف کار ہے ہوٹل میں آیا ہے۔

میں نے کہا۔ "کیا کہہ رہا تھا؟"

مشتاق صاحب نے کہا۔

"اس نے تو کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ چونکہ وہ میرا پرانا واقف کار ہے اور مسلمان ہے۔ میں نے خود ہی باتوں باتوں میں اس سے تمہاری بیوی کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگا مشتاق بھائی وہ عورت تو شری راج کے گورو دیو گری کے مندر سے بھی فرار ہو گئی ہے۔ شری راج کو بڑا دکھ ہوا ہے جس عورت کو انہوں نے اپنے گورو کی داسی بنایا تھا وہ انہیں دھوکہ دے گئی۔"

میں نے پوچھا۔

"آپ نے اور کیا کچھ معلوم کیا؟"

"اس نے یہ بھی بتایا کہ شری راج نے اپنے خاص جاسوسوں کو سنبھل پور اور دیو گڑھ کی جانب روانہ کر دیا ہے تاکہ وہ جمیلہ کو جہاں کہیں بھی ہو پکڑ کر واپس گورو دیو گری کے پاس پہنچا دیں یہ تو اس کے گمان میں نہیں ہے کہ تم لوگ دلی آ گئے ہو گے۔"

یہ بھی ایک دھڑکا مجھے لگ گیا۔ میں نے مشتاق صاحب سے کہا۔

"مشتاق صاحب! میرا تو خیال ہے کہ ہمیں جتنی جلدی ہو سکے کلکتے چلے جانا چاہیے۔ یہاں شرج راج کو ہماری بو مل گئی تو مجھے خطرہ ہے کہ کہیں جمیلہ پھر اغوا نہ ہو جائے۔ میں یہاں اجنبی ہوں۔ سوائے آپ کے مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا اور اس بدمعاش شری راج کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"ارے میاں تم جہاں بیٹھے ہو یہاں تمہاری ہوا کو بھی کوئی نہیں چھو سکتا۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو آج ہی تمہیں کلکتے روانہ کر دوں مگر میں حاجی فرید صاحب کو وقت دینا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہے تو انہیں تم لوگوں کے بھارت سے نکالنے کا کوئی بندوبست کر لینے دو۔ میں انشاء اللہ پرسوں دوبارہ حاجی فرید صاحب کو فون کروں گا۔ اگر انہوں نے اشارہ دیا تو تم فورا" کلکتے روانہ ہو جانا۔"

میری حالت یہ ہو گئی تھی کہ ایک مصیبت دور ہوتی تھی تو دوسری مصیبت سر اٹھا لیتی تھی۔ ایک پریشانی سے نجات ملتی تھی تو دوسری پریشانی شروع ہو جاتی تھی۔ مشتاق علی صاحب کی مرضی کے خلاف میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ میں از خود کوئی قدم اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں بنگلہ دیش سے بھاگ کر آیا تھا۔ مجھ پر مفرور جنگی قیدی کا الزام بھی تھا۔ میری بیوی کے پیچھے بقول کاویری کے کوئی نہ کوئی زہریلا سانپ بھی لگا ہوا تھا۔ اس اعتبار سے میں مجبور تھا کہ وہیں چھپ کر بیٹھا رہوں۔

مشتاق صاحب نے دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا۔ پھر وہ چلے گئے۔ رات کو سونے سے پہلے جیلہ افسردہ سی ہو کر کہنے لگی۔

"مجھے نہیں لگتا کہ ہم پاکستان جا سکیں گے۔"

"تم خواہ مخواہ مایوس ہو رہی ہو۔ ادھر مشتاق صاحب ادھر کلکتے میں حاجی فرید صاحب ہمارے لیے کوششیں کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ ہم اپنے وطن پاکستان ضرور پہنچ جائیں گے۔"

رات گیارہ بجے تک میں اور جیلہ باتیں کرتے رہے۔ وہ بڑی اداس اداس تھی۔ میرے بہلانے پر بھی اس کی اداسی دور نہ ہوئی۔ بار بار گہرے سانس لیتی اور بند دروازے کی طرف یوں دیکھتی جیسے کسی نے باہر سے اسے آواز دی ہو۔ میں اندر ہی اندر اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر کافی پریشان تھا مگر میں سوائے اس کا دل بہلانے اور صبر کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے موم بتی بجھا دی اور ہم اپنے اپنے پلنگ

پر لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے۔

مجھے جیلہ کے کبھی کبھی زور سے سانس لینے کی آواز آتی تو میں لحاف کے اندر آنکھیں کھول کر کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا۔ کسی وقت اس کے سانس کی آواز مجھے ایسے لگتی جیسے کسی سانپ کی پھنکار ہو۔ میں آنکھیں بند کر لیتا اور خدا کے حضور دعا کرتا کہ اے پاک پروردگار تو میری بیوی کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔ تو بخشنہار ہے۔ ہمارے گناہ معاف کر دینا۔ مجھے نیند آ گئی۔ میں سو گیا۔ رات کو کسی وقت مجھے پیاس محسوس ہوئی۔ میں لحاف ہٹا کر اٹھا۔ کمرے میں بتی نہیں جل رہی تھی۔ میں نے ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔ جیلہ اپنے پلنگ پر نہیں تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ غسل خانے کا بھی دروازہ بند تھا۔ میں نے خیال کیا کہ وہ غسل خانے میں گئی ہو گی۔ پلنگ کے پاس ہی تپائی پر پانی کی بوتل اور گلاس پڑا تھا۔ میں نے اس میں سے پانی نکال کر پیا اور بوتل بند کرتے ہوئے غسل خانے کی طرف دیکھنے لگا۔ غسل خانے میں خاموشی تھی۔ میں اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور جیلہ کو آواز دی۔ اندر سے کسی نے جواب نہ دیا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ غسل خانہ خالی تھا۔

میں نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ کمرے کی چٹخنی کھلی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ جیلہ کمرے سے باہر کہیں گئی تھی۔ مگر وہ اتنی سردی میں رات گئے باہر کیا کرنے جا سکتی ہے۔ میں کمرے سے باہر چلا آیا۔ کمرے کا دروازہ مکان کے پہلو والے چھوٹے سے برآمدے میں کھلتا تھا۔ برآمدے میں بلب روشن تھا۔ برآمدہ بھی خالی پڑا تھا۔ اب تو میں بہت پریشان ہو گیا۔ یا اللہ خیر۔ یہ عورت کہاں چلی گئی ہے۔ میں برآمدے سے نکل کر چھوٹے سے صحن میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر مکان کے صدر دروازے کی کنڈی کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر سردی میں ہو کا عالم تھا۔ میں مکان سے باہر نکل کر ادھر ادھر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اتنے میں ایک طرف سے ایک انسانی سایہ مجھے اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ میں وہیں بت بن کر کھڑا رہا۔ یہ جیلہ ہی تھی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جمیلہ! تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"کمرے میں دل بہت گھبرانے لگا تھا۔ بس باہر تازہ ہوا میں ٹہلنے کے لیے نکل آئی تھی۔ تمہیں اس لیے نہ جگایا کہ تمہاری نیند خراب ہوگی۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ خدا کے لیے آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ اگر باہر ٹہلنے کو دل کرے تو مجھے جگا لینا۔ آؤ۔"

جمیلہ کے شانے گرم تھے۔ حالانکہ باہر بڑی سردی تھی اور اوس بھی گر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے میرے ساتھ چلتی مکان کے اندر آ گئی۔ مجھے سخت سردی لگ رہی تھی مگر جمیلہ بغیر سویٹر کوٹ کے باہر نکل گئی تھی اور اسے بالکل سردی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"باہر نکلتے وقت کوٹ پہن لیتا تھا۔ باہر کتنی سردی ہے۔"

"ہوں"۔

جمیلہ نے آہستہ سے ہوں کہا اور بیڈ روم میں آ کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ میں نے لحاف اس کے اوپر کر دیا۔ اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے تم بھی سو جاؤ۔"

مگر میری نیند اڑ چکی تھی۔ باقی کی ساری رات میں نے لحاف کے اندر لیٹے جاگ کر گزار دی۔ بار بار یہی خیال آتا رہا کہ جمیلہ کہاں گئی تھی؟ دل یہی کہتا کہ وہ ضرور ناگن کی مڑھی والے کھنڈر میں گئی ہوگی۔ اس کے بعد جمیلہ کے زور زور سے سانس لینے کی آواز بالکل نہیں آئی تھی۔ میں نے لحاف سے منہ نکال کر اس کے پلنگ کی طرف دیکھا۔ میں نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا ہوا تھا۔ کمرے کے روشندان میں سے پچھلے پہر پو پھٹنے کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ جمیلہ لحاف اوڑھے گہری نیند سو رہی تھی۔ ایک بار مجھے اس کے

خراٹے لیتی تھی۔ اس نے کبھی دوسروں کو جگا دینے والے خراٹے نہیں لیے تھی۔ میرا دل اس کی محبت سے لبریز ہو گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ میری وجہ سے یہ اتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ نہ میں اسے بیاہ کر ڈھاکے لاتا' نہ اسے یہ مصیبت کے دن دیکھنے پڑتے۔

روشندان میں سپیدہ صبح نمودار ہونے لگا تو میں بستر چھوڑ کر اٹھ بیٹھا۔ دل میں کلمہ شریف پڑھ کر چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے۔ کرسی پر پڑی ہوئی گرم چادر جسم کے گرد لپیٹی۔ دبے پاؤں چلتا دروازے کے پاس آیا۔ کنڈی کھولی اور باہر نکل گیا۔ مکان سے باہر آ کر میں پچھواڑے والے میدان میں آ گیا اور دور سے اس منحوس کھنڈر کو دیکھنے لگا جس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں اور جس کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ جمیلہ رات کو اسی کھنڈر میں گئی تھی۔ وہ وہاں کیا کرنے گئی تھی؟ یہ مجھے معلوم نہیں تھا لیکن اتنا مجھے یقین تھا کہ وہ اسی کھنڈر میں رات کو گئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ سیر کرنے کے انداز میں منحوس کھنڈر کی طرف چل پڑا۔ میں اس کھنڈر کو دیکھنا چاہتا تھا کہ اس میں کون سی پر اسرار بات ہے۔ سورج طلوع ہو چکا تھا اور کھنڈر کے گنبد پر سورج کی اولیں سنہری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ ایک گدھ گنبد کے اوپر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں کھنڈر کے قریب گیا تو وہ گدھ پھڑپھڑاتا ہوا اڑ گیا۔

کھنڈر کا گنبد ہندوؤں کے مندروں کے انداز کا تھا اور ایک طرف سے منہدم ہو چکا تھا۔ دیواروں کا بھی گارا چونا جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ فرش پر مٹی ہی مٹی تھی۔ میں ایک شکستہ دیوار کے پاس کھڑے ہو کر جائزہ لینے لگا۔ مجھے وہاں کوئی پر اسرار یا خاص بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نیچے اتر کر کھنڈر کی دوسری طرف آ گیا۔ یہاں دیوار کے ساتھ سرکنڈے اگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ مجھے دیوار میں شگاف سا دکھائی دیا۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو شگاف کی دوسری طرف گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے پتھر اٹھا کر اندر پھینکا تو وہ ایک سیکنڈ کا وقفہ ڈال کر نیچے پکے فرش پر گرا۔ پکے فرش پر گرنے کی آواز سے میں نے اندازہ

دیکھا۔ مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ نیچے تاریکی ہی تاریکی تھی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے ہی میں چند قدم پیچھے ہٹا میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ کا دو تین فٹ لمبا سانپ شگاف سے نکل کر سرکنڈوں کی جھاڑیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا میدان کی طرف رینگنے لگا۔

میں سانپ کو دیکھنے لگا۔ سانپ میدان میں تیزی سے رینگتا ہوا اس طرف جا رہا تھا جس طرف وہ مکان تھا جہاں میں اور میری بیوی جمیلہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ سانپ کی رفتار ایک دم تیز ہوگئی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ وہی دشمن سانپ نہ ہو جو جمیلہ کو ہلاک کرنے کے لیے اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اتنی دیر میں سانپ کافی آگے جا چکا تھا۔ میں اس کی طرف دوڑا۔ میں نے زمین پر سے پتھر اٹھا کر پوری طاقت سے سانپ پر دے مارا۔ ایک تو سانپ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا دوسرے وہ لہرا لہرا کر خاصی تیز رفتاری کے ساتھ جا رہا تھا اس لیے میرا وار خالی گیا۔ سانپ کا رخ ہمارے مکان کی طرف ہی تھا۔ میں یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ سانپ میری بیوی کو ڈس کر ہلاک کر دے جبکہ مجھے معلوم تھا کہ جمیلہ کمرے میں سو رہی ہے اور وہ سانپ سے اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکے گی۔ جو میرے ہاتھ میں آیا میں نے زمین پر سے اٹھا اٹھا کر سانپ پر پھینکنا شروع کر دیا۔ ایک لکڑی میرے ہاتھ آگئی۔ میں نے زور سے سانپ پر پھینکی۔ لکڑی چھوٹی تھی مگر سانپ کی دم پر لگی اور سانپ نے پھنکار مار کر اپنا رخ بدل لیا۔ وہ مکان کی طرف جانے کی بجائے چھوٹی سڑک کی طرف تیزی سے بھاگ گیا اور جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ میں نے زمین پر سے ایک اینٹ اٹھائی اور بڑی احتیاط کے ساتھ چل کر جھاڑیوں کے پاس آگیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے کچھ روڑے اٹھا کر جھاڑیوں پر پھینکے۔ سانپ اندر سے نہ نکلا۔ اس وقت میرے پاس ریوالور نہیں تھا۔ ریوالور میرے پلنگ پر سرہانے کے نیچے تھا۔ میں نے ایک چھڑی سے جھاڑیوں کو ادھر ادھر ہلایا مگر سانپ تو جیسے غائب ہو گیا تھا۔ دیر تک میں جھاڑیوں کو ادھر ادھر ہلاتا رہا مگر سانپ دوبارہ نظر نہ آیا۔

میں نے اینٹ وہیں پھینکی اور دوڑ کر مکان کے اندر آگیا۔ دروازہ بند کر دیا اور بیڈ روم میں گھس کر اس کا بھی دروازہ بند کر دیا۔ جمیلہ ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے اپنے

سرہانے کے نیچے سے ریوالور نکال کر اسے چیک کیا اور بیڈ روم سے نکل کر برآمدے میں آگیا۔ میری نگاہیں ادھر ادھر سانپ کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر سانپ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ریوالور میں نے جیب میں رکھ لیا۔ کچن میں سے بوڑھا خیرو نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا تسلا تھا۔ پانی ایک طرف پھینک کر اس نے مجھ سے پوچھا۔

"حضور چائے لے آؤں۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر ٹھہرو چچا۔"

واپس بیڈ روم میں آکر میں نے جمیلہ کو جگا دیا۔ میں اسے خبردار کرنا چاہتا تھا جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے دو فٹ لمبے کالے سانپ کو دیکھا ہے جو مکان کی طرف آ رہا تھا تو جمیلہ نے بغیر کسی تشویش کا اظہار کیے کہا۔

"ضرور وہ سنتھاولی مٹھ کا سانپ ہوگا۔"

میں نے کہا۔

ہمیں اس مکان کو بدلنا ہوگا۔ میں نے سانپ کو مارنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کہیں غائب ہوگیا۔"

جمیلہ نے بالوں کو پیچھے باندھتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"مکان کو بدلنے سے کیا ہوگا۔ میں جس مکان میں جاؤں گی سانپ میری بو سونگھتا ہوا اسی مکان میں آ جائے گا۔ وہ اتنی دور سے میری تلاش کرتا ہوا دلی پہنچ گیا ہے تو کیا یہاں سے دوسرے مکان میں نہیں آسکے گا۔"

مجھے جمیلہ پر غصہ آگیا۔ وہ اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے سانپ کی حمایت کر رہی ہو۔ میں نے کہا۔

"تو کیا تم چاہتی ہو کہ سانپ آکر تمہیں اور مجھے ڈس کر مار ڈالے؟ یعنی ہم اسی جگہ بیٹھے رہیں؟ ہم اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ کریں؟"

جمیلہ نے بھی مجھے غصے کی نگاہوں سے دیکھا۔ کہنے لگی۔

"یہ میں نے کب کہا ہے؟ ٹھیک ہے ہم یہ مکان بدل لیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ ہم آج ہی دلی شہر کو چھوڑ کر کلکتے چلے جائیں گے۔ حاجی صاحب وہاں سے ہمیں برما رنگون کی طرف نکالنے کا ضرور انتظام کر دیں گے۔"

اب مجھے ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا۔ مجھے یہی فکر لگ گیا کہ کہیں جمیلہ کا دشمن سانپ کسی طرف سے مکان کے اندر نہ گھس آئے۔ کسی وقت یہ سوچ کر کچھ تسلی سی بھی ہو آتی کہ ہو سکتا ہے وہ جمیلہ کا دشمن سانپ نہ ہو۔ کوئی عام سانپ ہو اور ہمارے مکان میں جانے کی بجائے وہ کسی دوسری طرف جا رہا ہو۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ کالا سانپ جمیلہ کو ڈسنے جا رہا تھا' سوائے اس کے کہ سانپ کا رخ ہماری مکان کی طرف تھا۔ لیکن یہ اتفاق کی بات بھی ہو سکتی تھی کہ سانپ میدان عبور کر رہا تھا۔ اس کا رخ ہمارے مکان کی طرف بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن کاویری نے اور خود جمیلہ نے اپنی باتوں اور رویے سے میرے نفسیات کو اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ مجھے خوامخواہ یقین ہو رہا تھا کہ کالا سانپ سنتھا ولی مٹھ کے پجاری پیروں کا چھوڑا ہوا سانپ ہے جو میری بیوی کو ہلاک کرنے آیا ہے۔

شام کو مشتاق صاحب آئے تو میں نے انہیں کہا کہ یہاں میں نے ایک سی آئی ڈی والے کو مکان کے گرد منڈلاتے دیکھا ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ مجھے یہاں سے کلکتے کی طرف نکل جانا چاہیے۔ مشتاق صاحب سی آئی ڈی کا سن کر فکر مند سے ہو گئے کہنے لگے۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ انٹیلی جینس کا آدمی تھا؟"

میں نے کہا۔

"میں سی آئی ڈی کے آدمیوں کو ان کے چہروں اور ان کی چال سے پہچان لیتا ہوں۔ مشتاق صاحب اور پھر وہ آدمی بار بار ہمارے مکان کی طرف دیکھتا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ آپ بھی کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔ اس لیے ہمیں اسی وقت ریلوے سٹیشن پہنچا دیں وہاں سے ہمیں کلکتے جانے والی کوئی نہ کوئی گاڑی مل جائے گی۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"میاں! کل دس گیارہ بجے کلکتے سے حاجی فرید صاحب نے ٹیلی فون کرنا ہے اور تمہیں برما پہنچانے کے بارے میں بتانا ہے۔ کم از کم کل کا دن تو ٹھہر جاؤ۔ یہ تو پتہ لگ جانے دو کہ حاجی فرید صاحب نے تمہارے بارے میں کچھ بندوبست کیا بھی ہے یا نہیں؟"

مشتاق صاحب کی دلیل معقول تھی۔ اب میں انہیں مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا کہ ہمیں کسی دوسرے مکان میں لے جائیں کیونکہ یہاں ہمیں ایک سانپ سے ڈر لگتا ہے۔ میں تذبذب میں پڑ گیا۔ آخر میں نے یہی کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ کل کا دن دیکھ لیتے ہیں۔ اگر حاجی فرید صاحب نے کلکتے سے فون پر یہ بھی بتایا کہ وہ ہمارے لئے کچھ نہیں کر سکتے تب بھی میں یہاں ٹھہرنا مناسب خیال نہیں کرتا کیونکہ انٹیلی جینس والوں کو مجھ پر شک پڑ گیا ہے کہ میں مفرور جنگی قیدی ہوں۔ اب کسی بھی وقت پولیس یہاں چھاپہ مار کر مجھے اور جمیلہ کو اور اس کے ساتھ آپ کو بھی گرفتار کر سکتی ہے۔"

مشتاق صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے ایسی صورت میں میں تم دونوں کو اپنے رائے سینا کے علاقے والے کوارٹر میں لے چلوں گا۔ صرف آج کی رات تم یہاں رکے رہو۔"

اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

مشتاق صاحب چلے گئے۔

اس وقت ابھی دوپہر ہی تھی۔ مشتاق صاحب سے میں نے جو باتیں کی تھیں ان کے بارے میں جمیلہ کو میں نے کچھ نہ بتایا۔ میں اس خیال سے پریشان تھا کہ سانپ کسی طرف سے مکان میں داخل ہو کر جمیلہ پر حملہ نہ کر دے مگر میں نے محسوس کیا کہ جمیلہ کو اس کی ذرا سی بھی فکر یا تشویش نہیں تھی۔ ایک بار جب میں نے اس سے سانپ کے سلسلے میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو اس نے بڑے آرام سے کہا۔

"سانپ آتا ہے تو اسے آنے دو۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

میں نے کہا۔ "لیکن مجھے تمہاری بھی تو فکر ہے۔"

وہ بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تمہیں کہہ دیا نا' سانپ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کچھ نہیں کہے گا اور وہ مجھے بھی کچھ نہیں کہے گا۔ اس کے بعد سانپ کا ذکر مت کرنا۔"

چونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس خطرے میں گھرے ہوئے مکان میں ہمیں صرف ایک ہی رات بسر کرنی ہے۔ کل یہاں سے نکل کر یا تو کلکتے کی طرف چل دیں گے یا مشتاق صاحب ہمیں اپنے دوسرے مکان میں لے جائیں گے اس لیے میں نے جمیلہ سے زیادہ بحث نہ کی اور خاموش رہا۔ مجھے اس مکان میں صرف ایک رات کسی نہ کسی طرح گزارنی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں یہ رات جاگ کر گزاروں گا۔

وہ رات میں نے سوتے جاگتے گزار دی۔ بیڈ روم کے دروازے کو میں نے اچھی طرح سے بند کر دیا تھا۔ غسل خانے میں ایک نالی تھی۔ نالی میں میں نے کپڑا ٹھونس دیا تھا تاکہ سانپ اس میں سے اندر نہ آ جائے۔ رات گزر گئی۔ جمیلہ ساری رات سکون کے ساتھ سوئی رہی۔ سانپ کی طرف سے اسے ذرا بھی پریشانی نہیں تھی۔ اس کے اس رویے سے مجھے تشویش بھی ہوتی اور حیرانی بھی۔ یہ وہ عورت تھی کہ سانپ کے نام سے ڈر جایا کرتی تھی اور اب جبکہ ایک سانپ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا وہ بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ دن نکل آیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ باہر آ کر دیکھا سانپ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ مجھے اب یقین سا ہو گیا تھا کہ جس سانپ کو میں نے کل ناگن والی مڑھی کی جھاڑیوں سے نکلتے دیکھا تھا وہ کوئی عام سانپ تھا۔ جمیلہ کے پیچھے لگا ہوا سانپ نہیں تھا۔ شام سے پہلے پہلے میں دلی سے نکل جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن مشتاق صاحب نے آ کر بتایا کہ حاجی فرید صاحب کے چھوٹے بھائی کا کلکتے سے فون آیا ہے کہ حاجی صاحب بازار گئے ہوئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ جب تک میں نہ کہوں کرم داد کو کلکتے نہ بھیجا جائے۔ میں مایوس سا ہو گیا۔ مشتاق صاحب نے کہا۔

"بھائی! حاجی صاحب تمہارے لیے ہی تگ و دو کر رہے ہیں۔ جب وہ تمہارے کام میں لگے ہوئے ہیں تو بہتر یہی ہے کہ تم ابھی یہیں ٹھہرے رہو۔ اگر تمہیں انٹیلی جینس والوں کا خطرہ ہے تو میں کل صبح صبح تمہیں اپنے رائے سینا والے کوارٹر میں لے چلوں گا۔ لیکن میں تمہیں ان حالات میں کلکتے جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ جبکہ حاجی فرید صاحب بھی وہاں نہیں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں آپ کے مشورے پر ہی عمل کروں گا لیکن اس مکان سے میں آج سے چلے جانا چاہتا ہوں۔"

مشتاق صاحب نے بتایا کہ رائے سینا والے کوارٹر میں ان کا ایک باہر سے آیا ہوا مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ کل صبح کی گاڑی سے جبل پور جا رہا ہے۔ اس لیے ہمیں کل دوپہر کے وقت ہی کوارٹر خالی مل سکے گا۔ میں مجبور ہو گیا۔ ایک اور رات مجھے اسی مکان

میں ٹھہرنا تھا۔ جمیلہ کو ان حالات کا علم ہوا تو کہنے لگی۔

”تم یہاں سے دوسرے مکان میں کیوں جا رہے ہو؟ یہاں کیا وقت ہے؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے تمہارے دشمن سانپ کا ڈر ہے میں یہ تمہاری خاطر کر رہا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔“

جمیلہ نے حالات کو ہر کیفیت میں قبول کر لیا ہوا تھا۔ یہ بات بھی بڑی عجیب تھی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں دھوپ میں مکان کے پچھواڑے ٹہل رہا تھا کہ میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو تھوڑے فاصلے پر کیکر کے درخت کے نیچے کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ اس طرف دیکھا تو وہ آدمی وہاں نہیں تھا۔ میں واپس مکان کی طرف آیا تو اسی آدمی کو میں نے ایک بار پھر دیکھا۔ وہ کچی سڑک کے کونے والے درختوں کے پاس کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بھارتی انٹیلی جنس کا آدمی ہے اور اس کو کہیں سے میرا سراغ مل گیا ہے۔ میں مکان کے دروازے کے باہر پرانی کرسی پر دھوپ میں بیٹھ گیا۔ دراصل میں اس آدمی کی نقل و حرکت نوٹ کرنا چاہتا تھا۔ وہ مشکوک آدمی درختوں میں کہیں گم ہو گیا۔

میں کمرے میں آ کر سوچنے لگا کہ اگر یہ واقعی انٹیلی جنس والوں کا آدمی ہے تو ہمارا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لیکن میں جمیلہ کو لے کر خود کسی طرف نہیں جا سکتا تھا۔ مشتاق صاحب نے مجھے سخت سے ادھر ادھر جانے سے منع کر رکھا تھا۔ جمیلہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی بال ٹھیک کر رہی تھی۔ میں نے اس سے سی آئی ڈی والے آدمی کی کوئی بات نہ کی۔ مشتاق صاحب بھی آ گئے۔ میں نے ان سے ذکر کیا تو وہ کہنے لگے۔

”میاں! کسی طرح آج کی رات گزار لو۔ کل میں تم لوگوں کو یہاں سے لے جاؤں گا۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ وہ انٹیلی جنس کا آدمی نہ ہو۔“

مشتاق صاحب چلے گئے۔ ابھی دن پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا۔ جمیلہ پلنگ پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ میں لاہور، جہلم اور راولپنڈی کی باتیں کرنے لگا۔ ان شہروں میں ہی ہمارے عزیز رشتے دار رہتے تھے۔ وہ خاموشی سے چائے بھی پیتی رہی اور میری باتیں بھی

سنتی رہی۔ پھر سرد آہ بھر کر پیالی تپائی پر رکھتے ہوئے بولی۔

”خدا جانے ہمیں پاکستان جانا نصیب بھی ہو گا یا نہیں۔“

میں نے اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔

”انشاء اللہ! ہم بہت جلد پاکستان پہنچ جائیں گے۔ اتنی بھاری مصیبت سے نکل آئے ہیں تو یہ مصیبت بھی کٹ جائے گی اور ہم پاکستان پہنچ کر نئی زندگی شروع کریں گے۔“

اس روز بڑی سردی تھی۔ آسمان پر بادل تھے اور کہر سا چھایا ہوا تھا۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔ میں اور جمیلہ چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ بجلی کا ہیٹر لگا ہوا تھا۔ میری عادت تھی کہ رات کو ریوالور میں سرہانے کے نیچے رکھ کر سوتا تھا اور دن کے وقت اسے اپنی گرم جیکٹ کی جیب میں رکھ لیتا تھا۔ جمیلہ کو میرے ریوالور کا علم تھا۔ مشتاق صاحب کو میں نے ریوالور کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ مجھ سے لے لیں گے کیونکہ وہ بغیر لائسنس کے تھا۔ ملازم چچا خیر دین کچن میں رات کے لیے کھانا تیار کرنے میں لگا ہوا تھا۔ سردی اور کہر کی وجہ سے باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی کسی وقت دور سڑک پر سے کسی لاری یا سکوٹر کے گزرنے کی آواز آ جاتی تھی۔ میں پاکستان کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا کہ اتنے میں دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں نے جمیلہ کی طرف اور اس نے میری طرف دیکھا۔ یہ کوئی اجنبی ہی ہو سکتا تھا جس کو پتہ نہیں تھا کہ مکان کے باہر والے دروازے پر گھنٹی کا بٹن بھی لگا ہوا ہے۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

”تم بیڈ روم میں چلی جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں کون ہے؟“

وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ میں دروازہ کھول کر باہر آیا تو دیکھا کہ ایک لمبے قد کا بھاری بھرکم آدمی کھڑا ہے۔ کہنے لگا۔

”مجھے مشتاق صاحب نے بھیجا ہے۔ آپ کے لیے ایک ضروری پیغام ہے۔ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“

مشتاق صاحب کا نام سن کر میں نے اسے اندر بلا لیا۔ اندر آ کر اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور بولا۔

"آپ نے کمرہ خوب گرم کر رکھا ہے کیا آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟"

میرا ماتھا ٹھنکا مشتاق صاحب کا بھیجا ہوا آدمی اس قسم کے سوال نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔ آپ بتائیں مشتاق صاحب نے کیا پیغام بھجوایا ہے؟"

وہ آدمی ابھی تک بند دروازے کے آگے ہی کھڑا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"بات یہ ہے کہ ہمیں تمہارے بارے میں ایک ایک بات کا علم ہو چکا ہے۔ تم پاک فوج کے افسر ہو اور جنگی قیدیوں کی ٹرین سے فرار ہوئے ہو۔ میں ملٹری انٹیلی جینس کا آدمی ہوں اور تمہیں گرفتار کرنے آیا ہوں۔"

ایک بار تو مجھے کمرہ گھومتا ہوا نظر آیا۔ مگر فوراً ہی میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں پاکستان آرمی کا آفیسر نہیں ہوں اور نہ ہی میں کوئی مفرور جنگی قیدی ہوں۔ مسلمان ضرور ہوں۔ بھوپال میں میری خیاری کی دکان ہے۔ دلی مال خریدنے آیا ہوں اور مشتاق صاحب کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ میرا کسی پاکستانی آرمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

اس آدمی نے بڑے آرام سے کوٹ میں سے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں مجھے پستول نظر آیا۔ کہنے لگا۔

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہماری انٹیلی جینس نے ہمیں تمہاری فل رپورٹ دی ہے۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ چپ چاپ میرے آگے لگ کر باہر آ جاؤ۔ اگر تم نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے تو فوجی کوارٹر گارڈ میں ہمارے افسروں کے آگے کہنا۔ چلو، باہر نکلو۔"

جمیلہ نے یہ بے وقوفی کی کہ جیسے ہی اس نے کمرے میں باتوں کی آواز سنی تو دروازہ

کھول کر کمرے میں آ گئی۔ انٹیلی جینس کے آدمی نے جمیلہ کی طرف دیکھا اور بولا۔

"بہت خوب تمہارے ساتھ ایک عورت بھی ہے؟ یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔"

اس نے پستول کی نالی کا رخ جمیلہ کی طرف کر کے کہا۔

"تم بھی آ جاؤ۔"

یہ بڑی نازک گھڑی تھی۔ زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا ایک دو سیکنڈ کے اندر ہی کرنا تھا۔ اگر ہم دونوں اس آدمی کے ساتھ چلے جاتے ہیں تو یہ نہ صرف میری اور جمیلہ کی اذیت ناک موت تھی بلکہ ہمارے محسن مشتاق صاحب کا بھی مستقبل تباہ ہو سکتا تھا۔ بھرا ہوا ریوالور میری جیکٹ کی جیب میں تھا۔ میں اس کا سیفٹی کیچ ہر وقت کھول کر رکھتا تھا۔ میں کوئی اناڑی سویلین نہیں تھا۔ پاک فوج کا تربیت یافتہ فوجی اور کمانڈو تھا۔ جمیلہ کا رنگ زرد ہو چکا تھا۔ فیصلہ میں نے کر لیا تھا لیکن اپنے فیصلے پر عمل کرنے کے لیے مجھے دو تین سیکنڈ کی ضرورت تھی۔ آپ کے لیے دو تین سیکنڈ کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہوں گے لیکن ایک کمانڈو ایکشن میں آنے کے لیے اتنا وقت بہت ہوتا ہے۔ میں ایک دو سیکنڈ اس آدمی سے بات کرنے میں گزارنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ پہلے ہی اس طرح جیکٹ کے اندر بغلوں میں دے لیے تھے جیسے مجھے سردی لگ رہی ہو۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ آہستہ سے اٹھ کھڑا۔ وہ آدمی پستول تانے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"خبردار! کوئی بے وقوفی مت کرنا۔ مجھے تمہیں گولی مارنے کا بھی آرڈر ہے۔"

میں نے کہا۔

"مہاراج! میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ میں وہ آدمی نہیں ہوں جس کی آپ کو تلاش ہے۔"

"بکواس بند کرو۔۔۔"

وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جو تین لفظ وہ بول چکا تھا وہ اس کی زندگی کے آخری الفاظ تھے۔ میں نے بغلوں میں ہاتھ دے رکھے تھے اور اسی دوران اپنا سیدھا ہاتھ جیکٹ کی اندر والی جیب میں ڈال کر ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ جس طرح بجلی چمک

کر غائب ہو جاتی ہے، میرا خیال ہے اس سے بھی کم وقت لگا ہو گا۔ میں نے ریوالور باہر نکالا' اس آدمی پر فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے آپ کو دائیں جانب صوفے پر گرا دیا۔ اس خیال سے کہ اس آدمی کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ گھبرا کر فائر کر سکتا تھا۔ لیکن میرے ریوالور کے سیلنسر سے جو گولی نکلی وہ سیدھی اس کے دل میں پیوست ہو چکی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ میں ہی رہ گیا اور وہ پیچھے کو دھڑام سے گر پڑا۔

جمیلہ کے حلق سے خشک سی چیخ نکل گئی۔ میں نے اسے کہا۔

"اب آواز نہ نکالنا۔"

میں نے جھک کر اس آدمی کی طرف دیکھا۔ کہرے کی بتی جل رہی تھی۔ اس کا منہ ذرا سا کھلا تھا اور آنکھیں مردہ ہو چکی تھیں۔ میں نے اس کی گردن کی ایک جانب ہاتھ رکھ دیا۔ گردن کی وہ رگ جو تھوڑی دیر پہلے ضرور دھڑک رہی ہو گی اب ساکت ہو چکی تھی۔ وہ مر چکا تھا' جمیلہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اب کیا ہو گا؟" وہ فکر مند ہو کر بولی۔

میں نے کہا۔ "اب کچھ نہیں ہو گا۔ اگر یہ شخص زندہ رہتا تو بہت کچھ ہو جاتا تھا۔"

میں نے جمیلہ کو بتایا کہ یہ انٹیلی جینس کا آدمی تھا اور مجھے اپنے ساتھ ملٹری پولیس کے ہیڈ کوارٹر لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب میں اس کا شناختی کارڈ نکال کر دیکھا۔ اس کا نام ہریش چندر تھا اور ملٹری انٹیلی جینس کا وی سی او تھا۔ میں نے دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ چونکہ میرے ریوالور کے آگے سیلنسر لگا ہوا تھا اس لیے فائر کا دھماکہ نہیں ہوا تھا۔ باہر شام کا اندھیرا کہرے میں گھل مل گیا تھا۔ میں نے کچن کی طرف نگاہ ڈالی۔ کچن کی بتی جل رہی تھی اور پانی گرانے کی آواز آئی۔ چچا خیر دین کھانا پکانے میں مصروف تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ مکان میں ایک آدمی کا خون ہو گیا ہے۔ جمیلہ گھبرائی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

"اس لاش کو کہاں چھپاؤ گے۔ ہم ضرور کسی مصیبت میں پھنسنے والے ہیں۔"

میں نے اسے آہستہ سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم بیڈ روم میں کمرہ بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ میں سب کچھ کر لوں گا۔ جاؤ۔"

وہ اٹھ کر بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ میں نے دروازہ کھول کر ایک بار پھر کچن کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہاں خاموشی تھی۔ سردی اور کہرے کی وجہ سے کچن کا دروازہ بند تھا۔ مکان کی دائیں جانب اندھیرا تھا۔ میں لاش کو کسی ایسی جگہ پھینکنا چاہتا تھا جہاں کسی کو پتہ نہ چل سکے اور لاش بھی غائب ہو جائے۔ اچانک مجھے ناگن کی مڑھی والے شگاف کا خیال آگیا۔ شگاف کے اندر یقیناً کوئی اندھا کنواں تھا۔ میں نے شگاف میں پتھر پھینک کر دیکھا تھا۔ پتھر کافی نیچے جا کر زمین سے ٹکرایا تھا۔ میں لاش کو اگر شگاف کے اندر پھینک دوں تو قیامت تک کسی کو پتہ نہیں چل سکے گا۔ میں تیزی سے بیڈ روم میں جمیلہ کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ میں لاش کو ناگن کی مڑھی کی طرف لے جا رہا ہوں۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں جمیلہ پلنگ پر لحاف گھٹنوں تک لیے سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ یقیناً وہ بھی سوچ رہی ہو گی کہ ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ آرام چین سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنا بڑا خونی انقلاب آ جائے گا اور ہم دربدر ہو جائیں گے۔ اس نے صرف نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ میں بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے لاش والے کمرے میں آ گیا۔ انٹیلی جینس والے کی لاش اسی طرح پڑی تھی۔ میں نے اسے اپنے کندھے پر ڈالا اور بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر رات کے سرد اندھیرے میں نکل آیا۔ لاش کا اتنا وزن نہیں تھا۔ میں نے اسے اس طرح کندھے پر ڈالا تھا کہ اس کا سر کی طرف سے آدھا دھڑ پیچھے لٹک رہا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لے رکھا تھا۔

مکان کے پچھواڑے میدان اندھیرے اور کہرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے سمت کا علم تھا۔ میں چل پڑا۔ جب میدان ختم ہوا تو کہرے اور اندھیرے کی چادر میں سے ناگن والی مڑھی کے کھنڈر کا خاکہ ابھرا۔ میں لاش کو لے کر اس کے پیچھے کی طرف آ گیا۔ یہاں وہ سرکنڈے تھے جن کے پیچھے دیوار میں شگاف تھا۔ میں نے شگاف کے پاس آ کر لاش کو زمین پر رکھ دیا اور سانس درست کرنے کے بعد شگاف میں ایک بار پھر پتھر پھینکا۔ پتھر کافی

نیچے جا کر زمین سے ٹکرایا۔ ٹکرانے کی آواز ایسی تھی جیسے وہ اینٹوں اور پتھروں پر گرا ہو۔ میں نے لاش کو شگاف میں دھکیل دیا۔ کوئی تین سیکنڈ کے بعد لاش کے زمین کی تہہ میں گرنے کی آواز آئی۔ یہ مجھے بڑی اچھی جگہ مل گئی تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں تیز تیز چلتا ہوا واپس آیا اور جمیلہ کو بتایا کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب فکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک بار پھر پر اسرار ہو گئی تھی۔ ایک بات مجھے ضرور پریشان کر رہی تھی۔ وہ بات یہ تھی کہ انٹیلی جینس والے جب کسی مشتب کی جاسوسی کرنے نکلتے ہیں تو وہ اپنے تھانے یا ہیڈ کوارٹر میں عام طور پر بتا کر آتے ہیں ک وہ کس طرف اور کہاں جا رہے ہیں بلکہ یہ وہ رجسٹر میں اپنے ہاتھ سے درج کر کے نکلتے ہیں۔ اگر اس آدمی نے بھی لکھ دیا ہو گا کہ وہ کہاں جا رہا ہے تو جب وہ رات کو واپس اپنے ہیڈ کوارٹر یا اپنے گھر نہیں پہنچے گا تو پولیس اس کی تلاش میں ہمارے علاقے میں آ سکتی تھی۔

بہرحال مجھے جو کچھ کرنا تھا میں نے کر دیا تھا۔ ایک اطمینان ضرور تھا کہ ہم دوسرے روز مکان بدل کر رائے سینا والے کوارٹر میں جا رہے تھے اور وہاں ہمیں اس وقت تک رہنا تھا جب تک کلکتے سے حاجی فرید صاحب کا یہ پیغام نہیں آتا کہ کرم داد کو کلکتے روانہ کر دو۔ رات گزر گئی دوسرے دن مشتاق صاحب گاڑی لے کر آئے اور ہمیں اپنے ساتھ دلی کے رائے سینا والے علاقے میں واقع کوارٹر میں لے گئے۔ یہ کوارٹر مٹی کے چھوٹے ٹیلے کے عقب میں تھا۔ اکیلا کوارٹر تھا۔ ٹیلے کو کیکر کے درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہاں کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔ مشتاق صاحب کہنے لگے۔

"میں راشن وغیرہ خود لے آؤں گا۔ بھابھی کھانا وغیرہ بنا دیا کرے تو تمہارے حق میں بڑا اچھا ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں میرا کوئی نوکر وغیرہ دیکھے۔"

وہ چلے گئے اور کچھ دیر بعد ہمارے لیے آٹے، چاول کے تھیلے اور گھی، چائے اور اسی قسم کی ضروری چیزیں لے کر آ گئے۔ خشک دودھ کا ایک ڈبہ بھی لائے تھے۔ میں نے کہا۔

"مشتاق صاحب ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہرنا۔ آپ تو بہت سامان لے آئے ہیں۔"

کہنے لگے۔ "میاں کرم داد! حاجی فرید صاحب تمہیں برما پہنچانے کا جب تک پکا انتظام نہیں کر لیتے تمہیں اسی جگہ رہنا ہو گا۔ حاجی صاحب پریکٹیکل آدمی ہیں۔ ہو سکتا ہے انہیں ایک مہینہ لگ جائے۔"

میں نے فوراً کہا۔ "نہیں نہیں مشتاق صاحب اتنی دیر نہیں لگنی چاہیے۔"

مشتاق صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت سے کہا۔

"یہاں ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں، شام کو آؤں گا۔ تم لوگ کوشش کرنا کہ کوارٹر میں ہی رہو۔ مجھے صرف دلی کی خفیہ پولیس کا ڈر ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔"

دلی کی خفیہ پولیس کا مجھے مشتاق صاحب سے زیادہ ڈر تھا۔ اب تو میں نے ان کے ایک عہدے دار کو قتل بھی کر ڈالا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ پولیس جہاں ہم پہلے رہ رہے تھے اور جہاں میں نے خفیہ پولیس والے کو ٹھکانے لگایا تھا وہاں جا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ جو لوگ یہاں رہ رہے تھے وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ اگرچہ مشتاق صاحب نے اپنے بوڑھے ملازم خیر دین کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ ہمارے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے۔ اگر کوئی آ کر پوچھے بھی تو یہی کہا جائے کہ یہ مکان عرصے سے خالی پڑا ہے۔ لیکن پولیس کو اب صرف میری تلاش ہی نہیں تھی بلکہ اپنے عہدہ دار کے قاتل کی تلاش بھی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ بوڑھے ملازم کو پکڑ کر تھانے لے جائے۔ بوڑھا ملازم پولیس کا تشدد زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس نے بتا دیا کہ ہم رائے سینا والے کوارٹر میں آ گئے ہیں تو مجھ پر بہت بڑی مصیبت نازل ہو سکتی تھی۔

ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اگر دو ایک دن تک کلکتے سے حاجی صاحب کا کوئی پیغام نہیں آتا تو نہ آئے۔ میں جمیلہ کو لے کر خود ہی کلکتے کی طرف فرار ہو جاؤں گا۔ دلی میں میرے لیے ہر طرف اب خطرہ ہی خطرہ تھا۔ ہم صبح کے وقت رائے سینا والے کوارٹر میں منتقل ہوئے تھے۔ دوپہر کو جمیلہ نے خود ہی چاول

وغیرہ پکائے۔ کوارٹر پرانے ٹائپ کا تھا۔ صرف دو کمرے تھے۔ معمولی سا گرد آلود فرنیچر تھا۔ سردی سے بچاؤ کے لیے مشتاق صاحب نے بجلی کا ایک ہیٹر لا کر رکھ دیا تھا۔ ایک کمرے میں دو چار پائیوں پر بستر لگے تھے۔ لحاف پڑے تھے۔ ہم کھڑکیاں وغیرہ بند رکھتے تھے۔ علاقہ دور دور تک غیر آباد تھا۔ سامنے درختوں کے درمیان ایک خشک نالہ تھا جس میں کوڑا کرکٹ پڑا تھا۔ میں نے اردگرد کے ماحول کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔ نالے کے پار چند ایک کچے مکان تھے جہاں کسی وقت بچے کھیلتے یا کوئی مرد یا عورت ادھر ادھر آتی جاتی نظر آ جاتی تھی۔ خشک نالے پر لکڑی کا پرانا پل بنا ہوا تھا۔ پل کے ہماری طرف والے سرے پر ایک بھٹیارن کا تندور تھا۔ دوپہر کے وقت کچے مکانوں کی عورتیں روٹیاں لگوانے آ جاتی تھیں۔ مگر یہ سب کچھ ہمارے کوارٹر سے کافی فاصلے پر تھا۔ یہ سارا سکرین پلے اور علاقہ دیکھنا میرے لیے بہت ضروری تھا تاکہ اگر کوئی ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے تو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے طرف سے نکلنا ہوگا۔

شام ابھی نہیں ہوئی تھی۔ میں کوارٹر کے تنگ صحن میں اوٹ کھلے دروازے کے پاس جیکٹ کے کالر اوپر اٹھائے، جیبوں میں ہاتھ دیے لوہے کی کرسی پر بیٹھا تھا کہ مجھے بین کی آواز سنائی دی۔ کوئی سپیرا اس طرف آ رہا تھا۔ مجھے ایک دم سے سنتھا ولی کے مٹھ کے پجاری سپیرے کا خیال آ گیا۔ کاویری نے کہا تھا بلکہ بعد میں مجھے جمیلہ نے بھی بتایا تھا کہ سنتھا ولی مٹھ سے فرار ہونے کے بعد کوئی نہ کوئی پجاری سپیرا یا سانپ اس کا پیچھا کرے گا۔ میں جلدی سے اٹھ کر دروازے میں آیا اور جس طرف سے بین کی آواز آ رہی تھی اس طرف دیکھا۔ ایک سپیرا بین بجاتا چلا آ رہا تھا۔ کوارٹر کے دروازے پر اس نے مجھے دیکھا تو بین منہ سے ہٹا کر مجھے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور کہا۔

"گھر گرہستیاں پھلیں۔ پھولیں ناگ ناگن کا جوڑا دکھاتا ہوں۔ کیلاش پربت سے پکڑ کر لایا ہوں----"

وہ بولے جا رہا تھا اور وہیں بیٹھ کر جھولے سے پٹاری نکال کر اس کے گرد لپٹی ہوئی رسی کھول رہا تھا۔ کالے رنگ کا بوڑھا سپیرا تھا۔ سر پر اس نے گیروے رنگ کا کپڑا لپیٹ

رکھا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے سانپ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے بابا۔ تم کسی بستی میں جا کر بچوں کو اپنا تماشہ دکھاؤ۔ مگر اس دوران وہ سانپوں کا ایک جوڑا باہر نکال چکا تھا۔ رومال سے اس نے سانپوں کو چھوا تو دونوں سانپوں نے پھن اٹھا دیے۔ ساتھ ساتھ سانپوں سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ جب میں نے اسے سختی سے کہا کہ وہ چلا جائے تو وہ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! آپ ایسے دھن والوں کے بھروسے ہم اپنی روزی روٹی کماتے ہیں۔ کچھ مل جائے اور کچھ نہیں تو گھر میں باسی روٹی پڑی ہو تو وہ ہی دے دیں۔ بڑی بھوک لگی ہے----"

لیکن میں نے اسے ڈانٹ دیا اور کہا۔

"سانپوں کو پٹاری میں ڈالو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

سپیرے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"ناراض نہ ہو باباجی چلے جاتے ہیں۔"

پھر اس نے سانپوں کو پٹاری میں ڈال کر جھولے میں ڈالا۔ جھولا کندھے پر لٹکایا اور بین بجاتا وہاں سے آگے چل دیا۔ میں اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ میں نے کوارٹر کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور کمرے میں آ گیا۔ دونوں چارپائیاں خالی تھیں۔ جمیلہ وہاں نہیں تھی۔ میں پریشان ہو گیا۔ باتھ روم کمرے کے باہر ایک جانب تھا۔ میں نے جمیلہ کو آواز دی تو باتھ روم کے اندر سے اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"سپیرا چلا گیا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں چلا گیا۔ باہر آ جاؤ۔"

وہ باہر آئی تو میں نے دیکھا کہ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور خوف کے مارے اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور پیار کرتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں اتنا خوف کھاتی ہو۔ کوئی سپیرا اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور پھر میں جو

تمہارے پاس ہوں۔"

وہ خشک پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ میں اسے کمرے میں لے آیا۔ اسے چارپائی پر لٹا کر لحاف اوپر کر دیا اور کہا۔

"میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔"

اس کا جسم سرد ہو رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"نہیں نہیں تم میرے پاس ہی رہو۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اسے تسلی دینے لگا۔ وہ سخت خوف زدہ ہو رہی تھی۔ اگر مجھے انڈیا میں صرف سی آئی ڈی کی پریشانی ہوتی تو میں اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ میں آرمی کا سابق کمانڈو تھا اور اس قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونا جانتا تھا۔ لیکن سانپوں اور سپیروں کی جس مصیبت میں ہم پھنس گئے تھے اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ میں جمیلہ کو لے کر کسی دور دراز علاقے کی طرف نکل جاؤں یا جتنی جلدی ہو سکے بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچ جاؤں۔ دور دراز علاقوں میں نکل جانے سے بھی سپیروں اور سانپوں سے پیچھا چھڑانا مشکل نظر آتا تھا۔ حل ایک ہی تھا کہ میں جمیلہ کو لے کر پاکستان میں داخل ہو جاؤں۔ پاکستان ہمارے لیے سب سے بڑی پناہ گاہ تھی لیکن پاکستان پہنچنا میرے اختیار میں نہ تھا۔ اگر عام حالات ہوتے تو میں اپنی کمانڈو ٹریننگ کو استعمال میں لاتے ہوئے کسی نہ کسی جگہ سے از خود بارڈر کراس کرنے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن وہ عام حالات نہیں تھے۔ پاکستان اور بھارت ابھی تک جنگ کی حالت میں تھے اور دونوں طرف فوجیں بارڈر پر مورچہ بند تھیں۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو اور بات تھی' میرے ساتھ میری بیوی بھی تھی۔ اس کو ساتھ لے کر میں بھارتی فوج کے مورچوں کے نزدیک بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔

ابھی سوج غروب ہوا ہی تھا اور دن کی کچھ کچھ روشنی باقی تھی کہ مشتاق صاحب اپنی گاڑی پر آ گئے۔ کہنے لگے۔

"میرے میرے ساتھ آؤ۔ حاجی فرید صاحب کا کلکتے سے ایک گھنٹے بعد فون آنے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم خود ان سے بات کر لو میرے بات کرنے سے تمہاری تسلی نہیں ہو گی۔"

مشتاق صاحب نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ میں نے طے کر لیا کہ چاہے حاجی فرید کچھ کہیں میں انہیں بتا دوں گا کہ میں ان کے پاس کلکتے پہنچ رہا ہوں۔ اب کسی حالت میں بھی میرا جمیلہ کے ساتھ دلی میں رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ سپیرا کوئی عام سپیرا نہیں تھا بلکہ سنتھا ولی مٹھ کا پجاری سپیرا ہی تھا جو جمیلہ کی بو سونگھتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا تھا اور اب جمیلہ کی زندگی خطرے میں تھی۔ ہو سکتا تھا کہ حاجی فرید صاحب نے یہ پیغام دیتا ہو کہ کرم داد سے کہو کہ فوراً کلکتے چلا آئے۔ میں اسی وقت مشتاق صاحب کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ جانے لگا تو جمیلہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگی۔

"مجھے یہاں اکیلی چھوڑ کر نہ جاؤ۔"

اس کے لہجے میں عجیب قسم کی عاجزی تھی مگر حاجی صاحب سے خود بات کرنی بہت ضروری تھی۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"کلکتے سے حاجی صاحب کا فون آنے والا ہے انہوں نے ضرور ہمیں بلایا ہو گا۔ میں خود ان سے ساری باتیں طے کر لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ دروازے کو اندر سے بند کر لینا۔ یہاں کوئی نہیں آتا اور پھر میں بڑی جلدی مشتاق صاحب کی گاڑی پر ہی واپس آ جاؤں گا۔"

اور میں مشتاق صاحب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑا۔

مشتاق صاحب مجھے دلی کے ایک گنجان محلے میں لے آئے۔ یہاں ان کے کسی دوست کا مکان تھا۔ مشتاق صاحب مجھے اپنے ہوٹل میں نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ وہ خود یہاں آ کر کلکتے حاجی فرید کو فون کیا کرتے تھے۔ ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے۔ ٹیلی فون سامنے تپائی پر پڑا تھا۔ مشتاق صاحب بولے۔

"حاجی فرید نے ضرور تم لوگوں کے بارڈر کراس کرانے کا انتظام کر دیا ہو گا۔ تھوڑی دیر پہلے ان کا کلکتے سے فون آیا تھا۔ میرے دوست نے مجھے ہوٹل میں فون پر پیغام دیا کہ

حاجی صاحب ایک گھنٹے بعد فون کریں گے۔"

میں گومگو کی کیفیت میں تھا۔ لیکن دل میں عہد کر رکھا تھا کہ اگر کلکتے سے بلاوا نہ بھی آیا تب بھی میں آج رات کو نہیں تو کل دن کے وقت کلکتے جانے والی گاڑی میں سوار ہو جاؤں گا۔ میں کسی حالت میں بھی اب جمیلہ کو دلی میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ خود مجھ پر قتل کے جرم میں پکڑے جانے کی تلوار لٹک رہی تھی۔ مشتاق صاحب مجھ سے باتیں کرتے رہے اور میں بے توجہی سے ان کی باتیں سنتا تھا۔ ذہن طرح طرح کے خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ جب ایک گھنٹہ گزر گیا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ مشتاق صاحب نے ریسور اٹھا کر ہیلو کہا۔ پھر دس بارہ سیکنڈ تک کچھ سنتے رہے۔ آنکھوں کے اشارے پر انہوں نے مجھے بتا دیا کہ کلکتے سے حاجی صاحب کا ہی فون ہے۔ پھر انہوں نے فون پر قدرے اونچی آواز میں کہا۔

"حاجی صاحب! بہتر ہے کہ آپ خود کرم داد سے بات کر لیں۔ وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔"

اور انہوں نے ریسور مجھے دے دیا۔ میں نے ہیلو کہہ کر حاجی فرید کو اسلام علیکم کہا تو وہ بولے۔

"میاں کرم داد! برما کے بارڈر پر بڑی سختی ہے۔ ابھی حالات ایسے نہیں ہیں کہ تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔ تمہیں کچھ روز اور انتظار کرنا پڑے گا۔ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"میں آپ کی مہربانیوں کا بدلہ نہیں چکا سکتا حاجی صاحب! لیکن حالات کچھ ایسی شکل اختیار کر گئے ہیں کہ میں دلی میں مزید ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتا۔"

دوسری طرف سے حاجی صاحب کچھ کہنے لگے تو میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

"میں کلکتے آ رہا ہوں۔ میں آپ کے پاس نہیں ٹھہروں گا۔ کسی دوسری جگہ ٹھہروں گا۔ جب حالات موافق ہو جائیں گے تو اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔"

کہا کہ میں ابھی کلکتے نہ آؤں لیکن میں نے یہ کہہ کر کہ میں کل دلی سے روانہ ہو جاؤں گا، ریسور مشتاق صاحب کے حوالے کر دیا۔ لگتا تھا کہ حاجی فرید مشتاق صاحب کو کچھ سمجھا رہے ہیں کہ کرم داد کو ابھی دلی میں اپنے پاس ہی رکھو۔ مشتاق صاحب بار بار کہہ رہے تھے۔ میں کوشش کروں گا۔ میں کوشش کروں گا۔ فون بند ہو گیا۔ مشتاق صاحب نے ریسور کریڈل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میاں! حاجی صاحب تمہارے اور اپنے بھلے کی ہی بات کر رہے تھے۔ بنگال میں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ حاجی صاحب نے مجھے بتا دیا ہے کہ ان کے پاس سی آئی ڈی کا آدمی آیا تھا۔ شاید کسی نے مخبری کر دی ہوگی کہ تم ان کے پاس ٹھہرے تھے۔ بہرحال سارے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ حاجی فرید صاحب پر بھی کوئی ناگہانی آفت آ جائے۔"

میں نے کہا۔

"مشتاق صاحب! میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ حاجی فرید صاحب کی پوزیشن کا مجھے اپنے سے بڑھ کر خیال ہے۔ میں ان کے پاس نہیں ٹھہروں گا۔ میرے پاس کافی پیسے ہیں۔ ہم کسی چھوٹے سے ہوٹل میں کمرہ لے لیں گے۔"

"تو پھر تمہارا کیا پروگرام ہے؟" مشتاق صاحب نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "اگر آج رات کو کوئی گاڑی جاتی ہے تو ہم اس میں بیٹھ جائیں گے ورنہ دن کے وقت تو کوئی نہ کوئی گاڑی کلکتے ضرور جائے گی۔"

مشتاق صاحب نے سر کو نفی میں ہلایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جیسے تمہاری مرضی میاں اب میں تمہیں زبردستی تو روک نہیں سکتا۔ کل سوا نو بجے ہوڑہ میل جاتی ہے۔ اس میں چلے جانا۔ میں گاڑی لے کر آ جاؤں گا۔"

میں نے مشتاق صاحب کے آگے زیاہ اصرار کرنا مناسب خیال نہ کیا اور پھر ایک رات کی بات تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ رات بھی گزر جائے گی۔ یہ سوچ کر میں نے انہیں کہا۔

میں مشتاق صاحب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر ان کے رائے سینا والے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں ان کے ساتھ رہا۔ شام کی سیاہی دلی شہر کے آسمان پر بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ سڑکوں مکانوں اور دور و نزدیک کی پرانی اور نئی آبادیوں میں روشنیاں جھلملانے لگی تھیں۔ میں نے مشتاق صاحب سے پوچھا۔

"بدنام سمگلر اور غنڈوں کے سرغنہ شری راج کا کوئی آدمی میری جاسوسی کرنے تو آپ کے ہوٹل میں پھر نہیں آیا؟"

مشتاق صاحب گاڑی چلا رہے تھے۔ میں ان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ کار کے اندر کی فضا گرم تھی۔ باہر لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی رات سرد ہوتی جا رہی تھی۔ کہنے لگے۔

"شری راج کا کوئی خاص آدمی تو نہیں آیا اس کے ہاں جو میرا مسلمان واقف کار کام کرتا ہے اس کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ شری راج کو جمیلہ کے گورو دیو گری کے مندر سے فرار ہو جانے کا سخت صدمہ ہے اور اس کے خاص غنڈے تمہاری بیوی کی تلاش میں مدراس تک کی خاک چھان آئے ہیں۔"

اس طرح باتیں کرتے ہم لوگ رائے سینا کی بستی میں پہنچ گئے۔ میں نے دور سے اپنے کوارٹر کی طرف دیکھا۔ وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ جمیلہ نے اچھا کیا جو کوارٹر کے باہر کی بتی روشن نہیں کی۔ بتی جلتی دیکھ کر شبہ ہو سکتا ہے کہ یہاں ضرور کوئی رہتا ہوگا۔ مشتاق صاحب کو سی آئی ڈی کے آدمی کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مشتاق صاحب نے کوارٹر کے سامنے ایک طرف کر کے گاڑی روک لی۔

میں نے انہیں کہا کہ وہ کوارٹر میں چل کر ہمارے ساتھ چائے کی ایک پیالی پی لیں۔ انہوں نے بڑی خوش اخلاقی سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"میاں ہماری چائے تم پر ادھار رہی۔ صبح جلدی آ جاؤں گا۔ تمہارے اور بھابھی کے ساتھ چائے کی ایک پیالی پی کر تمہیں سٹیشن لے کر چلوں گا۔ اس وقت مجھے اجازت دو۔

پیچھے ہوٹل میں بڑے کام ہیں۔"

انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور گاڑی موڑ کر اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں کوارٹر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جمیلہ نے اندر سے کنڈی لگائی ہو گی۔ میں نے بند دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دو تین بار دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں انگلی سے دستک دے رہا تھا۔ چوتھی بار ہاتھ دروازے پر مار کر دستک دی تو دروازے کا ایک پٹ اندر چلا گیا۔ اندر سے دروازے کو کنڈی نہیں لگائی گئی تھی۔ مجھے جمیلہ کی لاپرواہی پر سخت غصہ آیا اور کمرے کی بتی روشن کر دی۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ جمیلہ شاید دوسرے کمرے میں چارپائی پر سو رہی تھی۔ یہ سوچ کر میں دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ دونوں چارپائیاں خالی پڑی تھیں۔ میرے بستر کا لحاف تہہ کیا ہوا تھا۔ جمیلہ کا لحاف اس طرح کھلا تھا جیسے وہ بستر سے نکل کر کہیں گئی ہو۔ مجھے خیال آیا کہ وہ باتھ روم میں ہوگی۔ میں باتھ روم کی طرف گیا۔ باتھ روم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے جمیلہ کو آواز دی۔ اندر سے کسی نے جواب نہ دیا۔ میں نے دو تین آوازیں دیں۔ جب کوئی جواب نہ آیا تو میں نے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے بتی جلا دی۔ باتھ روم خالی پڑا تھا۔ اب تو میں پریشان ہو گیا۔ میں نے کچن میں دیکھا جمیلہ وہاں بھی نہیں تھی۔ میں گھبرایا ہوا کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ کوارٹر کے پیچھے آ کر دیکھا۔ وہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ جمیلہ کا کہیں نام نشان تک نہیں تھا۔ دوڑ کر واپس اندر آ گیا۔ جمیلہ کی دو جوتیاں تھیں۔ ایک چپل تھی اور ایک گرگابی تھی۔ گرگابی غائب تھی۔ چپل پلنگ کے پاس ہی پڑی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی مرضی سے گرگابی پہن کر کہیں گئی ہے۔ مگر وہ کہاں جا سکتی تھی۔ ارد گرد کوئی مارکیٹ یا سٹور بھی نہیں تھا جہاں وہ کچھ خریدنے نکل گئی ہو۔ نالے کے پل پر بھٹیارن کا تندور ہی تھا۔ کہیں یہ بیوقوف عورت تندور پر روٹیاں لگوانے کو نہیں چلی گئی؟ اس نے سوچا ہو کہ آج تندور کی لگی ہوئی روٹیاں کھائی جائیں۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مگر جمیلہ اکثر اس قسم کی غیر ذمے داری کی حرکتیں کیا کرتی تھی۔ میں نے

کوارٹر کے دروازے میں آکر دور بھٹیارن کے تندور کی طرف نگاہ ڈالی۔ تندور کی لالٹین جل رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بھٹیارن روٹیاں لگا رہی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے اس طرف چلنے لگا۔ دل میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ یا اللہ پاک میری جمیلہ تندور پر ہی ہو۔ جیسے جیسے تندور قریب ہو رہا تھا وہاں کا دھندلا منظر صاف ہوتا جا رہا تھا۔ تندور پر بھٹیارن روٹیاں لگا رہی تھی اور اس کے سامنے دو کم عمر لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ تندور میں آگ روشن تھی جس کی چمک ادھیڑ عمر بھٹیارن کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ جمیلہ وہاں نہیں تھی۔ میں نے سوچا شاید وہ روٹیاں لگوا کر لے گئی ہو اور یونہی سیر کرنے کی خاطر دوسری طرف سے کوارٹر کی طرف گئی ہو۔ میرا دل یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ جمیلہ کہیں غائب ہو گئی ہے یا مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس کی گرم چادر بھی اس کی چارپائی پر نہیں تھی۔ بھٹیارن نے میری طرف سر اٹھا کر دیکھا اور پوچھا۔

”بابو، روٹیاں لینی ہیں؟“

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں بہن جی۔ دو روٹیاں دے دیں۔“

بھٹیارن نے چھابے میں سے دو روٹیاں نکال کر کاغذ میں لپیٹیں اور مجھے پکڑا دیں۔ میں نے اسے پیسے دیے اور یونہی بظاہر بے نیازی سے پوچھا۔

”بہن جی! ادھر کوئی بڑی عورت تو روٹیاں لینے نہیں آئی تھی؟“

بھٹیارن بولی۔

”بھائی یہاں تو چھوٹے بچے ہی روٹیاں لگوانے آتے ہیں۔ کیا تم نے اپنی کسی نوکرانی کو بھیجا تھا؟“

میں نے یونہی کہہ دیا۔

”ہاں، نوکرانی کو بھیجا تھا۔“

پھر میں نے اسے جمیلہ کا حلیہ اور لباس اور خاص طور پر اس کی چادر کا رنگ اور گرگابی کا بتایا تو وہ بولی۔

”بھائی یہ لباس کسی نوکرانی کا تو نہیں ہو سکتا ایسی کوئی عورت یہاں نہیں آئی۔“

میں بوجھل دل اور پریشان دماغ کے ساتھ وہاں سے واپس ہو گیا۔ دماغ سنسنا رہا تھا۔ آخر جمیلہ کہاں چلی گئی؟ کیا اسے کوئی ورغلا کر لے گیا ہو گا؟ مگر وہ ایسی عورت نہیں ہے۔ کہیں اسے پولیس پکڑ کر نہ لے گئی ہو۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ جس سی آئی ڈی والے کو میں نے قتل کیا تھا پولیس اس کی تلاش میں وہاں آ گئی ہو اور جمیلہ کو پکڑ کر تھانے لے گئی ہو۔ اس خیال سے میرا جسم ایک دم سرد پڑ گیا۔ اگر ایسی بات ہو گئی تو پھر جمیلہ کو میں پولیس کی حراست سے کیسے واپس لا سکوں گا۔ اگر میں خود تھانے گیا تو پولیس مجھے بھی وہیں بٹھا لے گی اور عین ممکن ہے کہ ان پر میرے مفرور جنگی قیدی ہونے کا راز بھی کھل جائے اور میرے اور جمیلہ کے لیے پاکستان جانے والے راستے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں۔ اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں کسی جگہ سے مشتاق علی صاحب کو ان کے ہوٹل فون کر کے بلاؤں اور ان سے کہوں کہ وہ اپنے طور پر علاقے کے تھانے سے معلوم کریں کہ جمیلہ پولیس کی حراست میں تو نہیں ہے۔

میں نے کاغذ میں لپٹی ہوئی روٹیاں کوارٹر میں رکھیں اور دروازے پر تالا لگا کر مشتاق صاحب کو فون کرنے کے لیے نکل پڑا۔ کوارٹر کے آگے ایک کچا راستہ تھا۔ جو کچھ دور جا کر پکی سڑک کی طرف مڑ جاتا تھا۔ پکی سڑک پر کچھ فاصلے پر کچھ دکانیں تھیں۔ جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ وہاں اگر فون ہوا تو میں وہاں سے مشتاق صاحب کو فون کر سکتا تھا۔ میں جلدی جلدی کچے راستے پر چل رہا تھا۔ کوئی پچیس تیس قدم چلنے کے بعد نیم اندھیرے میں مجھے ایک درخت کے نیچے لحاف اوڑھ کر بیٹھا ہوا ایک فقیر دکھائی دیا۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو اس نے مجھے آواز دی۔

”بابو! تم اس خالی کوارٹر میں رہتے ہو؟ میں رک گیا۔ فقیر کے پاس آ کر دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

”ہاں بابا! میں وہیں رہتا ہوں۔ کیوں کیا بات ہے؟“

وہ بولا۔ ”تمہارے ساتھ ایک عورت بھی رہتی ہے؟“

"ہاں وہ میری بیوی ہے۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی تھی۔ فقیر بولا۔

"کیا تم اس کو تلاش کرتے پھرتے ہو؟"

"ہاں۔"

میرے منہ سے اپنے آپ یہ لفظ نکل گیا۔ فقیر بولا۔

"جب تم کسی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گئے تھے تو تمہارے جانے کے بعد ایک سپیرا آیا تھا۔ وہ تمہارے مکان کے آگے بیٹھ کر بین بجانے لگا۔ اندر سے تمہاری عورت نکل کر آئی۔ سپیرے نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔"

میں یہ سن کر کھڑے کھڑے جیسے پتھر ہو گیا۔ میرا حلق سوکھ گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے پوچھا۔

"وہ کدھر گئے تھے؟"

فقیر بولا۔

"نالے والے پل کی طرف گئے تھے۔ آگے اللہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔"

مجھے اس وقت اور کچھ نہ سوجھا۔ سوکھے نالے کے پل کی طرف دوڑ پڑا۔ مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ ان لوگوں کو گئے دو ڈھائی گھنٹے گزر گئے ہیں۔ اب تک خدا جانے وہ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہوں گے۔ سب سے زیادہ دکھ اور تشویش مجھے اس بات کی تھی کہ میری بیوی اپنی مرضی سے سپیرے کے ساتھ چلی گئی۔ یہ وہی سپیرا ہو سکتا تھا جو تیسرے پہر میرے مکان پر آیا تھا اور جس کی بین کی آواز پر جمیلہ باتھ روم میں چھپ گئی تھی۔ میں نالے کے پل کی طرف بھاگا جا رہا تھا اور یہ سوچ سوچ کر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ جمیلہ کو سپیرا زبردستی اٹھا کر نہیں لے گیا بلکہ وہ خود اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی ہے۔ اس فرار میں اس کی اپنی مرضی بھی شامل تھی۔ ان حالات میں میری کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ جب لوٹا ہوا مال اپنے آپ کو چھپانے میں خود چور کی مدد کر رہا ہو تو اس کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود میں جمیلہ سے مایوس نہیں ہوا

تھا۔ مجھے اس حقیقت کا احساس تھا کہ جمیلہ ان پجاری سپیروں کے طلسمی منتروں کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس پر ان طلسمی منتروں کا اثر ہے اور وہ ان منتروں کے اثر کی وجہ سے ہی سپیرے کے ساتھ چل پڑی تھی۔ اس میں اس کی اپنی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ یہ سارا اثر سپیروں کے منتروں کا تھا۔ اگر وہ ان شیطانوں کے زیر اثر نہ ہوتی تو سپیرے کے ساتھ کبھی نہ جاتی۔ یہی حقیقت میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی اور میں جمیلہ کی تلاش میں دیوارنہ وار دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ رات کا اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا۔

خشک نالے کا پل رات کی تاریکی اور کہرے میں دھندلا ہو رہا تھا۔ میں پل پر سے گزر گیا۔ ایک کچا راستہ تھا جس پر میں دوڑتا جا رہا تھا۔ سامنے دور کسی بستی کی روشنیاں کہرے اور اندھیرے میں جھلملا رہی تھیں۔ میرا رخ اس بستی کی طرف تھا۔ بستی کی روشنیوں کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ میں بری طرح سے ہانپ رہا تھا۔ کمانڈو ٹریننگ اور فوجی سروس کے زمانے میں میں بہت دوڑا کرتا تھا۔ مگر اب میں حاضر سروس میں نہیں رہا تھا اور اس بات کو کافی زمانہ گزر گیا تھا۔ زیادہ دوڑنے سے مجھے سانس چڑھ گیا تھا۔ میں نے رک کر لمبے لمبے سانس لیے۔ جب میرا سانس درست ہوا تو میں بستی کی طرف بڑھا۔ یہ دلی کی کوئی نئی بستی نہیں تھی۔ پرانے پرانے ایک منزلہ دو منزلہ مکان تھے جو رات کی تاریکی اور کہرے میں ساکت کھڑے تھے۔ گلیوں پر خاموشی طاری تھی۔ سردی کی وجہ سے کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ بستی کے شروع میں ایک گلی کی نکڑ پر درزی کی دکان تھی۔ ایک آدمی کمبل اوڑھے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ سامنے تختے پر سنگر کی دو تین مشینیں پڑی تھیں۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا اور پوچھا۔

"بھائی صاحب! آپ نے اس طرف ایک مرد اور عورت کو جاتے تو نہیں دیکھا۔"

اس آدمی نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"میاں! ادھر سے کوئی مرد اور عورت نہیں گزری۔ ایک گھنٹے سے تو میں اسی جگہ بیٹھا ہوں۔ بات کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "کچھ نہیں۔"

اور آگے بڑھ گیا۔ بستی کی دکانیں بند تھیں۔ کوئی آدمی بھی چل پھر نہیں رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سپیرا میری بیوی کو لے کر کس طرف گیا ہو گا۔ چاروں طرف کھلا علاقہ تھا۔ رات کا اندھیرا تھا۔ عجیب کش مکش کے عالم میں تھا کہ کس طرف جاؤں، کس طرف نہ جاؤں۔ میں پرانی بستی سے باہر نکلا تو اس کی دوسری جانب پکی سڑک تھی۔ سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ایک جگہ کافی روشنی ہو رہی تھی۔ جلدی جلدی وہاں پہنچا۔ یہ ایک سٹور تھا۔ یہاں ٹیلی فون بھی پڑا تھا۔ میں نے سٹور کے مالک کی اجازت سے مشتاق علی صاحب کے ہوٹل کا خاص نمبر گھمایا۔ تھوڑی دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ پھر مشتاق صاحب کی آواز آئی۔

میں نے کہا۔

"میں کرم داد بول رہا ہوں۔ ایک عجیب مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ آپ سے فوری طور پر ملاقات بے حد ضروری ہے۔"

وہ بولے۔

"تم کہاں پر ہو؟"

میں نے انہیں بتایا کہ میں اپنے کوارٹر کے قریب ہی ایک جگہ سے فون کر رہا ہوں۔ انہوں نے کہا۔

"تم کوارٹر میں چلو۔ میں آ رہا ہوں۔"

میں وہاں سے واپس اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مشتاق صاحب بھی اپنی گاڑی پر آ گئے۔ میں نے انہیں سارا واقعہ سنایا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے۔

"یہ کیسے ہو گیا؟ تمہاری بیوی نے کوئی شور نہیں مچایا؟"

میں نے کہا۔

"اس نے ضرور شور مچایا ہو گا مگر لگتا ہے وہ دو تین آدمی تھے۔ انہوں نے جیلہ کو قابو کر لیا ہو گیا اور پھر اس ویران علاقے میں وہ شور بھی مچاتی تو کون سنتا تھا؟"

میں نے مشتاق صاحب کو بالکل نہیں بتایا تھا کہ جیلہ کو اغوا کرنے والا ایک سپیرا تھا اور یہ کہ وہ از خود اس کے ساتھ گئی ہے۔ یہ بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور میں بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس میں میری بے عزتی تھی۔ میں نے یہی کہا کہ دو تین آدمی میری عدم موجودگی میں آئے اور میری بیوی کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتہ چل گیا کہ جیلہ بھابھی کو اغوا کیا گیا ہے؟"

مشتاق صاحب کے اس سوال پر میں نے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے فقیر کا حوالہ بھی نہ دیا۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے وہ خود فقیر کے پاس جا کر پوچھ گچھ نہ شروع کر دیں۔ میں نے صرف اتنا بتایا کہ جب میں اپنی بیوی کی تلاش میں بستی کی طرف جا رہا تھا تو ایک آدمی نے مجھے روک کر بتایا کہ تمہاری بیوی کو دو آدمی کوارٹر میں سے نکال کر زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ ویگن لے کر آئے تھے۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"عجیب حالات بن گئے ہیں۔ ہم پولیس میں رپورٹ درج بھی نہیں کرا سکتے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ اسی بدمعاش شری راج کے آدمی ہی ہو سکتے ہیں۔ بہرحال تم فکر نہ کرو۔ خاموشی سے اسی کوارٹر میں ہی بیٹھے رہو۔ میں سب معلوم کرتا ہوں۔"

اس بات کا امکان تھا کہ جیلہ کو دلی کے مافیا چیف اور جرائم پیشوں کے سرغنہ شری راج نے ہی اغوا کرایا ہو۔ کیونکہ شری راج کو اس بات کا سخت دکھ تھا کہ اس نے جیلہ کو اپنے گورو دیو گری کو تحفے کے طور پر دیا تھا اور وہ ان کے آشرم سے فرار ہو گئی تھی۔ اس کے آدمی پہلے ہی سے جیلہ کی تلاش میں تھے۔ یہ سپیرا شری راج کا آدمی بھی ہو سکتا تھا۔ مشتاق صاحب کا ایک پرانا واقف کار جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں شری راج کے گروہ میں کام کرتا تھا۔ صرف اس کے ذریعے ہی پتہ چل سکتا تھا کہ میری بیوی کو شری راج نے ہی دوبارہ اغوا کرایا ہے یا نہیں۔

مشتاق صاحب کے جانے کے بعد میں نے وہ رات بڑے عذاب کی رات گزاری۔ بیڈ روم میں جملہ کے کچھ کپڑے کھونٹی پر لٹک رہے تھے۔ میری نگاہ ان کی طرف جاتی تو میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں میں کب سویا کب جاگا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ میں نے کچن میں جا کر چائے بنائی اور وہیں پرانی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چائے جیسے زہر بن کر حلق میں اتر رہی تھی۔ خیال بار بار جمیلہ کی طرف جاتا تھا کہ وہ کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی؟ وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی۔ اسے شیطانی منتروں کے زیر اثر اغوا کیا گیا ہے۔ خدا جانے سپیرا اسے لے کر کہاں چلا گیا ہوگا۔ اگر وہ شری راج کا سپیرا تھا تو جمیلہ کو یقیناً واپس گورو دیوگری کے آشرم میں پہنچا دیا ہوگا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس بار دیوگری کے آشرم میں جا کر جمیلہ کو بھی واپس لاؤں گا اور اس شیطان صفت پجاری دیوگری کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مشتاق صاحب نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ میں کوارٹر والے مکان میں ہی رہوں۔ میں کمرے میں ہی رہا۔ دوپہر کے وقت مشتاق صاحب آئے۔ کہنے لگے۔

“میاں! میں نے اپنے آدمی سے سارا پتہ کروا لیا ہے۔ تمہاری بیوی شری راج نے اغوا نہیں کروائی۔ شری راج کے جاسوس تو ابھی تک جمیلہ بھابھی کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔”

میں چپ رہا۔ کیونکہ اب اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ جمیلہ کو ناگ منتروں کے زیر اثر اغوا کر کے لے جانے والا سپیرا سنتھا ولی مٹھ کا پجاری سپیرا ہی تھا اور یہ بات میں مشتاق صاحب کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ مجھے سر جھکائے خاموش بیٹھا دیکھ کر مشتاق صاحب بولے۔

“میاں! تم فکر نہ کرو میرا بھی یہاں کافی اثر رسوخ ہے۔ میں تمہاری بیوی کی تلاش میں چاروں طرف اپنے آدمی دوڑا دیتا ہوں۔ کہیں نہ کہیں سے اس کا ضرور سراغ مل جائے گا۔”

“لیکن مجھے اب دوبارہ وسطی ہند کے خطرناک جنگلوں میں واقع سنتھا ولی مٹ کی طرف جانا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جمیلہ کو پجاری سپیرا وہیں لے گیا ہے۔ اس وقت مجھے اپنی ہمدرد اور مہربان دوست کاویری بہت یاد آئی۔ مجھے سنتھا ولی مٹھ کے جنگل کا راستہ پوری طرح یاد نہیں رہا تھا۔ اگر کاویری میرے ساتھ ہوتی تو وہ میری راہنمائی کر سکتی تھی۔ خدا جانے وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ زندہ بھی ہو گی یا نہیں۔ میں نے اسی رات سنبھل پور اور دیوگڑھ کے درمیانی جنگل میں واقع سنتھا ولی مٹھ کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔

مشتاق صاحب مجھے تسلیاں دے رہے تھے کہ میں فکر نہ کرو۔ وہ بہت جلد جمیلہ کو ڈھونڈھ نکالیں گے اور میں سوچ رہا تھا کہ جلدی سے دن گزرے اور میں رات کے اندھیرے میں دلی ریلوے سٹیشن پر جا کر سنبھل پور کی طرف روانہ ہو جاؤں۔ مشتاق صاحب اگلے روز آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ باقی کا سارا دن میں نے کوارٹر کے بند کمروں میں ایک قیدی کی طرح بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے گزارا۔ جب شام کا جھٹ پٹا پھیلنے لگا تو میں نے تیاری شروع کر دی۔ میرے پاس ڈیڑھ دو ہزار روپے کی رقم ابھی تک موجود تھی۔ کمانڈو چاقو اور ریوالور بھی تھا جس میں کچھ گولیاں ابھی بھری ہوئی تھیں۔ کچن میں جا کر جو تھوڑا بہت کھانا پڑا تھا کھایا۔ جیکٹ پہنی، ریوالور اور چاقو جیکٹ کی اندر والی جیبوں میں سنبھال کر رکھ لیا۔ ہر طرح سے تیار ہو کر میں بیٹھک والے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ رات کا اندھیرا چھا جائے تو سٹیشن کی طرف نکل چلوں۔

اچانک باہر کسی موٹر گاڑی کی آواز آئی۔ کوئی موٹر کوارٹر کے سامنے آ کر رک گئی۔ میں یہی سمجھا کہ مشتاق صاحب کو جمیلہ کا کوئی سراغ مل گیا ہے اور وہ مجھے خوش خبری سنانے آئے ہیں۔ میری قسمت اچھی تھی کہ میں نے دروازہ نہیں کھولا تھا بلکہ دروازے کی درز میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ ابھی شام کا جھٹپٹا ہی تھا۔ زیادہ اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک جیپ کو دیکھا جس میں سے چار پولیس کے سپاہی اترے اور کوارٹر کی طرف بڑھے۔ ایک بار تو میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ مگر میں نے اپنے ہوش و حواس سنبھال رکھے۔ تیزی سے دروازے سے ہٹ کر کوارٹر کی عقبی احاطے کی طرف دوڑا۔ وہاں پانچ چھ فٹ اونچی دیوار تھی۔ دوڑ کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اوپر چڑھتے ہی دوسری طرف جھاڑیوں میں چھلانگ لگائی اور ویران میدان میں جتنی تیز دوڑ سکتا تھا دوڑنے لگا۔ شام کے دھندلکے نے مجھے اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ یہ علاقہ تو پہلے مکان والا تھا اس مکان والا نہیں۔

میں دوڑتے دوڑتے کافی دور نکل گیا۔ میدان ختم ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ

دلی کا کون سا علاقہ ہے اور آگے کون سا علاقہ آئے گا۔ اب میں دوڑ نہیں رہا تھا مگر تیز تیز ضرور چل رہا تھا۔ یہی ڈر لگا تھا کہ پولیس ضرور میرا پیچھا کر رہی ہوگی۔ میرے چاروں طرف دلی شہر کی نئی پرانی آبادیوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ مگر یہ روشنیاں مجھ سے بہت فاصلے پر تھیں اور میں شام کے بڑھتے پھیلتے اندھیرے میں ایک ایسے علاقے سے گزر رہا تھا جہاں کبھی جھاڑیاں آ جاتی تھیں اور کبھی پتھریلی زمین شروع ہو جاتی تھی۔ آخر میں ایک پکی سڑک پر نکل آیا۔ یہ سڑک چھوٹی تھی اور ویران علاقے میں سے گزرتی تھی۔ اس کی ایک جانب کسی ٹیلے کی دیوار تھی۔ میں نے دور نظر آتی روشنیوں کو نگاہ میں رکھا اور سڑک پر چلنے لگا۔ اس وقت اچانک مجھے پیچھے سے کسی موٹر گاڑی کی آواز سنائی دی۔ میں یہی سمجھا کہ یہ پولیس کی گاڑی ہے اور میرے پیچھے لگی ہے۔ میں نے گھبرا کر بھاگنا شروع کر دیا۔ سڑک ٹیلے کے ساتھ ہی ایک طرف کو مڑ گئی تھی۔ جب میں سڑک مڑنے لگا تو میرے پیچھے موٹر گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑی۔ میں نے اور تیز بھاگنا شروع کر دیا۔

ٹیلہ ختم ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب میرا بچنا مشکل ہے۔ پولیس کی گاڑی میرے سر پر آ گئی تھی اور سامنے سڑک خالی پڑی تھی۔ میں گاڑی کی روشنی میں پولیس کو صاف نظر آ جاؤں گا اور عین ممکن ہے مجھے بھاگتا دیکھ کر پولیس مجھ پر فائرنگ شروع کر دے۔ میں نے گھبراہٹ میں دائیں بائیں دیکھا۔ بائیں جانب مجھے ایک کوٹھڑی سی اندھیرے میں دکھائی دی۔ میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے اس کوٹھڑی کی طرف دوڑا۔ کوٹھڑی میں مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی اور ایک جوگی ٹائپ کا آدمی بھورا کمبل اوڑھے ایک مورتی کے آگے بیٹھا پوجا کر رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی کہا۔

”مہاراج مجھے بچا لیں۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہے۔ میں بے قصور ہوں۔“

جوگی کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور کوٹھری کی دیوار کے ساتھ جو چارپائی بچھی تھی اس طرف اشارہ کر کے بولا۔

”مورکھ! جا اس کھاٹ کے نیچے جا کر چھپ جا۔“

چارپائی پر کمبل بچھا ہوا تھا جو چارپائی کے اوپر سے زمین تک لٹک رہا تھا۔ میں جلدی سے چارپائی کے نیچے گھس گیا۔ مجھے دروازہ بند کرنے کی آوز آئی۔ جوگی نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ جوگی مورتی کی پوجا کرتے وقت کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔ اس نے دوبارہ گنگنانا شروع کر دیا۔ خدا جانے وہ کیا پڑھ رہا تھا۔

میرے کان باہر کی خاموشی پر لگے ہوئے تھے۔ جب میں نے باہر کسی موٹر گاڑی کے رکنے کی آواز سنی تو میرا دل خوف کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں کوئی بزدل آدمی نہیں تھا۔ میرے پاس ریوالور بھی تھا مگر میں ایسے حالات میں پھنس گیا تھا کہ میری بہادری بھی وہاں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پولیس کی رائفلوں کے سامنے میرے ریوالور کی چھ سات گولیاں میرے کسی کام نہ آ سکتی تھیں۔ باہر سے آدمیوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آوازیں کوٹھڑی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ جوگی نے آہستہ سے کہا۔

”مورکھ! چپ رہنا۔ بولنا مت۔“

کسی نے دروازے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

”جو کوئی اندر ہے باہر آ جائے۔ ہم پولیس کے سپاہی ہیں۔“

میرا خدشہ بالکل درست تھا۔ بے چارے جوگی نے مجھے ایک مصیبت کا مارا انسان سمجھ کر پناہ ضرور دی تھی مگر وہ پولیس سے مجھے بچا نہیں سکتا تھا۔ پولیس اگر اس کوٹھڑی کی طرف آئی تھی تو اس نے ضرور مجھے اس طرف جاتے جیپ یا ویگن کی روشنی میں دیکھ لیا ہو گا۔ جوگی نے بڑی جلالی آواز میں پوچھا۔

”کون مورکھ ہماری پوجا بھنگ کرنے اس سمے آیا ہے؟“ باہر سے آواز آئی۔

”دروازہ کھولو۔ پولیس پاکستانی جاسوس کی تلاش میں آئی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی دروازہ دھڑاک سے کھلنے کی آواز آئی۔ میری آنکھوں کے آگے کوٹھڑی کے فرش تک بوسیدہ کمبل لٹک رہا تھا۔ ایک طرف سے کمبل ذرا سا پیچھے ہٹا ہوا تھا اور وہاں ایک درز سی بن گئی تھی۔ میں نے اس درز میں سے لیٹے لیٹے دیکھا۔ تین پولیس کے سپاہی جن کے پاس رائفلیں تھیں کوٹھڑی میں گھس کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں

سے ایک شاید تھانیدار تھا۔ اس کی مونچھیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ تینوں ہندو ہی تھے۔ تھانیدار ذرا آگے ہو کر کھڑا تھا۔ جوگی اپنی جگہ پر بڑے اطمینان سے آلتی پالتی مارے بیٹھا مورتی کی پوجا کر رہا تھا۔ تھانیدار نے کہا۔

"مہاراج! ایک پاکستانی جاسوس بھاگ کر اس طرف آیا ہے۔ ہم اس کو پکڑنے آئے ہیں۔"

جوگی نے بلند اور رعب والی آواز میں کہا۔ "تمہارا کیا نام ہے مورکھ؟"

"میرا نام جگن ناتھ ہے اور میں ہیڈ کانسٹیبل ہوں۔" تھانیدار نے کہا۔

جوگی نے کہا۔ "نام تم نے جگن ناتھ پوری کے دیوتا کا رکھا ہے اور اس کے چیلے کی پوجا بھنگ کر رہے ہو؟ مورکھ میں تمہیں ایسا شراپ دوں گا کہ تیری سات سنتانیں نشٹ ہو جائیں گی۔ ان مورکھوں کو لے کر یہاں سے بھاگ جا۔ ہماری پوجا بھنگ نہ کر۔"

ہندو ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"مگر مہاراج! ہم نے پاکستانی جاسوس کو اسی طرف آتے دیکھا تھا۔"

اس دفعہ جوگی بہت جلال میں آ گیا۔ اس نے کڑک کر کہا۔

"جے جگن پوری جگت ناتھری! جگن ناتھ تو پاپی ہے، ہماری کٹیا سے نکل جا۔ یہاں کوئی جاسوس واسوس نہیں آیا۔ نکل جا مورکھ۔ جے جگن پوری۔ جے جگت ناتھری۔"

"ناراض نہ ہوں مہاراج! ہم جاتے ہیں۔"

ہندو ہیڈ کانسٹیبل نے ہاتھ باندھ کر یہ جملہ ادا کیا اور پولیس کے سپاہیوں کو لے کر کوٹھڑی سے نکل گیا۔ جوگی نے کڑک کر کہا۔

"مورکھ! کٹیا کا دروازہ بند کرنا مت بھولنا۔"

ہندو ہیڈ کانسٹیبل نے کٹیا سے نکلتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ جوگی نے دوبارہ پوجا پاٹھ شروع کر دی۔ باہر سے پولیس کی گاڑی کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ جب گاڑی کی آواز دور جا کر غائب ہو گئی تو جوگی نے کہا۔ "مورکھ! کھاٹ کے نیچے سے باہر نکل آ۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آئی ہوئی بلا ٹل گئی تھی۔ میں اس بات پر بڑا حیران ہوا کہ

جوگی نے جو خود ہندو تھا یہ سن کر بھی کہ میں پاکستانی جاسوس ہوں اور مسلمان ہوں، مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ میں چارپائی کے نیچے سے نکل آیا۔ اب میں نے لالٹین کی روشنی میں جوگی کو غور سے دیکھا۔ اس کی عمر تیس پینتیس سال کی ہو گی۔ سانولی رنگت تھی۔ سر کے بال جوگیوں کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ ماتھے پر تلک کی تین سرخ لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ لباس گیروا تھا، کندھے پر بھورا کمبل تھا۔ ناک تیکھی اور آنکھیں بڑی چمکیلی تھیں۔ اس جوگی کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ جو مسکراہٹ بھی نہیں تھی بلکہ مسکراہٹ اور سنجیدگی کے درمیان کوئی کیفیت تھی۔ لگتا کہ وہ بے معلوم انداز میں مسکرا رہا تھا۔ دوسرے لمحے لگتا کہ نہیں وہ بالکل نہیں مسکرا رہا۔ اس کے سامنے کسی دیوتا کی پیتل کی چھوٹی سی مورتی تھی جو ایک چوکی پر رکھی ہوئی تھی اور مورتی کے آگے گیندے اور رتن جو کے تین چار پھول پڑے تھے۔ جوگی نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بڑے ادب سے اس کے سامنے بچھے ہوئے بوریئے پر بیٹھ گیا۔ وہ میرا محسن تھا۔ اس نے ایک طرح سے میری جان بچائی تھی۔ مجھ پر اس کا ادب کرنا فرض تھا۔ وہ اگر چاہتا تو مجھے پولیس کے حوالے کر سکتا تھا اور پولیس نے مجھے زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔ پولیس کو میرے بارے میں سب کچھ پتہ چل چکا تھا کہ میں جنگی قیدیوں کی ٹرین سے بھاگا ہوا پاکستانی ہوں اور ان کے انٹیلی جینس کے افسر کو میں نے ہی ہلاک کیا ہے۔ ظاہر تھا کہ اگر ہیڈ کانسٹیبل نے یہ کہا تھا کہ میں پاکستانی جاسوس ہوں

بھجن کیرتن کی کتاب ابھی تک جوگی کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ اپنے بوریئے کے نیچے سے ایک سگریٹ نکال کر میری طرف بڑھایا اور کہا۔

"مورکھ! سگریٹ پیئے گا؟"

میں نے کہا۔ "مہاراج! میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

جوگی نے کہا۔ "مورکھ! یہ چرس والا سگریٹ ہے۔ پی لے۔ سارے جنم روشن ہو جائیں گے۔"

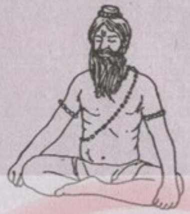

میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں مہاراج! میں نشہ نہیں کیا کرتا۔"

جوگی نے ماچس کی تیلی جلا کر نشے والا سگریٹ سلگایا۔ اس کا ایک لمبا کش لگا کر کافی دیر تک دھواں اپنے اندر رکھا۔ پھر آہستہ آہستہ دھواں منہ اور ناک سے باہر نکالتے ہوئے مسکرایا۔ یہ جوگی مجھے عام ہندو جوگیوں سے مختلف تھا۔ ویسے بھی اس نے مجھے پولیس سے بچایا تھا۔ وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ جوگی کی کٹیا سے نکل کر مجھے کسی ایسے ویران علاقے میں سے ہو کر سٹیشن پر جانا چاہیے جہاں پولیس کا خطرہ نہ ہو۔ پھر خیال آیا کہ پولیس نے تو ریلوے سٹیشن پر بھی ناکہ بندی کر رکھی ہوگی۔ میں ان خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ جوگی بولا۔

"یہ تو مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تو مسلمان ہے۔ پولیس نے تجھے میری کٹیا کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ یونہی یہاں نہیں آئی تھی۔ اب یہ بتا کہ سچ مچ تو پاکستان کا جاسوس ہے؟"

میں نے کہا۔

"مہاراج میں پاکستانی ضرور ہوں مگر جاسوس وغیرہ کچھ بھی نہیں ہوں۔ جب بنگلہ دیش بنا تو میں ڈھاکے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ مکتی باہنی والوں نے لوٹ مار اور قتل عام شروع کیا تو میرے گھر کو بھی لوٹ لیا اور میری بیوی کو اٹھا کر لے گئے۔ میں جان بچا کر

بارڈر کراس کر کے کلکتے پہنچ گیا۔ اب اپنی بیوی کی تلاش میں دربدر مارا مارا پھر رہا ہوں۔ پولیس نے ایک بار مجھے پاکستانی جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا' میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ بس یہ ہے میری رام کہانی۔ میں تو مصیبت کا مارا ہوا ہوں۔"

جب میں جوگی کو اپنی داستان غم سناتا رہا جوگی نے چرس والا سگریٹ پورے کا پورا پی لیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میری داستان وہ بڑی توجہ سے سنتا رہا تھا۔ کسی وقت یوں سر ہلا دیتا جیسے کہہ رہا ہو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں چپ ہو گیا تو جوگی نے مجھ سے پوچھا۔

"جو لوگ تمہاری پتنی کو اٹھا کر لے گئے تھے کیا ان کی شکل صورت تم کو یاد ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ اپنی دکان پر تھا۔ محلے والوں نے بتایا کہ میری بیوی کو مکتی باہنی والے اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

جوگی افسوس کے ساتھ بولا۔

"بہت برا کیا ان لوگوں نے---- مورکھ تھے۔ اب تم کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے جوگی کو پجاری کی دیوگری اور سانپوں سپیروں والا قصہ بالکل نہیں سنایا تھا۔ اس کو سنانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے جواب دیا۔

"مجھے کسی نے بتایا تھا کہ میری بیوی کو وہ لوگ دیوگڑھ اور سنبھل پور کی طرف لے گئے ہیں۔ اپنے ایک مہربان کے کوارٹر سے نکل کر ریلوے سٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ پولیس کی جیپ اپنی طرف آتی دیکھ کر دوڑ پڑا۔"

جوگی آنکھیں بند کیے جیسے مراقبے میں جا چکا تھا۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تو اس کی آنکھیں لالٹین کی روشنی میں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مورکھ ہو۔ میرے آگے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم انتریامی کے داسی ہیں، سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ تمہاری پتنی کو ایک دھشٹ سپیرا اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ تمہاری پتنی اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی ہے۔"

جب میں نے دیکھا کہ اس شخص کو سب کچھ معلوم ہوگیا ہے اور یہ میرا ہمدرد بھی ہے تو میں نے اسے ساری کہانی کھول کر بیان کر دی۔ جب تک میں اپنی بپتا سناتا رہا وہ مسکراتا رہا۔ کہنے لگا۔

"تمہاری پتنی پر ناگ دیوتا کے منتر پھونکے گئے ہیں۔ وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔"

میں نے عرض کی۔

"مہاراج! میری بیوی پر منتروں کا اثر کیسے اترے گا؟ میری مدد کریں۔ میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔"

وہ بولا۔ "مورکھ ہو۔ پرنتو مسلمان ہو تو کیا ہوا۔ تم پر مصیبت آن پڑی ہے۔ ہمیں گیان دھیان سے معلوم ہوگیا ہے کہ بے قصور ہو۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو سچ ہے۔ ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے۔"

میں نے کہا۔

"مہاراج میں آپ کا احسان ساری زندگی نہیں بھلاؤں گا۔"

جوگی کے چہرے پر وہی بے معلوم سی مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔

"مورکھ! ہم کسی پر احسان نہیں کرتے۔ احسان تو سنسار میں رہنے والے لوگ کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"مہاراج اپنے گیان سے معلوم کیجئے کہ میری پتنی کہاں ہے۔ اگر وہ پاتال میں بھی ہوئی تو میں اسے وہاں سے نکال لاؤں گا۔"

جوگی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مورکھ ہو۔ تم اپنی پتنی کو پاتال سے نکال کر لا سکتے ہو مگر تمہاری پتنی پاتال میں نہیں

ہے۔"

"پھر کہاں ہے مہاراج؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

جوگی ایک بار پھر گیان دھیان کی حالت میں چلا گیا۔ کافی دیر وہ اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ پھر آنکھیں کھولیں اور کہنے لگا۔

"مورکھ! تمہاری پتنی کو سپیرا آلوپ نگر میں لے گیا ہے۔"

جوگی اتنا کہہ کر چپ ہوگیا۔ میں اس کا منہ تکنے لگا۔

"مہاراج! یہ آلوپ نگر کہاں ہے کیا دیو گڑھ اور سنبھل پور کے قریب ہی ہے؟"

جوگی بولا۔

"مورکھ! جہاں آلوپ نگر ہے وہاں نہ دیو گڑھ ہے، نہ سنبھل پور ہے۔ نہ کاشی ہے، نہ ہردوار ہے۔ نہ متھرا ہے نہ برندا بن ہے۔ وہ تو آلوپ نگر ہے۔ سنسار والوں کی نظروں سے چھپا ہوا شہر ہے۔ اسی واسطے میں نے اسے آلوپ نگر کہا ہے۔ آلوپ کا مطلب ہے جو غائب ہو۔ جو کسی کو دکھائی نہ دے۔ یہ شہر کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ شہر موجود ہے۔ مگر وہاں آج تک سنسار کا کوئی آدمی نہیں جاسکا۔ تمہاری پتنی کو دُشت سپیرا وہیں لے گیا ہے۔"

میرا ذہن ایک نئی پریشانی میں الجھتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"مہاراج! آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں آلوپ نگر کو کون سا راستہ جاتا ہے۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

جوگی بولا۔ "مورکھ ہو۔ وہاں کوئی راستہ نہیں جاتا۔ اس کے چاروں طرف آدم خور درختوں کا جنگل ہے۔ مگرمچھوں سے بھرے ہوئے جوہڑ ہیں۔ ہاتھی چھیواں گھاس کی جھاڑیوں کے اندر دلدلیں ہیں۔ درخت آدم خور جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ ان جھاڑیوں اور درختوں سے کوئی چیونٹی بھی زندہ نہیں گزر سکتی۔"

مجھ پر انتہائی مایوسی کا عالم طاری ہو چکا تھا۔ کسی وقت خیال آتا کہ یہ جوگی جھوٹ بول رہا ہے۔ مجھے ڈرا رہا ہے۔ اس کا گیان دھیان جھوٹا ہے۔ جب یہ خیال آتا کہ جوگی میرا

ہمدرد ہے' خیر خواہ ہے اس نے پولیس سے میری جان بچائی ہے۔ وہ میرا دشمن نہیں ہے۔ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا۔ میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"مہاراج! اب جبکہ آپ نے میری جان بچائی ہے تو مجھے کوئی ایسا طریقہ بھی بتا دیجئے کہ جس کی مدد سے میں اپنی پتنی کے پاس پہنچ سکوں۔ اسے ظالموں کی قید سے آزاد کرا سکوں۔"

جوگی ہنس پڑا۔ بولا۔

"تم موہ مایا کے جال میں پھنسے ہوئے لوگ بڑے مورکھ ہو۔ پرنتو میں تمہارے واسطے جو کچھ کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔"

وہ اٹھ کر کونے میں گیا اور وہاں سے ایک تھیلا اٹھا کر لے آیا اور میرے سامنے اسی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے تھیلی کھول کر اس میں سے ایک چھوٹی تھیلی نکالی۔ اسے کھولا اور اس میں سے سیاہ رنگ کی ایک شیشی نکال کر اپنے سامنے رکھ لی۔ شیشی پر بھدا سا کاک لگا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"سن مورکھ! آلوپ نگر کے چاروں طرف جو جنگل ہے اسے لوگ یم دوت بن کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے موت کا جنگل--- اس بن میں جیسے ہی کوئی منش' کوئی بھولا بھٹکا آدمی داخل ہوتا ہے تو اس کی بو پا کر جنگل کے آدم خور درخت' آدم خور جھاڑیاں' زہریلے سانپ اور مگرمچھ چوکنے ہو جاتے ہیں۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی یا تو اسے کوئی زہریلا ناگ ڈس لیتا ہے یا کوئی آدم خور درخت اسے اپنی طرف کھینچ کر چٹ کر جاتا ہے اور یا کوئی نہ کوئی مگرمچھ اس کو منہ میں دبا کر تالاب کے گہرے پانیوں میں گھسیٹ کر لے جاتا ہے۔ تم جاؤ گے تو تمہارا بھی یہی حال ہو گا۔"

میں نے کوئی سوال نہ پوچھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ جوگی نے تھیلی میں سے جو شیشی نکالی ہے تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی پر اسرار بات ہو گی۔ جوگی نے شیشی کو اپنے ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اس شیشی میں گنگا جل ہے۔ اس گنگا جل پر اگنی منتر پھونکا گیا ہے۔ یہ صرف ہم جوگی

سنیاسی لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اس گنگا جل میں تیرے لیے مکتی ہے۔ تو گرہستی ہے۔ جوگی سنیاسی گرہستیوں سے دور رہتے ہیں۔ مگر تو اپنی پتنی سے پریم کرتا ہے۔ اپنی پتنی کے لیے پریشان ہے اس کے لیے جان کی بازی لگانے کو تیار ہے۔ اس واسطے میں تمہاری ضرور مدد کروں گا۔"

اس نے میری موجودگی میں مورتی کے سامنے چوکی پر رکھی چھوٹی سی خالی پیالی اٹھائی۔ شیشی کا کاک کھول کر اس میں سے گنگا جل یا جو کچھ بھی اس میں تھا' اس کے چند قطرے پیالی میں ڈالے۔ پھر لوٹیا میں سے تھوڑا سا پانی ڈال کر پیالی میری طرف بڑھائی۔

"لے مورکھ! اس کو پی جا۔"

میں کچھ جھجکا۔ خدا جانے اس میں کیا چیز ڈالی گئی ہو۔ مجھے ہچکچاتے دیکھ کر جوگی نے پیالی والا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

"دل نہیں مانتا تو مت پی۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں مہاراج! ایسی بات نہیں ہے۔ میں ضرور پیوں گا۔"

میں نے پیالی جوگی کے ہاتھ سے لی اور شیشی کے قطروں والا گنگا جل پی گیا۔ اس کا ذائقہ کسیلا تھا۔ میں نے پیالی چوکی پر رکھ دی اور جوگی کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"جانتے ہو تیرے شریر میں کیسی شکتی آ گئی ہے؟ تو نہیں جانتا مورکھ ہے۔ سن! اب تجھ پر سانپ کے کاٹے کا اثر نہیں ہو گا۔ چاہے ناگ دیوتا کا سانپ تجھے ڈس لے۔ تجھ پر اس کا زہر اثر نہیں کرے گا۔ اور سن! اس خاص جڑی بوٹی والے جل کے اثر سے تیرے بدن سے ایسی خوشبو نکلنا شروع ہو گئی ہے کہ جنگل کے کیڑے مکوڑے' جوہڑوں کے مگرمچھ تجھ سے دور بھاگ جائیں گے۔ آدم خور درختوں کی شاخیں اور خون چوسنے والی خونی جھاڑیاں تیری بو پا کر سمٹ جائیں گی۔ وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ اب تو بے خوف ہو کر آلوپ نگر کے خونی جنگل میں چل پھر سکے گا۔"

مجھے جوگی کی باتوں پر کچھ اعتبار آ رہا تھا۔ کچھ اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ اتنا میں نے ضرور سن رکھا تھا کہ جنگل کی بعض جڑی بوٹیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے اثر سے حیرت انگیز کارنامے ظاہر ہوتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

"مہاراج! اس جڑی بوٹی کا اثر کتنے دنوں تک رہے گا۔"

جوگی بولا۔

"جب تک تجھے موت نہیں آتی۔ اس کا اثر بدن میں موجود رہے گا۔"

سرد رات گزرتی جا رہی تھی۔ اب میرا ٹارگٹ آلوپ نگر کا خونی جنگل تھا جہاں وحشت سپیرا میری بیوی کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔ میں راتوں رات دلی شہر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ دن کے وقت خطرہ تھا کہ میں پولیس کے قابو میں نہ آ جاؤں۔ میں نے جوگی سے کہا۔

"مہاراج! اب جبکہ آپ نے میرے اندر خطرناک مگرمچھوں اور آدم خور درختوں جھاڑیوں سے بچنے کی طاقت پیدا کر دی ہے تو مجھے یہ بھی بتا دیں کہ آلوپ نگر کا جنگل کس طرف ہے تاکہ میں اپنی بیوی کو وہاں سے نکال سکوں۔"

جوگی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں سر کو دو تین بار ہلکا سا جھٹکا دیا۔ آنکھیں کھولیں اور کہنے لگا۔

"یہ درست ہے کہ تم پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہو گا۔ آدم خور جھاریاں تمہاری بو پا کر سمٹ جائیں گی۔ مگرمچھ تمہاری بو سے ڈر کر بھاگ جائیں گے لیکن کوئی نہ کوئی اژدہا تمہیں ضرور نگل سکے گا۔ اژدہوں اور بندروں پر تمہاری بو کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ تمہیں اژدہوں اور بندروں سے خبردار رہنا ہو گا۔ مجھے خود آلوپ نگر کے جنگل کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ میں تمہیں جوگن مایا دیوی کے پاس بھیج رہا ہوں۔ صرف وہی تمہیں آلوپ نگر کے خونی جنگ کا راستہ بتا سکتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"جوگن مایا دیوی مجھے کہاں ملے گی؟"

جوگی بولا۔

"تم دلی سے جھانسی جاؤ گے۔ جھانسی سے تمہیں راج گڑھ پہنچنا ہو گا۔ راج گڈھ سے پچھم کی طرف چوکھبا گاؤں تک بیل گاڑیاں جاتی ہیں۔ تم بیل گاڑی میں بیٹھ کر چوکھبا گاؤں جاؤ گے۔ چوکھبا گاؤں سے پچھم کی طرف ایک کوس کے فاصلے پر آلوپ نگر کے جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔ جہاں سے جنگل کے سیاہ کالے درختوں کی دیوار شروع ہوتی ہے۔ وہاں تمہیں ایک نڑھی ملے گی۔ وہاں جوگن مایا دیوی ایک کٹیا میں رہتی ہے۔ تم اس کو جا کر کہنا کہ تمہیں بن واسی جوگی نے بھیجا ہے۔ تم اس کو ساری رام کہانی سنا دینا۔ جوگن مایا دیوی تمہیں آلوپ نگر کے خونی جنگل کا راستہ بتا دے گی۔"

جوگی نے جو سفر بتایا تھا وہ کافی لمبا تھا اور ٹرین میں ہی سارا سفر طے کرنا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میری جیب میں دو سو کے قریب روپے موجود تھے۔ پھر بھی میں نے جیب سے نوٹ نکال کر گنے، پورے دو سو تیس روپے تھے۔ جوگی مسکراتے ہوئے بولا۔

"اگر تم جوگی کے بھیس میں جاؤ تو تمہیں ریل کا کرایہ نہیں دینا پڑے گا۔ بھارت میں جوگی سنیاسی ریل میں مفت سفر کرتے ہیں۔ سرکار کی طرف سے انہیں اس کی اجازت ملی ہوئی ہے۔"

مگر میں جوگی کا بھیس نہیں بدلنا چاہتا۔ میں نے کہا۔

"نہیں مہاراج! میں ان کپڑوں میں ہی سفر کروں گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی اب تم یہاں سے سٹیشن کی طرف چل پڑو۔ تمہیں رات کے اندھیرے میں احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ پولیس تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اگر پولیس نے تمہیں پکڑ لیا تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ جاؤ۔"

میں نے جوگی کا شکریہ ادا کیا اور کٹیا سے نکل کر سامنے سے جو چھوٹی سڑک گزرتی تھی اس پر آ گیا۔ سرد رات خاموش اور ویران ویران تھی۔ دور دور تک ہلکی ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اندازے سے دلی ریلوے سٹیشن کا رخ کیا اور چل پڑا۔

چلنے سے سردی کا احساس کم ہوگیا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں رک کر پیچھے دیکھ لیتا تھا کہ کوئی انٹیلی جینس کا آدمی میرا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ ابھی تک مجھے ایسا کوئی انسان دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں ایک بڑی سڑک پر آگیا۔ سڑک کی دونوں جانب بجلی کے کھمبوں پر مرکری لائٹس روشن تھیں۔ سڑک خالی تھی۔ کسی کسی وقت کوئی بھاری ٹرک یا ٹرالر گزر جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ رات آدھی گزر چکی ہے۔ میں کافی دور تک چلتا گیا۔

ایک جگہ چوراہا آگیا۔ یہاں اردگرد کافی فاصلے پر عمارتوں میں روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ میں نے اپنا رخ نہیں بدلا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جس طرف میں جا رہا ہوں دلی کا سٹیشن اسی طرف ہے۔ میں چوراہے سے آگے نکل گیا۔ دو تین گاڑیاں سڑک پر آگے نکل گئیں۔ میں سڑک کے کنارے چل رہا تھا۔ ایک گاڑی کی روشنیاں دکھائی دیں تو میں نے یونہی اسے ہاتھ دے دیا۔ گاڑی میرے قریب سے گزر گئی آگے جا کر رک گئی۔ میں دوڑ کر آگے گیا۔ یہ ایک جیپ تھی۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ کہیں یہ پولیس یا فوج کی جیپ نہ ہو۔ لیکن وہ سویلین جیپ تھی۔ ایک سکھ اسے چلا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

"کہاں جاؤ گے اوئے؟"

میں نے کہا۔

"سردار جی ریلوے سٹیشن جانا ہے۔"

اس نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سکھ ڈرائیور نے پوچھا۔

"کون ہو بھئی تم؟ آدھی رات کو اس طرف کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں نے یونہی ایک فرضی کہانی گھڑ کر سنا دی۔ ریلوے سٹیشن وہاں سے کافی دور تھا۔ سکھ ڈرائیور بڑا خوش مزاج تھا۔ اس نے تھوڑی تھوڑی پی بھی رکھی تھی۔ کہنے لگا۔

"میں بارہ کھمبا جا رہا ہوں۔ مگر تمہیں سٹیشن پر چھوڑ کر جاؤں گا۔"

وہ مجھے دلی کے ریلوے سٹیشن پر چھوڑ گیا۔

اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ سٹیشن پر کافی رونق تھی۔ میں نے ایک طرف کھڑے ہو کر ماحول کا جائزہ لیا۔ مجھے کوئی پولیس والا دکھائی نہ دیا۔ ایک قلی سے پوچھا۔ جھانسی جانے والی گاڑی کب چھوٹے گی؟ معلوم ہوا الہ آباد سے آنے والی گاڑی جھانسی تک جاتی ہے وہ ساڑھے تین بجے پچھلے پہر جائے گی۔ میں نے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خرید لیا اور پلیٹ فارم پر آگیا۔ پلیٹ فارم پر مجھے پولیس کا سپاہی نظر آیا تو میں سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں گھس گیا۔ ویٹنگ روم میں کچھ مسافر سو رہے تھے۔ ایک بوڑھا سکھ آرام کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ایک بلی خدا جانے کہاں سے آگئی۔ وہ شاید پہلے ہی سے ویٹنگ روم میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ کرسیوں کے پیچھے سے ہوتی ہوئی میرے قریب آئی تو اچانک اس کے بال کھڑے ہوگئے۔ زور سے چلائی اور مجھ سے ڈر کر بھاگ گئی۔ جوگی نے مجھے جو جڑی بوٹی گنگا جل میں گھول کر پلائی تھی اس کی تاثیر کا مجھے ثبوت مل گیا۔ یہ بلی میرے جسم سے خارج ہونے والی خاص اور بے معلوم بو سے ڈر کر بھاگی تھی۔ میں اٹھ کر باتھ روم میں پانی پینے آگیا۔ فرش پر تین چار کاکروچ رینگ رہے تھے۔ جیسے ہی میں داخل ہوا انہوں نے دوڑ لگا دی اور کونوں کھدروں میں گھس گئے۔ ثابت ہوگیا تھا کہ میرے جسم سے نکلنے والی بو پا کر حشرات ارض اور بلی وغیرہ بھاگ جاتی ہے۔ بندر اور اژدہوں پر میری بو کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ مگر وہاں کوئی بندر اور اژدہا نہیں تھا۔

میں اس وقت تک ویٹنگ روم میں ہی رہا جب تک کہ جھانسی جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر نہیں آگئی۔ گاڑی میں کافی رش تھا۔ میں پلیٹ فارم پر موجود پولیس والوں کی آنکھ بچا کر ایک ڈبے میں گھس گیا۔ ٹرین چل پڑی۔ جب تک دلی شہر کی روشنیاں نظر آتی رہیں میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر نہ دیکھا۔ ٹرین نے رفتار پکڑ لی تھی۔ میں اونگھنے لگا۔ پھر وہیں سر لگا کر سو گیا۔ تقریباً ساری رات کا جاگا ہوا تھا۔ آنکھ کھلی تو دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ٹرین کسی بڑے شہر میں داخل ہو رہی تھی۔ میں اس شہر کا نام بھول گیا ہوں۔ تیسرے پہر جھانسی کا سٹیشن آیا تو میں اتر گیا۔ وہاں سے راج گڑھ جانے والی برانچ لائن کی گاڑی مجھے ایک گھنٹے کے بعد ملی یہ ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ راج گڑھ وسطی بھارت کے جنوب میں ایک

معمولی سا سٹیشن تھا۔ یہاں سے مجھے بیل گاڑی میں سوار ہو کر چوکھمبا گاؤں جانا تھا۔ جہاں سے آگے ایک کوس کے فاصلے پر اس مڑھی تک جانا تھا جہاں سے آلوپ نگر یعنی گم شدہ شہر کا خونی جنگل شروع ہوتا تھا۔ اس جگہ مجھے جوگن مایا دیوی سے ملنا تھا۔

ابھی دن کی روشنی کافی تھی۔ راج گڑھ سو پچاس کھپریل کی ڈھلواں چھتوں والے پرانے ٹائپ کے کوارٹروں والا گاؤں تھا۔ گاؤں سے باہر ایک جگہ تین چار بیل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک بیل گاڑی پر کچھ دیہاتی عورتیں اور مرد سوار تھے۔ یہ چوکھمبا گاؤں جا رہی تھی۔ میں بھی اس میں سوار ہوگیا۔ بیل گاڑی چل پڑی۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں اور کھیتوں کے درمیان ایک غیر ہموار کچا راستہ تھا جس پر گاڑی ہچکولے کھاتے جا رہی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد چوکھمبا گاؤں آگیا۔ یہاں سوائے چند ایک جھونپڑیوں اور ایک پرانے تالاب کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں سے مجھے جنوب کی طرف ایک کوس کے فاصلے پر واقع آلوپ نگر کے جنگل کی سرحد تک پیدل جانا تھا۔ میں اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ اس وقت سورج مغرب کی جانب اونچے پہاڑوں کے پیچھے چھپ گیا تھا اور دن کی روشنی دھندلی ہو گئی تھی۔ میں نے ایک دیہاتی سے آلوپ نگر کے جنگل کا راستہ پوچھا تو' اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ مجھے آلوپ نگر کے خونی جنگل میں نہیں جانا بلکہ جنگل کی سرحد پر ایک جگہ بانس کے ذخیرے میں میرے چچا ٹھیکیداری کا کام کرتا ہے۔ میں اس سے ملنے جا رہا ہوں۔

ایک کوس کا راستہ کھیتوں اور اونچی گھاس کے میدان میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ میں اونچی اونچی ہاتھی چھپواں گھاس کے میدان میں سے باہر نکلا تو مجھے دور ایک سیاہ دیوار نظر آئی۔ یہ سیاہ دیوار در حقیقت آلوپ نگر یعنی گمشدہ شہر کی خونی جنگل کی سرحد کے درخت تھے۔ یہیں کسی جگہ ایک مڑھی تھی۔ مڑھی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ہندو لوگ اپنے مردے جلانے کے بعد ان کی ہڈیاں دبا دیتے ہیں۔ شام کے سائے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ یہاں کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔ جنگلی جھاڑیوں اور خشک گھاس والی زمین تھی۔ کوئی پگڈنڈی بھی نہیں تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس طرف کوئی دیہاتی آتا جاتا نہیں ہے۔ میں نے گمشدہ شہر کے خونی جنگل کے سیاہ کالے درختوں کی دیوار کو نظر میں رکھا ہوا تھا اور اسی طرف چل رہا تھا۔ ایک جگہ مجھے درختوں کے نیچے دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ میں اس طرف بڑھا۔ درختوں کے نیچے ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا۔ چبوترے پر ایک چھوٹی سی بانس کی کٹیا تھی۔ کٹیا کے آگے درخت کا ایک مُڈھ سلگ رہا تھا۔ یہ جوگن مایا دیوی کی کٹیا ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا' وہاں کوئی نہیں تھا۔ کٹیا کا بانس کا دروازہ بند تھا۔ میں نے آہستہ سے آواز دی۔

”دیوی جی! مجھے بن واسی جوگی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“

دو تین بار آواز دینے پر بھی کٹیا سے کوئی عورت باہر نہ نکلی۔ میں چبوترے کی ایک جانب ہو کر بیٹھ گیا۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ اندھیرا پورے ماحول کو اپنی آغوش میں لے رہا تھا۔ فضا پر بڑی پراسرار سی خاموشی چھائی تھی۔ کسی کسی وقت ایک درخت پر کوئی پرندہ دو ایک بار بول کر چپ ہو جاتا تھا۔ میں نے جائزہ لیا۔ کٹیا کے دروازے کے پاس مٹی کا ایک چھوٹے منہ والا گھڑا رکھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر مٹی کا پیالہ پڑا تھا۔ قریب ہی ایک دیگچی پڑی تھی۔ ایک طرف ایک ترشول زمین میں گڑا ہوا تھا۔ یہ کٹیا جوگن مایا دیوی کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جنگل میں گئی ہوگی۔ میں سوچنے لگا کہ ایک عورت اکیلی ویرانے میں کیسے رہ رہی ہے۔

مجھے خشک پتوں پر کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو شام کے دھندلکے میں مجھے ایک بہت بڑا بن مانس ٹائپ کا بندر نظر آیا جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے پاس ریوالور نہیں تھا۔ صرف کمانڈو چاقو ہی تھا۔ اس کے باوجود میں اتنے بڑے بندر کو دیکھ کر ایک بار تو ڈر گیا۔ مجھے جوگی کی بات یاد آگئی کہ تمہارے جسم کی بو سے تمام کیڑے-مکوڑے اور جانور چوپائے ڈر کر دور بھاگ جائیں گے مگر بندر اور اژدہا پر تیرے جسم سے نکلنے والی جڑی بوٹی کی بو کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ سرخ خونیں آنکھوں والا بن مانس برابر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ میں

نے چاقو نکال لیا تھا اور چبوترے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ بن مانس چبوترے کے پاس آ کر رک گیا اور دانت نکال نکال کر حلق سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکالنے لگا۔ قریب تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کر دیتا کہ اچانک ایک جانب سے کسی عورت کی آواز آئی۔

"پوتّن پتر! بھاگ جا' بھاگ جا۔"

درختوں میں سے ایک عورت نکل کر سامنے آ گئی۔ اس نے جسم پر صرف گیروے رنگ کی ایک دھوتی لپیٹ رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کسی درخت کی ٹہنیاں تھیں۔ عورت کی آواز پر بن مانس واپس چلا گیا۔ میں نے چاقو بند کر کے جیب میں رکھا اور بڑے ادب سے اس عورت سے کہا۔

"دیوی جی! کیا آپ ہی کا شبھ نام مایا دیوی ہے؟"

اس دوران وہ عورت چبوترے پر چڑھ آئی تھی۔ اس نے درخت کی ٹہنیاں سلگتے ہوئے ٹنڈ کے اوپر ڈال دیں۔ ٹہنیوں نے فوراً آگ پکڑ لی۔ خدا جانے یہ کس درخت کی ٹہنیاں تھیں۔ آگ کے شعلے کی روشنی میں اس عورت نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"کیا تمہیں گورو دیو جی نے بھیجا ہے؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں دیوی! مجھے بن واسی جوگی نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ۔"

میں آگ کے چھوٹے سے الاؤ کی ایک جانب ہو کر بیٹھ گیا۔ جوگن کٹیا کے اندر چلی گئی۔ باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی جو روشن تھی۔ وہ اندر سے لالٹین جلا کر لائی تھی۔ لالٹین کو اس نے کٹیا کے باہر دروازے کے پاس لٹکا دیا۔ لالٹین اور الاؤ کے شعلے کی وجہ سے وہاں اتنی روشنی ہو گئی کہ میں جوگن کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ وہ میرے سامنے ایک چوکی پر بیٹھ گئی۔

وہ جوان اور صحت مند عورت تھی۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ سیاہ بالوں کا اس نے پیچھے جوڑا بنایا ہوا تھا۔ گلے میں جوگیوں والی مالا تھی۔ جسم پر صرف گیروے رنگ کی ایک دھوتی ہی تھی جس کے ایک پلو سے اس نے جسم کا اوپر والا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے دکھائی دے رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"میں نے رات کو ہی گیان دھیان سے معلوم کر لیا تھا کہ تم میرے گورو دیو کے حکم سے یہاں آ رہے ہو۔ تمہارا نام کیا ہے؟ تمہارا دھرم کیا ہے؟"

میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ میں مسلمان ہوں اور میرا نام کرم داد ہے اور پھر مختصر کر کے اپنی پوری کہانی بھی اسے سنا دی۔ وہ بڑے غور سے سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور ایک عجیب قسم کی کشش تھی جو جنگل میں اکیلا رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں سب سمجھ گئی ہوں۔ تم پہلے بھوجن کر لو۔ پھر تم سے بات کروں گی۔"

اس نے کٹیا میں سے ایک تھالی میں شکر قندی اور کچھ کیلے لا کر میرے سامنے رکھ دیے۔ گھڑے میں سے پانی کا پیالہ بھر کر لے آئی۔

"ہم سادھو سنیاسی لوگ ہیں پھل پھول پر گزر بسر کرتے ہیں۔"

مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے شکر قندی اور کیلے کھائے' پانی پیا اور جوگن کا شکریہ ادا کیا۔ الاؤ کی آگ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ اس نے درخت کی کچھ شاخیں الاؤ میں ڈال دیں اور بولی۔

"میں چلم بھر کر لے آؤں۔"

وہ کٹیا میں چلی گئی اور ایک چھوٹی سی مٹی کی چلم لے آئی جس کے نیچے کپڑے کی دھجی سی لپٹی ہوئی تھی۔ وہ الاؤ کے پاس میرے سامنے بیٹھ گئی۔ چلم بھری ہوئی تھی۔ اس نے الاؤ میں سے ایک جلتی ہوئی ٹہنی سے ایک نگارہ نکال کر چلم کے اوپر رکھا۔ کپڑے کی دھجی والا چلم کا حصہ دونوں ہاتھوں میں لے کر منہ کے ساتھ لگایا اور زور زور سے کش لگانے لگی۔ میرا خیال تھا کہ چلم میں تمباکو ہو گا مگر جب دھواں نکلا تو اس کی بو سے معلوم ہوا کہ چلم میں چرس بھری ہوئی تھی۔ چھ سات لمبے لمبے کش لگانے کے بعد جب چلم میں سے ایک لاٹ نکلی تو جوگن نے منہ سے دھواں نکالتے ہوئے چلم اپنے پاس ہی اینٹ کے

ساتھ لگا کر رکھ دی اور بولی۔

"تم چلم پیو گے؟"

میں نے کہا۔

"نہیں دیوی جی! میں چلم نہیں پیتا۔"

وہ بولی۔

"میرا خاوند تو خوب چرس پیتا ہے۔"

میں نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"دیوی جی! آپ کا خاوند کہاں ہے؟"

وہ بولی۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں آیا تھا۔ تم نے بھی اسے دیکھا تھا۔ وہ تم پر حملہ کرنے والا تھا۔"

میں حیرت میں ڈوب سا گیا۔ میں کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ جوگن بولی۔

"ہاں ہاں--- حیران کیوں ہوتے ہو۔ وہ بن مانس جو آیا تھا وہی میرا خاوند ہے۔ مگر اب میں اس سے تنگ آ گئی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ کسی آدمی کو اپنا خاوند بناؤں۔ یہاں میری پسند کا کوئی آدمی نہیں ہے۔"

پھر اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چرس کی سرخی جھلک رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم بڑے خوبصورت اور جوان ہو۔ ادھر کے آدمی بالکل بونے بونے سے ہوتے ہیں۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔ کیا تم میرے خاوند بنو گے۔"

میں تو ڈر گیا کہ یہ کس قسم کی عورت ہے۔ میں اسے ناراض بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی مدد سے مجھے اپنی گمشدہ بیوی کا سراغ لگانا تھا۔ میں اس کا خاوند بھی نہیں بن سکتا تھا۔ میں نے ہاتھ باندھ کر عاجزی سے کہا۔

"دیوی جی! آپ تو میرے لیے آکاش دیوی ہیں اور پھر میں گھر گرہستی ہوں۔ میری

پہلے سے بیوی ہے۔"

وہ بولی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا بھی ایک آدمی خاوند تھا۔ وہ شہر میں رہتا ہے۔ میں نے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے۔ اس میں مردوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ تم پورے مرد ہو۔ تم مجھے اچھے لگے ہو اور پھر تم میرے جیون بھر کے خاوند تھوڑے ہو گے۔ جب تک میرے پاس ہو میرے خاوند بن کر رہو۔ جب اپنی پتنی کو لے آؤ گے تو بے شک چلے جانا۔ ہم جوگی سنیاسی لوگ ہیں۔ کبھی کسی کے ساتھ من نہیں لگاتے۔"

میں عجیب الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس قسم کی حرکت میں نے زندگی میں کبھی نہیں کی تھی۔ میری ساری جوانی پاک بازی میں گزری تھی۔ میری زندگی کی پہلی اور آخری عورت میری بیوی جمیلہ ہی تھی۔ اس جوگن کے آگے صاف صاف انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ بات کا رخ کسی دوسری طرف پلٹ دیا جائے۔ میں نے کہا۔

"دیوی جی! کیا یہ سچ ہے کہ آلوپ نگر میں آج تک کوئی انسان نہیں گیا؟"

میری چال کامیاب رہی۔ میں موضوع بدلنے میں کامیاب ہو گیا۔ جوگن نے بڑے جلالی انداز میں کہا۔

"آلوپ نگر میں کس کی ہمت ہے کہ جائے۔ ایک بار انگریز لوگوں کی ایک شکار پارٹی کھوج لگانے وہاں گئی تھی۔ ان میں سے کوئی واپس نہیں آ سکا۔ کچھ کو مگرمچھ ہڑپ کر گئے، کچھ سانپوں کے ڈسنے سے مار گئے۔ جو ایک آدھ سانپوں، مگرمچھوں سے بچا ہو گا اسے آدم خور جنگلی بیلوں نے دبوچ کر ہڑپ کر لیا ہو گا۔ وہ تو خونی جنگل میں ہی مر کھپ گئے۔ آلوپ نگر تک کہاں پہنچے تھے۔ آلوپ نگر جنگل کے دیوتاؤں کا نگر ہے۔ وہاں کوئی منش نہیں جا سکتا۔"

میں نے پوچھا۔

"دیوی جی! آپ کو تو میری ساری کہانی کا پتہ چل چکا ہے۔ اگر وہاں کوئی باہر کا آدمی

نہیں جا سکتا تو میری بیوی کو لے کر دہشٹ سپیرا وہاں کیسے چلا گیا؟"

جوگن مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"یہ ایک راز ہے۔ تمہیں صرف اتنا ہی بتائے دیتی ہوں کہ ضرور آلوپ نگر کے مہادیو کو تمہاری بیوی پسند آگئی ہوگی۔ دہشٹ سپیرا مہادیو کا خاص آدمی ہے۔ جب مہادیو جی کو باہر کی کوئی عورت پسند آجاتی ہے یا اس کے کوئی گن پسند آجاتے ہیں تو وہ دہشٹ سپیرے کو حکم دیتے ہیں کہ فلاں عورت کو اٹھا کر لے آؤ۔ اور دہشٹ سپیرا اس عورت کو چاہے وہ کہیں بھی ہو اٹھا کر لے آتا ہے۔ کبھی زبردستی بے ہوش کر کے اور کبھی ناگ دیوتا کا منتر پھونک کر۔ تمہاری بیوی پر سپیرے نے ناگ دیوتا کا خاص منتر پھونکا تھا۔ اسی کے اثر سے وہ اپنے آپ دہشٹ سپیرے کے ساتھ چل پڑی تھی۔"

میں نے عاجزی سے کہا۔

"دیوی جی! کسی طرح میری بیوی کو وہاں سے نکال دیجئے میں آپ کا ساری زندگی داسی بن کر رہوں گا۔ آپ کا ہر حکم مانوں گا۔"

جوگن نے نتھنے پھلا کر گہرا سانس لیا۔ اس وقت وہ مجھے واقعی بن مانس کی بیوی معلوم ہوئی۔ کہنے لگی۔

"مجھے وچن دو کہ تم میرا ہر حکم مانو گے پھر میں تمہاری پتنی تمہارے حوالے کر دوں گی۔"

میں نے کہا۔

"میں وچن دیتا ہوں۔"

وہ بولی۔

"یاد رکھو اگر تم اپنے وچن سے پھر گئے تو تم اور تمہاری بیوی جہاں بھی ہو گے میں وہاں پہنچ کر تم دونوں کو اپنے ترشول سے ہلاک کر دوں گی۔"

میں نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"دیوی جی! میں وچن دیتا ہوں اور میں اپنے وچن پر قائم رہوں گا۔"

جوگن مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ میں عجیب قسم کی پر اسرار دعوت تھی۔ یہ عورت جوان، خوش شکل اور صحت مند تھی مگر میرے لیے حرام تھی۔ میں سخت آزمائش میں پڑ چکا تھا۔ میں نے دل میں خدا کے حضور دعا مانگی کہ اے خدا! مجھے اس آزمائش میں پورا اترنے کی توفیق عطا فرما۔ الاؤ میں اس نے اور جھاڑیاں اور درختوں کی سوکھی شاخیں ڈال دیں۔ الاؤ میں ایک بار پھر چھوٹے چھوٹے شعلے بلند ہونے لگے۔ جوگن نے چرس والی چلم اٹھائی۔ اس پر آگ کا انگارہ رکھا اور لمبے لمبے کش لگانے لگی۔ جب چلم میں سے سلفے کی لاٹ بار بار بلند ہونے لگی تو اس نے چلم منہ سے ہٹالی اور ہونٹوں میں سے دھواں خارج کرتے ہوئے چلم واپس اینٹ پر رکھ دی اور اپنے جسم پر دھوتی کے ناکافی پلو کو ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"سن مورکھ! یہ کام بڑا خطرناک ہے۔ مہادیو جی کی خاص پسند کی عورت کو ان کے بھون سے فرار کرانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مگر میں تمہاری خاطر یہ کام ضرور کروں گی اس لیے کہ مجھے تم پسند آگئے ہو۔ جب مجھے کوئی مرد پسند آجاتا ہے تو پھر میں ہر کام کر جاتی ہوں۔ پھر میں مہادیو جی کی بھی پروا نہیں کرتی۔ میں کام دیو کی چیلی ہوں۔ کام شاستر میں لکھا ہے کہ اے استری! اے عورت! اگر تجھے کوئی جوان منش پسند آجائے تو اس سے وشو بھوگ کر۔ اس سے پورا لابھ اٹھا اور سوائے کام دیوتا کے اور کسی دیوتا کی پروا مت کر۔ کام دیوتا تمہاری خود حفاظت کرے گا۔ تم مجھے پسند آگئے ہو میں تم سے وشو بھوگ کروں گی اور کام دیوتا خود مجھے مہادیو جی کے انتقام سے بچالیں گے۔"

وشو بھوگ کا مطلب اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں اس کو سمجھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے تو صرف ایک ہی فکر لگا ہوا تھا کہ چاہے میری جان چلی جائے مگر کسی طرح اپنی بیوی کو ان وحشی قسم کے لوگوں کے چنگل سے نکال کر اسے پاکستان پہنچا دوں۔ جب اس جوگن نے مجھ سے بچن لے لیا کہ میں اس کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا تو وہ اٹھ کر کٹیا میں گئی اور میرے لیے تھوڑی سی شکر قندی اور کیلے لے آئی۔ کہنے لگی۔

"تھوڑا اور کھالو تمہیں بھوک لگی ہوگی۔"

مجھے بھوک بالکل نہیں تھی لیکن جوگن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میں نے آدھی شکر قندی اٹھا کر کھالی۔ جوگن نے میرے سامنے کافی چرس پی تھی مگر اس پر جیسے اتنی چرس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بالکل صحیح حالت میں تھی۔ گفتگو بھی ٹھیک کر رہی تھی۔ صرف کسی کسی وقت میری طرف گھور کر دیکھتی اور نتھنے پھلا کر بن مانس کی طرح گہرا سانس لے لیتی تھی۔ اس وقت مجھے اس سے ویسا ہی خوف محسوس ہوتا تھا جیسا خوف مجھے بن مانس کو دیکھ کر ہوا تھا جس کو جوگن مایا دیوی نے اپنا خاوند کہا تھا۔ میں اب زیادہ سے زیادہ تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا تاکہ مجھے علم ہو سکے کہ یہ عورت میری بیوی کو آلوپ نگر کے خونی جنگل اور مہادیو کے جنگل سے کیسے نکال سکے گی۔ میں نے پوچھا۔

"دیوی جی! کیا تم مجھے ساتھ لے کر آلوپ نگر کی طرف جاؤ گی؟ میں چاہتا ہوں کہ اپنی بیوی کی تلاش میں میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں۔"

وہ بولی۔

"میرے گورو دیو نے تمہیں گنگا جل میں جڑی بوٹی گھول کر پلائی ہے اس کی وجہ سے تمہارے جسم سے ایک خاص قسم کی بو خارج ہو رہی ہے۔ اس بو کو کوئی انسان محسوس نہیں کر سکتا۔ صرف میں اسے سونگھ رہی ہوں۔ اس بو کی وجہ سے تمہیں خونی جنگل کے آدم خور درخت، جھاڑیاں، سانپ سپولیئے اور بچھو، مگرمچھ کچھ نہیں کہیں گے بلکہ تمہاری بو پا کر بھاگ جائیں گے۔ میں نے بھی یہی جڑی بوٹی پی رکھی ہے۔ میں ہر سال اسے پیتی ہوں۔ ہم دونوں اکٹھے خونی جنگل میں جائیں گے۔ مگر آلوپ نگر کی سرحد پر پہنچ کر میں رک جاؤں گی، میں آگے نہیں جاؤں گی، آگے صرف تم جاؤ گے۔"

میں نے پوچھا۔ "مجھے وہاں جا کر کیا کرنا ہوگا؟ مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ میری بیوی کس جگہ پر ہے؟"

وہ بولی۔

"یہ ساری باتیں میں تمہیں سمجھا دوں گی۔ پہلے میں دھوتی اچھی طرح باندھ لوں۔ ڈھیلی ہو گئی ہے۔ خبردار دوسری طرف منہ مت کرنا۔ یہ میرا حکم ہے۔"

میں نے کہا۔

"جو حکم دیوی جی۔"

اس نے کھڑے ہو کر دھوتی اتاری اور اسے دونوں ہاتھوں سے جھٹکنے لگی۔ مجھے شرم آ گئی کیونکہ وہ میرے سامنے لالٹین اور الاؤ کی روشنی میں بالکل مادر زاد ننگی کھڑی تھی۔ میں اپنا چہرہ دوسری طرف نہیں کر سکتا تھا۔ میں مجبور تھا۔ اس عیاش قسم کی جوگن کے حکم کا پابند تھا۔ میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف کیے رکھا۔ لیکن شرم و حیا کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ جوگن نے کڑک دار آواز میں کہا۔

"مورکھ! آنکھیں کھلی رکھو۔ یہ میرا حکم ہے۔"

اور میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔

یقین کریں میری حالت اس آدمی کی طرح تھی جس کو تیرنا نہ آتا ہو اور جسے زبردستی دریا میں دھکا دے دیا ہو۔ وہ عیاش قسم کی جوگن مایا دیوی میرے سامنے عریاں تھی۔ اس کا بدن ان مورتیوں کی طرح کا تھا جیسی مورتیاں میں نے جنوبی ہند کے ایک مندر میں دیکھی تھیں اور جنہوں نے نہایت فحش اور ہیجان خیز پوز بنا رکھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا بدن ایسا تھا کہ جس کو دیکھ کر آدمی تو کیا جانور بھی ایک بار بدک جاتے ہوں گے۔ الاؤ اور لالٹین کی روشنی میں اس کے جسم کے ابھار اور نشیب و فراز نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور اپنے بدن کو پیار بھی کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"مورکھ! تو میرا مراد ہے۔ میرا پتی ہے۔ میں نے تجھے تھوڑے وقت کے لیے اپنا خاوند بنا لیا ہے۔ پھر مجھ سے کیوں شرماتا ہے۔ اٹھ اور اٹھ کر میری دھوتی باندھ۔"

میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ میں نے آج تک سوائے اپنی بیوی کے اور کسی عورت کا بدن نہیں دیکھا تھا۔ دل میں خدا سے معافیاں مانگ رہا تھا۔ توبہ استغفار کر رہا تھا۔ مجبور تھا۔ بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں اٹھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ جوگن نے کڑک کر کہا۔

"اپنے بچن کو بھول گیا؟ میرا حکم نہیں مانے گا تو یاد رکھ اپنی بیوی سے کبھی نہیں مل سکے گا۔"

میں دل میں دلی کے جوگی کو کوس رہا تھا کہ اس نے مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اصل مصیبت ابھی آنے والی تھی یہ تو نمونہ تھا۔ اصل ڈرامہ بعد میں شروع ہونے والا تھا۔ میں جلدی سے اٹھا اور دھوتی پکڑ کر جوگن کو باندھنی شروع کر دی۔ کمر کے گرد ایک بل لپیٹا تو جوگن نے مجھے پکڑ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ بولی۔

"مورکھ! تیرا سریر کیوں کانپ رہا ہے؟ کیا اپنی بیوی کے پاس جا کر بھی تو کانپتا ہے؟"

میں نے گھبراہٹ میں جلدی جلدی اس کے جسم پر دھوتی لپیٹی اور واپس الاؤ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس وقت میرے اندر بھی ایک الاؤ روشن تھا۔ میرے اندر بھی ایک آگ سی لگ گئی تھی۔ شاید یہ نیچر کا تقاضا تھا۔ میں بار بار خدا سے معافیاں مانگ رہا تھا۔ جوگن دھوتی سے اپنے جسم کو ڈھانپ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"تم آج رات میری کٹیا میں آرام کرو گے۔ ہم کل کسی وقت خونی جنگل کی طرف جائیں گے۔"

میں نے اپنے جذباتی ہیجان پر کافی حد تک قابو پا لیا تھا۔ میں نے کہا۔

"دیوی جی! میرے پاس ایک لمبا چاقو ہے۔ شاید راستے میں اس کی ضرورت پڑ جائے۔"

وہ بولی۔

"وہاں چاقو، چھریاں، اور بندوقیں کام نہیں آئیں گی۔ آلوپ نگر دیوتاؤں کی نگری ہے۔ وہاں کی دنیا کچھ اور ہی ہے۔ میرے ساتھ جاؤ گے تو سب معلوم ہو جائے گا۔ اکیلے جاتے تو راستے میں ہی ختم ہو جاتے۔"

میں نے کہا۔

"ہم آج رات کو ہی نہ اس مہم پر نکل چلیں؟"

دراصل میں رات اس وحشی جوگن کی کٹیا میں گزارتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ وہ جلالی انداز میں بولی۔

"نہیں مورکھ! ہم کل ہی جائیں گے۔ آج رات میں کام دیوتا کی پوجا کروں گی۔ کام دیوتا کو رجھاؤں گی تاکہ آلوپ نگر کے دیوتا مہادیو کے خلاف وہ میری مدد کرنے پر راضی ہو جائے اور مجھے مہادیو کے انتقام سے بچا لے۔ میں مہادیوتا سے اس کی چہیتی اپسرا اور شاہی نرتکی یعنی تمہاری بیوی اس سے چھیننے جا رہی ہوں۔ اگر کام دیوتا کی مدد میرے ساتھ شامل نہیں ہوگی تو مہادیو ہم دونوں کو جلا کر بھسم کر ڈالے گا۔"

میں چپ ہو کر بیٹھا رہا۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ جوگن نے چرس کی ایک اور چلم پی لی۔ اس دوران وہی بن مانس خرخر کرتا ایک بار پھر جنگل کی تاریکی سے نکل کر چبوترے کے پاس آگیا جس کو جوگن نے اپنا خاوند ظاہر کیا تھا۔ وہ جوگن کی طرف دیکھ کر گردن ہلا رہا تھا اور اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے پیٹ رہا تھا۔ جوگن نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مرا کیوں جاتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جا، بیٹھ جا۔"

بن مانس جیسے اس کی زبان سمجھ رہا تھا۔ وہ فوراً وہیں بیٹھ گیا۔ جوگن نے چلم نیچے رکھ دی۔ اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کا خمار تھا۔ کہنے لگی۔

"بندر اور بن مانس ہمارے دھرم میں دیوتا کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہنومان جی بندروں کے سردار تھے۔ انہوں نے ہمارے بھگوان رام چندر کی مدد کی تھی اور اپنی فوج کے ساتھ رام چندر جی کے ساتھ مل کر لنکا پر چڑھائی کی تھی اور لنکا کو آگ لگا دی تھی۔ تب سے بندروں کے اندر ایک نئی شکتی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے پاس ایسی ایسی خفیہ طاقتیں ہیں کہ اگر عورت کسی بن مانس یا بڑے بندر سے شادی کر لے تو وہ کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ اس کے بال کبھی سفید نہیں ہوتے، نہ ہی اس کے جسم پر جھریاں پڑتی ہیں۔ تم نے میرا جسم دیکھا ہے۔ تمہیں ایک بھی جھری نظر نہیں آئی ہوگی۔ پانچ برس سے یہ بن مانس میرا خاوند ہے۔ تب سے لے کر آج تک میرے اندر جوانی کی نئی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ میری عمر

خواہ ستر سال کی بھی ہو جائے مگر میرا جسم اسی طرح جوان رہے گا۔ یہ ایک راز ہے جو کام دیوتا جی نے صرف مجھ پر ظاہر کیا تھا۔ کام دیوتا ہمارے دھرم میں جنسی محبت اور دو جسموں کے ملاپ کا دیوتا ہے۔ ہمارے ہندو دھرم کی کتاب کام سوتر میں دو جسموں کے ملاپ کے ایک ہزار طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ سارے طریقے دیوتا کام دیو نے خود لکھوائے تھے۔ جب وہ آدمی کا روپ دھار کر دنیا میں آئے تھے۔"

جوگن چرس کے نشے میں بولے جا رہی تھی اور اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک جانور قسم کی عورت ہے اور جانوروں کی طرح جنسی رجحان کی مالک ہے ورنہ ایک عام عورت ایک شریف اور نارمل عورت کبھی اس قسم کی واہیات باتیں نہیں کرتی۔ بن مانس اسی طرح چبوترے کے پاس نیچے بیٹھا عجیب لالچی نظروں سے جوگن کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ زور سے اپنا سینہ پیٹ لیتا تھا۔ جوگن کہہ رہی تھی۔

"میں اس بن مانس سے روز رات کو مالش کرواتی ہوں۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ یا خدایا! یہ تو نے مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ مجھے اس عورت سے بچالینا۔ کہنے لگی۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ بن مانس میری مالش کیسے کرتا ہوگا؟"

میں چپ رہا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"پوچھو کہ بن مانس میری مالش کیسے کرتا ہے؟ یہ میرا حکم ہے۔"

میں نے بادل نخواستہ پوچھا۔

"دیوی جی! بن مانس تمہاری مالش کیسے کرتا ہے؟"

وہ اب جھومنے لگی۔ یہ چرس کے نشے کا اثر تھا۔ کہنے لگی۔

"بن مانس کی زبان بڑی لمبی ہوتی ہے۔ جب وہ کسی عورت کے بدن کو دیکھتا ہے تو اس کی زبان سے ایک خاص قسم کا تیل نکلنے لگتا ہے۔ اس تیل میں بڑی شکتی ہوتی ہے۔ یہ تیل عورت کے جسم کو پھر سے جوان کر دیتا ہے۔ بن مانس جو میرا خاوند بھی ہے، اپنی

زبان سے میری مالش کرتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور بن مانس کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"میرے پتی دیو! آجا، آجا۔"

وہ اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی بن مانس بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اچھل کر چبوترے پر آگیا۔ جوگن نے بن مانس کی انگلی پکڑی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔

"میں ابھی مالش کروا کر آتی ہوں۔ تم بھاگ مت جانا۔ یاد رکھو اگر بھاگ گئے تو میں تمہارا پیچھا نہیں کروں گی لیکن پھر تم اپنی بیوی کا منہ کبھی نہ دیکھ سکو گے۔"

وہ بن مانس کو لے کر کٹیا کے اندر چلی گئی۔

میں الاؤ کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ میں خوف زدہ ہوگیا تھا۔ خدا جانے یہ وحشی عورت میرے ساتھ کس قسم کا وحشیانہ سلوک کرنے والی تھی۔ کسی وقت خیال آتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس بھاگ جاؤں، پھر خیال آتا کہ اگر بھاگ گیا تو جمیلہ کو کبھی نہ پا سکوں گا۔ پھر خیال آتا کہ جہنم میں جائے یہ جوگن ووگن میں اکیلا ہی جنگل میں اپنی بیوی کی تلاش میں نکل پڑتا ہوں۔ جنگل کی طرف نگاہ ڈالی تو کچھ فاصلے پر خونی جنگل کے درخت تاریکی میں جن بھوتوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے محسوس ہوئے۔ خیال آیا کہ خالی جنگل ہوتا تو میں بے دھڑک نکل پڑتا مگر یہ خونی جنگل ہے جس کے بارے میں دیہاتی نے بھی مجھے بتایا تھا کہ اس طرف جو کوئی گیا واپس نہیں آیا۔ وہاں مگرمچھوں سے بھرے ہوئے جوہڑ ہیں، ہاتھیوں کو ثابت نگل جانے والی دلدلیں ہیں۔ آدمیوں سے چمٹ کر ان کا خون پی جانے والی بیلیں ہیں۔ آدمیوں کا گوشت کھا جانے والے درخت ہیں۔ زہریلے سانپ ہیں۔ اگرچہ میرے جسم کی بو مجھے ان مگرمچھوں، آدم خور درختوں اور زہریلے سانپوں سے بچا سکتی تھی مگر بندروں اور اژدہوں کا میں مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ خونی جنگل میں گمشدہ شہر کسی طرف کو ہے اور وہاں کونسا راستہ جاتا ہے۔ دیہاتی آدمی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ خونی جنگل میں ایسے خونخوار بن مانس رہتے ہیں جو آدمی کو دیکھ کر اس پر ٹوٹ پڑتے

"دیوی جی! مجھے سوم رس نہ ہی پلائیں تو آپ کی مہربانی ہو گی۔"

وہ غصے میں بولی۔

"کیا اپنا بچن بھول گئے ہو؟ یہ میرا حکم ہے تمہیں ماننا ہی پڑے گا۔ تم نے اگر سوم رس نہ پیا تو کام دیوتا کی پوجا ادھوری رہ جائے گی۔ کام دیوتا کی پوجا ادھوری رہ گئی تو وہ تمہاری بیوی کو مہادیو کی قید سے نکالنے میں میری مدد نہیں کریں گے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری بیوی تمہیں نہ ملے؟"

میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں دیوی! میں یہ ہرگز نہیں چاہتا۔ میں سوم رس ضرور پیوں گا۔"

وہ خوش ہو گئی۔ اس نے سلور کے جگ میں سے سوم رس نکال کر مٹی کے پیالے میں ڈالا اور پیالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لو۔ اسے پی جاؤ۔ آہستہ آہستہ پینا۔"

میں نے بڑی بے دلی سے پیالہ ہونٹوں کے ساتھ لگایا تو مجھے ایسی تیز بو آئی جیسے میرے سامنے کسی نے سپرٹ کا ڈرم کھول دیا ہو۔ میں نے بے اختیار ہو کر پیالہ پیچھے کر دیا۔

"کیوں؟" جوگن نے ڈانٹ کر کہا۔ "کیا ہوا ہے؟ سوم رس کے پیالے کی بے عزتی کی تو کام دیوتا ناراض ہو جائے گا۔ اسے پی جاؤ۔"

میں نے ناک بند کر کے پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لگانے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے حلق میں آگ اتر رہی ہے۔ تیزی سے میں نے پیالہ ختم کر کے نیچے رکھ دیا۔ میرے حلق سے جیسے گرم گرم بھاپ نکل کر ہوا میں تحلیل ہو گئی اور حلق انتہائی کڑوا ہو گیا تھا۔ جوگن نے مجھے کیلا چھیل کر دیا۔

"اسے کھا جاؤ۔ گنیش جی مہاراج کیلے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ بھی دیوتاؤں کا پھل ہے۔"

میں جلدی جلدی سارا کیلا کھا گیا۔ کیلا میٹھا تھا۔ اس سے میرے حلق کی کڑواہٹ کسی حد تک دور ہو گئی۔ مگر جگر میں جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔ آنکھوں سے سینک نکلنے لگا تھا۔

سر بھاری ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ شراب ہے جس کو جوگن سوم رس کہہ رہی ہے۔ میں نے اس سے وچھا۔

"یہ شراب تو نہیں تھی دیوی؟"

وہ اس وقت اپنا پیالہ پی رہی تھی۔ پیالہ چڑھانے کے بعد اس نے نتھنے پھلا کر عجیب سی آواز نکالی اور بولی۔

"کون دھشٹ اسے شراب کہتا ہے۔ یہ دیوتاؤں کا سوم رس ہے اور کام دیوتا آکاش سے مجھے خود لا کر دیتے ہیں۔ یہ لو اور پیئو۔"

اس نے زبردستی مجھے دوسرا پیالہ بھی بھر کر پلا دیا۔ دوسرا پیالہ پینے کے بعد میرا حلق پہلے کی طرح کڑوا نہیں رہا تھا۔ مجھے اپنا سر بھی ہلکا ہلکا لگنے لگا تھا۔ جسم میں ہلکی ہلکی گرمائش توانائی بن کر پھیلنے لگی تھی۔ جوگن مایا دیوی پر بھی ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔ کہنے لگی۔

"اندر چلو کام دیوتا کی پوجا کا وقت ہو گیا ہے۔"

وہ اٹھی اور لالٹین کٹیا کے اندر لے گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ایک دست بستہ غلام کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے کٹیا کا دروازہ بند کر دیا۔ کٹیا کے اندر ہرن کی چھال بچھی ہوئی تھی۔ کونے میں کسی دیوتا کی مورتی چوکی پر رکھی ہوئی تھی۔ جوگن نے مورتی کے آگے دیا روشن کر کے لوبان سلگا دیا۔ کٹیا میں بہت جلد لوبان کی تیز بو پھیل گئی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ جوگن مورتی کے آگے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور ہاتھ باندھ کر کسی عجیب زبان میں اشلوک گنگنانے لگی۔ دیر تک وہ اشلوک گنگناتی رہی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ لوبان میں سے اٹھتا ہوا دھواں ہاتھ سے اپنے چہرے پر ملتی۔ اشلوک ختم کرنے کے بعد اس نے دھوتی نما ساڑھی اتار کر ایک طرف رکھ دی اور میری طرف لال لال آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کام دیوتا حاضر ہو گئے ہیں۔ پوجا کا آخری ورتن ہو گا۔"

میں جیسے اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ وہ جو حکم دیتی تھی میں بندہ بے دام کی طرح اسے بجا لاتا۔ کام دیوتا کی پوجا شروع ہو گئی۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو

ہیں اور اس کی تکا بوٹی کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیہاتی آدمی نے دلی والے جوگی کی اس بات کی بھی تصدیق کی تھی کہ آلوپ نگر کے محل کے کھنڈر پر ایک اژدہا اپنے سانس سے آدمی کو کھینچ کر ثابت نگل لیتا ہے۔"

یہ سب کچھ سوچ کر میں وہیں الاؤ کے پاس بیٹھا رہا۔ سچ پوچھیں تو خونی جنگل میں اکیلا جانے کو میرا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ آخر یہی سوچ کر بیٹھا رہا کہ اس وحشی جوگن کا عذاب جھیلنا ہوگا اور اسی کے ساتھ آلوپ نگر جا کر اپنی بیوی کو واپس لانے کی کوشش کروں گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔

میں نے کٹیا کی طرف دیکھا۔ اس کا بانس کا دروازہ ایک طرف کو ہٹا ہوا تھا۔ جوگن لالٹین اپنے ساتھ اندر نہیں لے گئی تھی۔ لالٹین کٹیا کے باہر ہی جل رہی تھی اندر سے کسی کسی وقت بن مانس کے غرانے اور خرخرانے کی آواز آ جاتی تھی۔ اس کے بعد خاموشی چھا جاتی تھی۔ میں اپنی بیوی جمیلہ کے خیال میں غرق تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہم دونوں کس ناگہانی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ یا اللہ پاک تو ہی ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتا ہے۔ کافی دیر کے بعد کٹیا کے اندر سے پہلے بن مانس نکلا۔ وہ اچھلتا کودتا سینے پر زور زور سے دونوں ہاتھ مارتا، حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا باہر آیا اور چبوترے پر سے قلابازی لگا کر نیچے کودا اور دوڑتا ہوا جنگل کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد جوگن مایا دیوی اپنے بالوں کا جوڑا بناتی کٹیا سے باہر آئی۔ اس کے بدن کا جو حصہ ننگا تھا وہ اس طرح چمک رہا تھا جیسے اس پر تیل کی مالش کی گئی ہو۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے الاؤ میں خشک جھاڑیاں ڈال کر آگ کو دوبارہ روشن کر دیا۔ رات کو ہلکی ہلکی خنکی ہو گئی تھی۔ میں الاؤ کے پاس بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ چاہتا تھا کہ کسی جگہ لیٹ جاؤں۔ مگر میں کٹیا کے اندر جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں کٹیا کے اندر گیا تو وحشی عورت میرے ساتھ وہی سلوک کرے گی جو بن مانس نے اس کے ساتھ کیا تھا۔

وہ کہنے لگی۔ "مورکھ مرد! تجھے نیند تو نہیں آ رہی؟"

میں نے کہا۔ "نہیں دیوی جی!"

وہ ہنس پڑی۔

"ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔ ابھی مجھے تمہارے ساتھ مل کر کام دیوتا کی پوجا پاٹھ کرنی ہے۔"

میرا جسم لرز کر رہ گیا۔ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ میرے ساتھ یہ عورت کیا سلوک کرنے والی تھی۔ وہ بولی۔

"میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کو لاتی ہوں۔"

وہ واپس کٹیا میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بانس کی بڑی چنگیر تھی جس میں کیلے شریفے اور شکر قندی تھی۔ چنگیر اس نے میرے آگے رکھ دی اور کہا۔

"لو مزے سے کھاؤ۔ اس کے ساتھ تم پانی نہیں پیو گے۔ سوم رس پیو گے۔"

سوم رس کا میں نے سنا ضرور تھا مگر کبھی پیا نہیں تھا۔ ڈھاکے میں ایک ہندو پجاری ہوا کرتا تھا۔ اس کی زبانی سن رکھا تھا کہ سوم رس ہندوؤں کے دیوتا پیا کرتے ہیں۔ یہ ان کا پسندیدہ مشروب ہے۔ میں یہی سمجھا کہ یہ بھی گنگا جل کی طرح کا کوئی پانی ہوگا۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کر کٹیا میں گئی اور سلور کا ایک جگ اور مٹی کا پیالہ لے کر آ گئی۔ کہنے لگی۔

"تم نے کبھی سوم رس پیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"نہیں دیوی جی! کیا گنگا جل کی طرح کسی دریا کا پانی ہوتا ہے؟"

وہ بولی۔

"سوم رس صرف دیوتا لوگ پیتے ہیں۔ میں چونکہ کام دیوتا کی بھگتنی ہوں اس لیے کام دیوتا خود آ کر مجھے سوم رس دے جاتے ہیں۔ تم پیو گے تو تمہارا دماغ روشن ہو جائے گا۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

رہا ہے۔ دل میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ اس عورت کی مدد کے بغیر میں اپنی بیوی کو حاصل نہیں کر سکتا۔ ساری رات کام دیوتا کی پوجا جاری رہی۔ نہ جانے کس وقت میں نیم جان سا ہو کر ہرن کی چھال پر سو گیا۔

آنکھ کھلی تو کٹیا کے اندر دھوپ آ رہی تھی۔

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ میرا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ جوگن مایا کٹیا میں نہیں تھی۔ میں اٹھ کر باہر آیا۔ الاؤ بجھ چکا تھا۔ دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چبوترے کے سامنے کی جانب دور تک گھاس اور جھاڑیوں کا میدان تھا۔ جس کے سرے پر خونی جنگل کے درخت نظر آ رہے تھے۔ اتنے میں جوگن بھی آ گئی۔ اس کے بال گیلے تھے۔ وہ نہا کر آ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”کام دیوتا نے میری پوجا سویکار کر لی ہے۔ وہ تم سے بھی بہت خوش ہیں۔ اب تمہارا کام ہو جائے گا۔ کام دیوتا اس مہم میں ہماری حفاظت کریں گے۔ جاؤ تم بھی اشنان کر آؤ۔ سامنے والی جھاڑیوں کے پیچھے تالاب ہے۔“

میں تالاب کی طرف چل پڑا۔ مجھے دیکھ کر یا میرے جسم کی بو پا کر جھاڑیوں میں سے دو خرگوش گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں نے تالاب میں غسل کیا واپس آیا تو جوگن چاول ابال رہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

”یہاں تمہیں پھل اور چاول وغیرہ کون لا کر دیتا ہے؟“

وہ بولی۔

”پھل فروٹ میرا بن مانس خاوند میرے لیے لے آتا ہے۔ چاول اور چائے میں خود گاؤں میں جا کر لاتی ہوں۔“

ہم نے وہیں چولہے کے پاس بیٹھ کر چاول کھائے، چائے پی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ہم آلوپ نگر کی جانب کس وقت روانہ ہوں گے۔ وہ بولی۔

”دن کے تیسرے پہر یہاں سے نکلیں گے۔ لیکن تم اس حلیے میں میرے ساتھ نہیں

جاؤ گے۔ تمہیں جوگی سادھوؤں والا حلیہ بنانا پڑے گا۔“

میں نے کہا۔

”میرے پاس تو سادھوؤں کا لباس نہیں ہے۔“

وہ بولی۔

”سادھوؤں کو لباس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے پاس ایک گیروی دھوتی ہے تم وہی اپنے جسم پر لپیٹ لینا۔ پاؤں میں جوتی بے شک یہی پہن لینا۔“

جوگن نے تیسرے پہر میرے کپڑے اتروا کر میرے سارے بدن پر چولہے کی راکھ مل دی۔ سر میں بھی راکھ ڈال کر میرے بالوں کی مروڑیاں سی بنا دیں۔ پھر مجھے سادھوؤں والی زعفرانی رنگ کی دھوتی پہنائی جس کا ایک پلو میں نے کندھے پر ڈال لیا۔ کہنے لگی۔

”اب تم میرے ساتھ آلوپ نگر میں داخل ہو سکو گے۔“

میں نے پوچھا۔

”کیا ہم آلوپ نگر میں داخل ہو سکیں گے؟“

وہ بولی۔

”تم دیکھتے جاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کرتی۔ رات تم نے کام دیوتا کو خوش کر دیا ہے۔ میری پوجا سویکار ہو گئی ہے۔ کام دیوتا ہماری مدد کرے گا۔ جب ہم آلوپ نگر میں داخل ہوں گے تو تم گونگے بہرے بن جاؤ گے۔ پھر تمہارا نام ہری بھگت ہو گا۔ کوئی تم سے بات کرے گا تو تم یہ ظاہر کرو گے تم کچھ نہیں سن رہے۔ تم کچھ بولو گے بھی نہیں۔ باقی میں سنبھال لوں گی۔“

میں نے جوگن کی نظریں چھپا کر کمانڈو چاقو اپنی دھوتی میں چھپا کر رکھ لیا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ آگے چل کر حالات کیا شکل اختیار کر لیں۔ جوگن نے بھی جوگنوں والا حلیہ بنا لیا۔ ماتھے پر تلک کی تین سرخ لکیریں ڈالیں۔ بالوں کو شانوں پر کھلا چھوڑ دیا۔ ہاتھ میں ترشول پکڑ لیا۔ ہم تیسرے پہر کٹیا سے نکل کر اپنی مہم پر روانہ ہو گئے۔

جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈوں والا میدان عبور کرتے ہمیں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔

خونی جنگل کی سرحد پر پہنچ کر جوگن نے رک کر اونچے سیاہ تنوں والے درختوں کو دیکھا اور دھیمی آواز میں کوئی اشلوک پڑھا اور کہنے لگی۔

"ڈرنا بالکل نہیں۔ کوئی مگرمچھ، کوئی سانپ، کوئی آدم خور درخت اور جھاڑیاں ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گی۔"

ہم خونی جنگل میں داخل ہوگئے۔

یہ وقعی بڑا ہیبت ناک جنگل تھا۔ ایسا جنگل میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ درختوں کے تنے بالکل سیاہ کالے تھے۔ ان پر کانٹے دار بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ کچھ دور تک جنگل میں ہمیں اتنا راستہ ملتا گیا کہ ہم آسانی سے چلتے رہے۔ اس کے بعد جھاڑیاں ایک دوسرے میں الجھ گئیں۔ ہمیں ان کی شاخوں کو ہٹا کر راستہ بنانا پڑتا تھا۔ جوگن ترشول سے جھاڑیوں کو ہٹاتی جاتی تھی۔ جھاڑیاں ختم ہوئیں تو ایک تالاب دکھائی دیا۔ تالاب کی سطح پر سبز کائی جمی ہوئی تھی۔ تالاب کے کنارے چھ سات مگرمچھ لیٹے ہوئے تھے۔ ہمارے قدموں کی آواز آہٹ پر مگرمچھوں نے سر اٹھائے اور نوکیلے دانتوں والے جبڑے کھول کر ڈراؤنی آوازیں نکالیں۔ میں ڈر کر رک گیا۔

جوگن نے کہا۔

"چلتے چلو۔ یہ ابھی بھاگ جائیں گے۔"

جیسے ہی مگرمچھوں نے ہمارے جسموں سے خارج ہونے والی جڑی بوٹیوں کی بو سونگھی وہ تڑپ کر تالاب کی طرف دوڑے اور پانی میں اتر کر غائب ہوگئے۔ اس کے بعد ایک کالا سیاہ تختہ دیکھا جس پر درختوں کے پتے گرے ہوئے تھے۔ جوگن نے مجھے بازو سے پکڑا اور دوسری طرف لے گئی۔ کہنے لگی۔

"یہ دلدل ہے۔ یہ اتنی گہری ہے کہ اس میں اگر ہاتھی گر پڑے تو یہ اسے ایک سیکنڈ میں نگل لے گی۔"

میں نے غور سے دیکھا۔ سیاہ دلدل میں سے بخارات اٹھ رہے تھے جیسے دلدل سانس لے رہی ہو۔ اس خونی جنگل میں گھنے درختوں کی وجہ سے دھوپ بالکل غائب تھی۔ دن

کی روشنی بھی پھیکی اور دھندلی تھی۔ ایک جگہ جھاڑیوں میں سے سانپ کی پھنکاریں بلند ہوئیں۔ میں ڈر کر جوگن کے ساتھ لگ گیا۔ اتنے میں تین سبز اور سرخ رنگ کے سانپ جھاڑیوں میں سے نکل کر ہم سے دور بھاگ گئے۔ جوگن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں گھبراتے ہو؟ میرے گورو دیو نے تمہیں گنگا جل میں جو بوٹی گھول کر پلا دی ہے اس کی خوشبو تمہارے جسم سے برابر نکل رہی ہے۔ یہ خوشبو کسی سانپ، بچھو، مگرمچھ، شیر، چیتے کو تمہارے قریب نہیں آنے دے گی۔ صرف بندروں اور بن مانسوں پر اور اژدہا سانپوں پر اس بو کا اثر نہیں ہوگا۔ آجاؤ۔"

ہم پھر چل پڑے۔

سرخ آنکھوں سے اسے تکنے لگا۔ جوگن بالکل پتھر کی مورتی بن کر ساکت کھڑی تھی۔ سیاہ بن مانس کچھ دیر بیٹھا جوگن کو گھورتا رہا۔ پھر وہ چند قدم چل کر جوگن کے بالکل پاس آ گیا۔ اتنا بڑا اور بھیانک بن مانس اپنے اتنا قریب دیکھ کر میں سہم سا گیا۔ سیاہ بن مانس نے اپنے بد دفع چوڑے نتھنے پھلا پھلا کر جوگن کے جسم کو سونگھنا شروع کر دیا۔ شاید اسے جوگن کے بدن سے اس کے خاوند بن مانس کی بو آنے لگی تھی۔ سیاہ بن مانس ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے حلق سے خاص قسم کی آواز نکالی۔ اس آواز کو سن کر سارے بندر کیچ کیچ کرتے بھاگ گئے۔ ان کے بعد سیاہ بن مانس بھی اچھل اچھل کر چلتا ہوا درختوں میں گم ہو گیا۔

جوگن نے گہرا سانس بھرا اور دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

"میرے جسم سے میرے خاوند بن مانس کی بو بھی نکلتی رہتی ہے۔ اس بو کو سونگھنے کے بعد یہ خونی بن مانس واپس پلٹ گیا ہے۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو اس نے دوسرے بندروں کے ساتھ مل کر ہماری ابھی تکا بوٹی کر دینی تھی۔"

یہاں درخت زیادہ اونچے نہیں تھے۔ ان کی گھنی شاخیں ایک دوسرے سے الجھی ہوئی تھیں اور جنگل میں ایک چھت سی پڑی ہوئی تھی۔ یہاں دن کی روشنی اور کم ہو گئی تھی۔ خاموشی ایسی تھی کہ کسی پتے کے درخت سے گرنے کی بھی آواز نہیں آتی تھی۔ ہر تیسرے قدم پر کسی نہ کسی سانپ کی پھنکار کی آوز آتی اور پھر کوئی نہ کوئی سانپ گھاس میں سے نکل کر ہم سے ڈر کر دوسری طرف بھاگ جاتا۔ ہمارے جسموں کی بو وجہ سے مجھے ابھی تک کسی مکھی، مچھر اور چیونٹی تک نے نہیں کاٹا تھا۔ جوگن بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے کر لیا تھا۔ درختوں کا گھنا پن ختم ہو گیا۔ آگے پتھروں سے بنائی گئی سیڑھیاں آگئیں جو نیچے آلوپ نگر کے کشادہ صحن میں اترتی تھیں۔ سیڑھیاں دائیں بائیں کافی دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ پتھر ٹوٹے پھوٹے تھے اور ان کے درمیان گھاس اگ آئی تھی۔

"جوگن نے آہستہ سے کہا۔

"ہم آلوپ نگر میں داخل ہو رہے ہیں۔ اب تم میرے اشارے کے بغیر منہ سے کچھ نہ بولو گے۔"

دس بارہ سیڑھیاں تھیں۔ ہم اتر کر کشادہ صحن میں آ گئے۔ یہ ویران اور اجڑی ہوئی جگہ تھی۔ ہر طرف گھاس پر خشک پتے بکھرے ہوئے تھے۔ خاموشی ایسی تھی جیسے ساری فضا کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ سامنے دائیں بائیں آلوپ نگر کی ہندووانہ میناروں اور ترچھے ڈھلواں گنبدوں والی اونچی اونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ یہ پرانی کھنڈر بنی ہوئی عمارتیں تھیں۔ ان پر جیسے آسیب چھایا ہوا تھا۔ گنبدوں اور میناروں میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ گئی تھیں جن میں سے لمبی لمبی گھاس کی شاخیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کوئی انسان تو کیا جانور یا پرندہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا یہ مردہ روحوں کا شہر ہے۔ ہم جس کچے راستے پر جا رہے تھے اس پر خشک جھاڑیوں اور پتوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ جوگن چاروں طرف دیکھتی ہوئی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چل رہی تھی۔ ایک عمارت کے باہر دونوں جانب چبوتروں پر ہنومان کے بڑے بڑے بت بنے ہوئے تھے۔ جوگن نے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ ہنومان جی کا آشرم ہے۔ یہاں ان کی آتما بسرام کرتی ہے۔ سامنے والے آشرم میں مہادیوی جی کی نرتکیاں اور داسیاں رہتی ہیں۔"

میں بالکل گم سم سا ہو کر جوگن کے ساتھ ساتھ ذرا پیچھے رہ کر چل رہا تھا اور حیرت زدہ آنکھوں سے اس گمشدہ آسیبی شہر کے کھنڈروں کو دیکھ رہا تھا۔ ہم ان ویران کھنڈروں سے نکل کر دوسرے تختے میں آ گئے۔ یہاں کھلی جگہ پر عجیب و غریب قسم کے درخت دیکھے جن کی شاخیں جھک کر زمین کو چھو رہی تھیں۔ ان درختوں کے نیچے سے گزرنے لگے تو درختوں کی شاخیں ایک دم اوپر کو اٹھ کر سمٹ گئیں۔ جوگن نے دھیمی آواز میں بتایا کہ یہ سارے آدم خور درخت ہیں۔

"یہاں جتنی دیوداسیاں نرتکیاں اور مہادیو جی کی اپسرائیں رہتی ہیں۔ ان کے جسموں سے ہمارے جسموں والی بو ہر وقت خارج ہوتی رہتی ہے۔ یہ درخت انہیں کچھ نہیں کہتے۔ اگر باہر کا کوئی آدمی راستہ بھول کر ادھر آ نکلے تو یہ درخت اسے چٹ کر جاتے ہیں

یہ ایسے خونی درخت ہیں کہ بدنصیب آدمی کی ہڈیاں تک کھا جاتے ہیں۔"

سامنے سیاہ کالے درختوں کے درمیان کچھ اور میناروں والی عمارتوں کے کھنڈرات دکھائی دیے۔ جوگن نے مجھے بازو سے پکڑ کر وہیں زمین پر بٹھا لیا۔ وہ گھور کر ان عمارتوں کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہ مہادیو جی کا آشرم ہے۔ تمہاری بیوی مجھے یقین ہے اسی آشرم میں ہوگی۔"

میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اپنی بیوی جمیلہ کو یاد کر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے جنہیں میں نے آنکھوں میں ہی پی لیا اور باہر نہ آنے دیا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"دیوی! میری بیوی ٹھیک حالت میں ہوگی نا؟"

اس جگہ کا ماحول دیکھ کر میں ڈر رہا تھا کہ جمیلہ پر ضرور کسی نہ کسی آسیب کا سایہ ہوگا یا اس پر نہ جانے کیسے کیسے منتر پھونک کر اسے بے حال کر رکھا ہوگا۔ جوگن دور سامنے نظر آنے والی پر اسرار کھنڈر نما عمارتوں کو دیکھ رہی تھی۔ میری بات اس نے سن لی تھی۔ سامنے نظریں جمائے اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا یہ مہادیو جی کا آشرم ہے۔ یہاں راتوں کو دیوتا لوگ اتر کر نرتکیوں کا ناچ دیکھتے ہیں۔ سوم رس پیتے ہیں اور دیوداسیوں سے من لبھاتے ہیں۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے اور تمہاری پتنی تو مہادیو جی کی خاص دیوداسی ہے----"

اس سے آگے پوچھنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی کہ نہ جانے جوگن آگے سے کیا کہہ دے۔ وہ اٹھی اور بولی۔

"مجھے ہنومان کنڈ کے پیچھے سے ہو کر جانا ہوگا۔"

وہ مجھے لے کر دائیں جانب جھاڑیوں کی اوٹ میں چلنے لگی۔ لگ رہا تھا کہ وہ مہادیو کے آشرم والی عمارت سے بچ کر جا رہی ہے۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ ٹھہر گئی اور جھاڑیوں کو ترشول سے ایک طرف ہٹا کر دیکھنے لگی۔ میں اس کے پہلو میں ہی تھا۔ جھاڑیوں سے کوئی ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر پتھر کی ایک کوٹھڑی نظر آ رہی تھی۔ شام کے بڑھتے پھیلتے دھندلکے میں پتھر کی کوٹھڑی ایک بہت بڑے ہاتھی کی طرح لگ رہی تھی۔ جو

زمین پر بیٹھ کر ساکت ہو گیا ہو۔ جوگن جیسے اپنے آپ سے کہنے لگی۔

"سیندھیا کٹیا میں ہی ہوگی۔ کہیں مہادیو کے آشرم میں نہ چلی گئی ہو۔ تب وہ صبح سے پہلے نہیں آ سکے گی۔ چل کر دیکھتے ہیں۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ مجھے لے کر کٹیا کی طرف بڑھی۔ یہ ایک پرانی وضع کی کوٹھڑی کا کھنڈر تھا۔ دروازہ غائب تھا۔ اس کے آگے موٹے ٹاٹ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ کٹیا ایک کشادہ چبوترے پر بنی ہوئی تھی۔ چبوترے پر جگہ جگہ چھوٹی جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ جوگن نے ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر سیندھیا کو آواز دی جو اس کی پرانی سہیلی تھی اور آلوپ نگر میں مہادیو کی خدمت پر مامور تھی اور بقول جوگن کے آشرم کی دوسری عورتوں کی طرح وہیں مقیم تھی اور وہاں سے کبھی باہر نہیں آئی تھی۔

سیندھیا کٹیا میں نہیں تھی۔ اندر اندھیرا اور ایسی نم آلود بو آ رہی تھی جیسے پرانے قلعوں کے تہہ خانوں سے آیا کرتی ہے۔ جوگن نے اندھیرے میں ایک طاق میں سے بجھے ہوئے دیے کو تلاش کر لیا۔ وہیں ماچس بھی پڑی تھی۔ اس نے دیا سلائی جلا کر دیا روشن کر دیا۔ دیا پیتل کا تھا۔ اس کی لو اوپر اٹھی تو اس کی نرم اور دھندلی روشنی میں کٹیا کے فرش پر بچھی ہوئی ہرن کی کھال نظر آئی۔ کونے میں پیتل کی گاگر اور پیتل کا کرمنڈل اور ہنومان کی ایک مورتی رکھی تھی۔ مورتی کے آگے پیتل کی تھالی میں تین چار باسی پھول اور لوبان پڑا تھا۔ جوگن نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔ سیندھیا مہادیو کے آشرم میں ہی ہوگی۔ اب ہمیں رات اس کٹیا میں ہی گزارنی ہوگی۔ صبح سے پہلے مہادیو اسے نہیں چھوڑیں گے۔ وہاں ساری رات کام دیوتا کی پوجا ہوگی۔"

کام دیوتا کی پوجا کے خیال سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ پچھلی رات میں کام دیوتا کی پوجا کا تختۂ مشق بن چکا تھا۔ کٹیا میں داخل ہوتے وقت مجھے مچھروں کی آوازیں آئی تھیں لیکن اس کے بعد سارے کے سارے مچھر ہمارے جسم کی بو پا کر غائب ہو گئے۔ کٹیا میں گرمی تھی۔ میں نے جوگن سے کہا۔

"یہاں حبس ہے۔ باہر نکل کر بیٹھتے ہیں۔"

وہ بولی۔

"باہر خطرہ ہے۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں، آلوپ نگر میں باہر کی دنیا کا کوئی مہاتما جوگی جوگن اور دھرماتما ستی سنیاسی بھی مہا دیو کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا۔ اول تو ہزار میں سے کسی ایک جوگی جوگن کو اسی جڑی بوٹی کا علم ہوتا ہے۔ جسے میں نے گنگا جل میں گھول کر پی رکھا ہے اور جسے تمہیں بھی میرے گورو دیو نے دلی والی کٹیا میں تمہیں پلایا تھا اور جس کی بو کے اثر سے کوئی سانپ، بچھو، مگرمچھ ہمارے نزدیک نہیں پھٹکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ جوگی جن کے جسم سے ایسی بو نہیں نکل رہی ہوتی اگر وہ اپنی پتسیا کے زور پر بھروسہ کر کے محض آلوپ نگر کی دیوداسیوں سے عیاشی کرنے کے خیال سے آلوپ نگر کا رخ کرتے ہیں انہیں خونی جنگل کے مگرمچھ، سانپ اور آدم خور درخت راستے میں ہی ختم کر دیتے ہیں۔ میں نے صرف تمہاری خاطر یہ خطرہ مول لیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"تمہیں چاہیے تھا کہ کسی طرح مہا دیو سے یہاں آنے کی اجازت لے لیتیں۔"

وہ بولی۔

"میں مہا دیو کے آشرم میں پانچ سال گزار چکی ہوں۔ تب میں سولہ برس کی نوجوان کنیا تھی۔ مہادیو جی نے میرے ساتھ خوب عیاشی کی اور جب جی بھر گیا تو مجھے ہنومان جی کے ایک بن مانس کے حوالے کر کے آلوپ نگر سے نکال دیا۔ اس بن مانس نے مجھے اپنی بیوی بنا لیا۔ تم اس بن مانس کو دیکھ چکے ہو۔ جس عورت کو مہا دیو جی اپنے آشرم سے نکال دیتے ہیں اسے نہ تو واپس آلوپ نگر میں گھسنے کی اجازت ہوتی ہے اور نہ وہ بھارت کے کسی شہر یا دیہات میں جا کر رہ سکتی ہے۔ اس کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ آلوپ نگر کے بارے میں کسی کو کوئی راز بتائے۔ اگر وہ شہر یا کسی گاؤں میں جا کر آباد ہونے کی کوشش کرتی ہے تو آلوپ نگر کے دہشت جوگی لوگ اسے رات کی تاریکی میں آ کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ سیندھیا میری سہیلی ہے۔ وہ مجھ سے دس سال چھوٹی ہے۔ اس میں ایک خاص بات

یہ ہے کہ اسے مہا دیو جی کو رجھانے کے طریقے آتے ہیں۔ وہ اس وقت مہا دیو جی کی چہیتی داسی ہے۔ وہ نرتکی بھی ہے۔ یہاں جتنی داسیاں ہیں وہ سب نرتکیاں بھی ہیں اور مہا دیو جی کے آشرم میں ان کے سامنے رات کو نیم عریاں ہو کر ناچتی ہیں۔"

میں نے اسے کہا کہ باہر تو چاروں طرف سناٹا اور اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ دور دور تک کسی انسان کی آواز تک سنائی نہیں دیتی۔ پھر باہر کھلی ہوا میں بیٹھنے میں کیا حرج ہے۔ جوگن مایا دیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو مورکھ ہے۔ تو آلوپ نگر کے بھید نہیں جانتا۔ یہاں آدھی رات کے بعد کالے بن مانس گشت پر نکلتے ہیں۔ اگر وہ کسی کو باہر بیٹھا یا چلتا پھرتا دیکھ لیں تو اس پر حملہ کر دیتے ہیں اور چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ مہا دیو جی کے حکم سے رات کے وقت آشرموں کا کوئی جوگی، کوئی نرتکی، کوئی دیوداسی اپنی اپنی کٹیا سے باہر نہیں نکل سکتی۔"

میں سمجھ گیا کہ رات اسی کٹیا کے اندر حبس میں اس جوگن کے ساتھ گزارنی پڑے گی۔ میں نے احتیاطاً پوچھ لیا۔

"تمہاری سہیلی سیندھیا دن نکلنے پر تو آ جائے گی نا؟"

جوگن نے ترشول ایک طرف رکھ دیا تھا اور اپنی دھوتی نما ساڑھی کے پلو سے اپنے جسم کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ اس کی رہی سہی شرم کو حیا بھی میرے سامنے نہیں رہی تھی۔ وہ ایسے اپنے جسم کو ساڑھی کے پلو سے پونچھ رہی تھی جیسے وہاں اسے دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ کہنے لگی۔

"دن نکلنے پر ہی آئے گی۔ مہادیو جی اسے رات کو کہاں چھوڑیں گے۔"

میرے سر کے راکھ آلود بال اکڑ سے گئے تھے۔ مجھے اس کی عادت نہیں تھی۔ کبھی سر میں راکھ نہیں ڈالی تھی۔ میں نے کہا۔

"میں اپنے بالوں میں سے راکھ جھاڑ لوں؟"

وہ بولی۔

"خبردار! ایسا ہرگز نہ کرنا--- اور سنو! تمہیں سیندھیا کے سامنے گونگا بہرہ بننے کی

ضرورت نہیں ہے۔ وہ میری ہم راز ہے۔ مجھے اس کو تمہاری بیوی کے بارے میں سب کچھ بتانا پڑے گا۔ وہی ہماری مدد کر سکتی ہے۔"

میں خاموش ہو کر بیٹھا رہا۔ جوگن ساڑھی جسم سے الگ کر کے جھاڑنے لگی۔ وہ بالکل عریاں تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہہ ہی دیا کہ وہ مرد کے سامنے ذرا بھی شرم نہیں کرتی۔ وہ کہنے لگی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تم میرے مرد بن چکے ہو۔ تم سے میرا کوئی پردہ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندو دھرم میں ہم استریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے ننگے جسم پر جسقدر آدمیوں کی نظر پڑے گی ہمارے اتنے ہی گناہ جھڑ جائیں گے۔"

اس نے دوبارہ ساڑھی پہن لی۔ پیتل کی گاگر میں سے پانی نکال کر مجھے بھی پلایا اور خود بھی پیا۔ کہنے لگی۔

"تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ مجھے بھی بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ ابھی رات پوری طرح سے نہیں چھائی۔ میں باہر جا کر کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔"

میں نے اسے خبردار کیا کہ باہر کالے بن مانس گشت پر ہوں گے۔ وہ بولی۔

"وہ آدھی رات کے بعد نکلتے ہیں اور پھر کالے بن مانس ہمارے میرے رشتے دار ہیں۔ انہیں میرے جسم کی بو سے پتہ چل جاتا ہے کہ میں بن مانس کی بیوی ہوں۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ ہاں تم ہرگز ہرگز یہاں سے باہر مت نکلنا۔ وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ چلی گئی۔ میں اپنے پریشان کن خیالات میں کھو گیا۔ جن حالات میں قسمت نے مجھے پھنسا دیا تھا اس کے بارے میں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو اس نے ساڑھی کی جھولی میں پھل ڈال رکھے تھے۔ کہنے لگی۔

"آلوپ نگر میں بڑے پھل دار درخت ہیں۔ یہ دیکھو میں کیلے اور شریفے لائی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"کیا یہاں صرف یہی دو پھل ہوتے ہیں؟"

وہ بولی۔

"یہ دونوں پھل ہندو دھرم میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیلا گنیش جی دیوتا کا پسندیدہ پھل ہے اور شریفہ وہ پھل ہے کہ جب سیتا میا رام چندر جی کے ساتھ بن باس میں تھیں تو جنگلی شریفے کا پھل بڑے شوق سے کھایا کرتی تھیں۔ اس کو ہم لوگ سیتا پھل بھی کہتے ہیں۔"

میں نے اور جوگن نے سیر ہو کر پھل کھائے اور کٹیا میں ہی بیٹھے رہے۔ مجھے جوگن کچھ بے چین سی نظر آنے لگی۔ وہ ادھر ادھر کٹیا میں کوئی چیز تلاش کرنے لگی۔ میرے پوچھنے پر بولی۔

"یہاں کہیں گانجا اور چلم ضرور ہوگی۔"

"دیوی! خدا کے لیے گانجا مت پینا۔ اس کے دھوئیں سے میرا دم گھٹتا ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔ بولی۔

"تم مورکھ ہو۔ گانجا پینے والوں کے لیے اس کا دھوں امرت ہے۔ تم بھی گانجا پیؤ گے تو تمہیں اس کا دھواں امرت لگے گا۔"

معلوم ہوا کہ سیندھیا بھی گانجا پیتی تھی اور اس نے گانجا اور چلم وہیں کسی جگہ رکھی ہوئی تھی۔ آخر جوگن نے اسے تلاش کر لیا۔ اس نے میرے سامنے بیٹھ کر چلم میں گانجا بھرا اور دیا سلائی جلا کر چلم کے دو تین کش لگائے۔ کٹیا میں گانجے کا دھواں پھر گیا۔ نتھنے کھول کر اس نے اپنی عادت کے مطابق تین چار لمبے لمبے سانس لیے اور بولی۔

"گانجا دیوتاؤں کا امرت ہے۔ اس کو پی کر جوگی جوگن آکاش کی سیر کرتے ہیں۔ لو تم بھی پی کر دیکھو۔"

میں نے کہا۔

"دیوی جی! میں گانجا نہیں پی سکتا۔"

"سوم رس پیؤ گے؟ سیندھیا آئے گی تو اس سے سوم رس بھی مل جائے گا۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"دیوی! مجھے معاف کر دو۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ اب جتنی جلدی ہو سکے مجھے میری بیوی سے ملا دو تاکہ میں اسے لے کر یہاں سے نکل جاؤں۔"

اس نے سخت آواز میں کہا۔

"تم اسے اتنا آسان کام سمجھتے ہو؟ یہ کام اتنی جلدی نہیں ہونے والا۔ ابھی سیندھیا کو ساری رام کہانی سنانی ہے۔ پھر اس کے ساتھ مشورہ کرنا ہے کہ ہمیں تمہاری پتنی کو مہادیو جی کے آشرم سے کیسے نکالا جائے۔ مہادیو جی کے آشرم سے ان کی پسندیدہ نرتکی کو نکال کر لے جانا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ اگر راز کھل گیا تو جانتے ہو تمہارا میرا اور سیندھیا کا کیا حشر ہوگا؟ ہمیں کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں ڈال دیا جائے گا۔ ہاں۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ جوگن نے سارا گانجا پی لیا۔ چلم کونے میں رکھ دی اور اپنے چوڑے نتھنوں کو پھلا کر زور زور سے سانس لینے لگی۔ یہ عادت اس نے شاید اپنے بن مانس خاوند سے سیکھی تھی۔ اس وقت جوگن مایا دیوی بھی مجھے بن مانس ہی لگ رہی تھی۔ اس کے سینے پر تھوڑے تھوڑے بال بھی تھے۔ بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر وہ بن مانس کا روپ اختیار کر لیتی۔ گانجا یعنی چرس سے گھٹ ہو کر وہ خر خر کرنے لگی اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور میرے شانوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں خوف کے مارے کانپ گیا۔ سمجھ گیا کہ ایک بار مجھ پر قیامت کی رات آنے والی ہے لیکن قدرت نے مجھے بچا لیا۔ عین اس وقت باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

جوگن کے کان کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگی۔

"شاید میری سکھی سہیلی سیندھیا آگئی ہے۔"

قدموں کی آہٹ کٹیا کے پاس آکر رک گئی۔ پھر کسی نے ایک دم ٹاٹ اوپر کر دیا۔

"کون ہو تم؟"

جوگن اپنی بانہیں پھیلا کر دروازے کی طرف بڑھی جہاں ایک جوان عورت نیم عریاں لباس میں کھڑی تھی۔ جوگن کو دیکھ کر اس کا چہرہ بھی کھل اٹھا۔ دونوں گلے لگ کر ملیں۔

یہ سیندھیا ہی تھی۔ سیندھیا نے میری طرف غور سے دیکھا کر جوگن سے پوچھا۔

"مایا! یہ کون ہے؟ بڑا گورا چٹا مرد ہے۔ اسے کہاں سے پھانس کر لے آئی ہو؟"

جوگن نے اس سے میرا مختصر تعارف کرایا اور بولی۔

"سیندھیا تم بیٹھ جاؤ۔ بساری رام کہانی سناتی ہوں۔"

سیندھیا نے پوچھا۔

"تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی بن مانس نے تو نہیں دیکھا؟"

جوگن بولی۔

"بن مانس میرے رشتے دار ہیں۔ دیکھ بھی لیتے تو کیا فرق پڑتا؟"

سیندھیا نے کہا۔

وہ میں جانتی ہوں کہ بن مانس تمہارا پتی دیو ہے مگر یہاں کے بن مانس جاسوس بن مانس ہیں۔ تم تو جانتی ہی ہو۔ وہ تمہیں تو کچھ نہ کہتے مگر اپنی اشاروں کی زبان میں دہشٹ سپیرے کو ضرور بتا دیتے کہ آلوپ نگر میں ایک اجنبی مرد اور عورت داخل ہو چکے ہیں۔"

دہشٹ سپیرے کا سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ دلی کے جوگی نے مجھے ٹھیک جگہ ہی بھیجا تھا۔ دہشٹ سپیرا ہی میری بیوی جمیلہ کو اپنے منتروں کے طلسم میں اسیر کر کے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ جمیلہ اسی آلوپ نگر میں موجود ہے۔ اب مجھے اس کو وہاں سے نکال لے جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ کمانڈو چاقو میرے پاس موجود تھا اور میرے ایسے تجربہ کار کمانڈو کے سامنے ان عورتوں اور دہشٹ سپیرے کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں نے سیندھیا سے سوال کر دیا۔

"کیا دہشٹ سپیرا یہاں موجود ہے؟ وہی میری بیوی کو اٹھا کر لے گیا تھا۔"

سیندھیا نے حیرانی سے جوگن کی طرف دیکھا۔

"یہ تمہارا مرد کیا کہہ رہا ہے؟"

جوگن نے سیندھیا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس اور میرے قریب ہی بٹھا لیا اور کہا۔

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ میں تمہیں ساری سناؤں گی۔ اسی واسطے میں اس مرد کو لے

کر یہاں آئی ہوں۔"

میں نے محسوس کیا کہ سیندھیا میری طرف بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں بڑے خوفناک خفیہ اشارے تھے اور میں اپنی جگہ پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا اس بن مانس عورت کے ساتھ بھی مجھے کام دیوتا کی پوجا کرنی پڑے گی؟"

سیندھیا نے جوگن مایا کا منہ چوم کر کہا۔

"تم نے لگتا ہے میرا سارا گانجا پی لیا ہے۔"

جوگن بار بار سیندھیا سے اس طرح لپٹ رہی تھی جیسے وہ کوئی مرد ہو۔ کہنے لگی۔

"یہاں گانجا ہی تھا اگر سوم رس ہوتا تو وہ بھی پی جاتی۔"

سیندھیا نے جوگن کے جسم کی چٹکی بھر کر کہا۔

"وہ بھی تمہیں ضرور پلاؤں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہ سندر مرد کون ہے؟ اسے کہاں سے پکڑ کر لائی ہو؟"

جوگن نے شروع سے لے کر آخر تک میری ساری داستان غم اس کے آگے بیان کر دی۔ میری مصیبت کی کہانی سیندھیا نے بڑے غور سے سنی۔ جب جوگن نے پوچھا کہ کیا میری بیوی مہادیو کے آشرم میں ہی ہے۔ تو وہ کہنے لگی۔

"اس مرد نے اپنی بیوی کا جو حلیہ بتایا ہے اس حلیے کی عورت مہادیو جی کے خاص آشرم میں رہتی ہے اور مہادیو کی خاص پسندیدہ نرتکی اور داسی ہے۔ اسے آشرم سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ تم لوگ اسے آلوپ نگر سے کیسے نکال کر لے جاؤ گے؟"

میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

"وہ میری بیوی ہے۔ تمہارے مہادیو نے اسے غیر قانونی طور پر اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ میں جان کی بازی لگا کر بھی اسے نکال کر لے جاؤں گا۔ تم مجھے اتنا بتا دو کہ تمہارے مہادیو کا آشرم یہاں سے کس طرف ہیں؟"

سیندھیا ایسے مسکرا رہی تھی جیسے میں احمقوں والی باتیں کر رہا ہوں۔ جوگن مایا دیوی کو بھی حالات کی سنگینی کا احساس تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کرم داد! صبر سے کام لو۔ تم نہیں جانتے یہاں کس قدر سخت پہرے لگے ہوئے ہیں۔ دن کو سانپ، مگرمچھ اور رات کو بن مانس اور اژدہا مہادیو کے آشرم کی حفاظت کرتے ہیں۔ تم سانپوں، مگرمچھوں سے تو بچ کر نکل جاؤ گے مگر اژدہوں اور خونخوار بن مانسوں کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔"

سیندھیا مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

"اور پھر یہ بات بھی ہے کہ تمہاری بیوی مہادیو کے آشرم میں بڑی خوش خوش رہ رہی ہے۔ شاید وہ تمہارے ساتھ جانے سے انکار کر دے۔"

میں نے کہا۔

"اس پر جادو ٹونہ کیا گیا ہے۔ تمہارے جادوگر پجاریوں اور دہشت سپیرے نے اس پر منتر پھونک کر اس کا ذہن بدل دیا ہے، ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری بیوی جو پکی مسلمان ہے ایک ہندو پجاری کے پاس خوش ہو کر رہے۔"

جوگن نے سیندھیا سے کہا۔

"سیندھیا! تم ان باتوں کو چھوڑو۔ میں نے اس شخص کرم داد کو کام دیوتا کے سامنے بچن دیا ہے کہ میں اس کی بیوی اس کو ضرور واپس دلاؤں گی۔ مجھے ہر حالت میں اپنا بچن پورا کرنا ہے۔ اگر میں نے اپنا بچن پورا نہ کیا تو مجھ پر کام دیوتا کا وبال نازل ہو گا۔ مجھے بتاؤ کہ تم میری کیا مدد کر سکتی ہو۔ میں اسی لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں آئی ہوں۔"

سیندھیا خاموش ہو کر جیسے گہری سوچ میں ڈوب گئی ہو پھر اس نے جوگن سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مایا دیوی! تم یہاں کے سارے حالات سے واقف ہو۔ نہ صرف یہ کہ اس آدمی کی زندگی یہاں خطرے میں ہے تم بھی یہاں محفوظ نہیں ہو۔ اگر تمہیں آشرم کے آس پاس کسی پجاری یا نرتکی نے دیکھ لیا تو فوراً مہادیو جی کو خبر ہو جائے گی اور پھر تمہارے ساتھ اس مرد کو بھی کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں ڈال دیا جائے گا۔"

جوگن نے کہا۔

”سیندھیا! میں یہ ساری باتیں جانتی ہوں۔ تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ میں اس مرد کی بیوی کو یہاں سے کیسے نکال سکتی ہوں۔ باقی میں سب سنبھال لوں گی۔“

سیندھیا اس دوران گہری سوچ میں تھی۔ جوگن نے اپنی بات ختم کی تو وہ بولی۔

”کرم داد کی بیوی ساری رات مہادیو جی کے آشرم میں ان کے خاص کمرے میں رہتی ہے۔ دن کے وقت وہ پوتر تالاب پر خاص سکھیوں کے ہمراہ اشنان کرنے جاتی ہے۔ اس کے بعد اسے مندر کے ایک کمرے میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں وہ آرام کرتی ہے اور سارا دن وہیں آرام سے گزارتی ہے۔ اسے مندر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے اور جہاں تک میں نے دیکھا ہے اس کی بیوی خود بھی مندر سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتی۔“

جوگن مایا دیوی نے سوال کیا۔

”اس وقت مندر کے باہر کون پہرہ دے رہا ہوتا ہے؟ جب میں وہاں تھی تو دو سیاہ فام بن مانس پہرہ دیا کرتے تھے۔“

سیندھیا نے کہا۔

”مندر کے آس پاس بن مانسوں کو جانے کی اب اجازت نہیں ہے۔ آج کل رات کو مندر کے باہر دہشٹ سپیرے کے خاص آدمی پہرہ دیتے ہیں اور ان کے پاس رائفلیں اور سٹین گنیں ہوتی ہیں۔ اپنی داسیوں اور نرتکیوں کی حفاظت کے واسطے اب مہادیو جی نے شہر سے رائفلیں اور سٹین گنیں منگوا کر اپنے خاص دہشٹ سپیرے کو دے رکھی ہیں، جس نے تربیت یافتہ سپیروں کو یہ اسلحہ دے کر گارڈ ڈیوٹی پر لگایا ہوا ہے۔ یہ پہرہ دار سپیرے فوجی وردیوں میں ہوتے ہیں اور انہیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شہر کا مرد مندر میں داخل ہونے یا کوئی نرتکی مندر سے فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں۔“

مجھے یہ سن کر ایک اطمینان ضرور ہو گیا کہ جہاں میری بیوی دن کے وقت ہوتی ہے اس کے گرد جادوگروں یا سپیروں کا پہرہ نہیں ہوتا بلکہ نیم فوجی سپیرے تعینات ہوتے ہیں جن کا مقابلہ میں کر سکتا تھا۔ میں پاک آرمی کا تربیت یافتہ سابق کمانڈو تھا۔ یہ رائفل بردار سپیرے میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے خیال آ گیا کہ اس نرتکی سیندھیا نے بتایا تھا کہ میری بیوی صبح صبح شیطان صفت مہادیو کے آشرم سے نکل کر تالاب پر اشنان کرنے جاتی ہے۔ اس وقت بھی جمیلہ کو وہاں سے نکالا جا سکتا تھا۔ میں نے سیندھیا سے پوچھا۔

”صبح صبح جب میری بیوی تالاب پر نہانے جاتی ہے تو اس کے ساتھ صرف عورتیں ہی ہوتی ہیں؟“

اس نے کہا۔

”آشرم کی چھ نرتکیاں تمہاری بیوی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ لیکن دو سپیرے رائفلیں لیے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر تمہاری بیوی پر منتروں کا اثر کم پڑ گیا اور اسے اپنا ماضی یاد آ گیا تو وہ فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکے۔“

میں نے دل میں مہادیو کو گالی دی اور طے کر لیا کہ میں اس شیطان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ جو دوسروں کی بہو بیٹیوں کی عزتوں سے کھیلتا ہے، چاہے وہ عورتیں کسی دوسرے مذہب ہی کی کیوں نہ ہوں۔ دہشٹ سپیرا بھی میرا ٹارگٹ تھا۔ میں اسے بھی یہاں مار کر نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے سیندھیا سے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ دن کے وقت مندر پر حملہ کر کے جمیلہ کو نکالنے سے منہ اندھیرے جب وہ تالاب پر اشنان کرنے جائے تو اس وقت اسے نکالنے کی کوشش کرنا زیادہ مناسب ہو گا۔“

جوگن مایا دیوی نے میری تجویز کی حمایت کی۔ مگر سیندھیا کہنے لگی۔

”اگرچہ منہ اندھیرے کے سمے تمہاری بیوی کی حفاظت پر صرف دو رائفلوں والے سپیرے ہی ہوتے ہیں لیکن ان کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کونسی جھاڑی میں چھپے ہوئے ہیں۔ رات کے پچھلے پہر کے اندھیرے میں تم انہیں تلاش نہیں کر سکو گے۔ اگر انہوں نے تمہیں تالاب کی طرف بڑھتے دیکھ لیا تو وہ تم پر گولیاں چلانی شروع کر دیں گے اور تمہارا زندہ بچنا مشکل ہو جائے گا۔“

سیندھیا اور جوگن ان دونوں میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں پاک آرمی کا ٹرینڈ

سابق کمانڈو ہوں اور میرے لیے ان سپیروں کو تلاش کرنا مشکل بات نہیں ہے بلکہ میں سب سے پہلے انہی کو تلاش کر کے ٹھکانے لگاؤں گا۔ میں نے کہا۔

"سیندھیا جی! تم یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ منہ اندھیرے اپنی بیوی کو اٹھا کر لے جانا زیادہ بہتر ہو گا۔ دن کی روشنی میں ہم مہادیو کے مندر سے اسے نہیں نکال سکیں گے جبکہ مندر کے گرد رائفل بردار سپیروں کی پوری پلٹن پہرہ دے رہی ہو گی۔"

جوگن کہنے لگی۔

"کرم داد ٹھیک کہتا ہے ہم منہ اندھیرے اپنا کام شروع کریں گے۔ تم ہمیں صرف یہ پتہ کر کے بتا دو کہ منہ اندھیرے اشنان کرنے کرم داد کی بیوی آشرم سے ٹھیک کس وقت نکلتی ہے۔ ہمارے زمانے میں تو ہم پو پھٹے آشرم سے اشنان کرنے نکل جاتی تھیں۔"

سندھیا کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے کہ مہادیو جی کے خاص آشرم سے ان کی پسندیدہ نرتکی رات بسر کرنے کے بعد پو پھٹنے سے کچھ دیر پہلے نکلتی ہے۔ کیونکہ اشنان کے بعد اسے سورج نکلنے سے پہلے پہلے مندر میں جا کر ھنومان جی کی آرتی بھی اتارنی ہوتی ہے۔ ویسے میں کل سارا پتہ کر کے تمہیں بتا دوں گی۔"

سیندھیا ہمارے ساتھ بے حد تعاون کر رہی تھی۔ حالانکہ اس کام میں اس کی جان کو بھی خطرہ تھا۔ وہ جوگن مایا دیوی کی بڑی وفادار سہیلی تھی۔ اس کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو شاید یہ خطرہ مول لینے پر تیار نہ ہوتی۔ بلکہ ممکن تھا کہ مہادیو کو جا کر بتا دیتی کہ شہر سے اس کی پسندیدہ نرتکی کا آدمی مایا دیوی کے ساتھ اپنی بیوی کو اٹھا لے جانے کے واسطے آیا ہوا ہے۔

جب ساری بات طے ہو گئی تو جوگن نے سیندھیا سے کہا۔

"اب ہمیں سوم رس پلاؤ۔"

سیندھیا مسکراتی ہوئی اٹھی اور یہ کہہ کر کٹیا سے باہر نکل گئی کہ ابھی لاتی ہوں۔ سوم رس کے نام سے میں کانپ گیا تھا۔ میں نے جوگن سے کہا۔

"دیوی! کل سوم رس پی کر میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں۔ اس لیے آج میں سوم رس نہیں پیئوں گا۔"

وہ ہنس پڑی بولی۔

"مورکھ ہو جو دیوتاؤں کے سوم رس کو ٹھکرا رہے ہو۔"

میں نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"دیوی! یہ میری مجبوری ہے۔ اگر میری طبیعت سوم رس پی کر زیادہ خراب ہو گئی تو میں جس مہم پر آیا ہوا ہوں اسے پورا نہ کر سکوں گا۔"

جوگن مایا دیوی میری طرف دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اس پر گانجے کا نشہ بھی چڑھا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔ اچھا آج تم سوم رس نہیں پیئو گے۔"

سیندھا سوم رس کی مٹکی لے کر کٹیا میں آ گئی۔ کہنے لگی۔

"میں سوم رس کی مٹکی رات کے وقت سیتا پھل کے درخت کے نیچے رکھ جاتی ہوں۔"

وہ کونے میں سے مٹی کے تین چھوٹے پیالے اٹھا کر لے آئی اور ہمارے سامنے رکھنے لگی۔ جوگن مایا دیوی نے کہا۔

"میرا مرد کرم داد آج رات سوم رس نہیں پئے گا۔ آج رات صرف ہم دونوں سوم رس پی کر کام دیوتا کی پوجا کریں گی۔"

سیندھیا نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور پھر میرا پیالہ اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ میں نے دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس مشروب سے میری جان بچ گئی تھی۔ کٹیا میں پیتل کا دیا جل رہا تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں ہمارے چہرے اور کٹیا کے در و دیوار دھندلے دھندلے لگ رہے تھے۔ ہم ہرن کی چھال پر بیٹھے تھے۔ کونے میں سیندھیا کا بستر لگا ہوا تھا۔ بستر کیا تھا ایک دری بچھی تھی۔ ایک میلا سرہانہ پڑا تھا۔ میں ذرا پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں سوم رس پینے لگیں۔ سیندھیا جوگن سے کہنے لگی۔

"آج میں کتنی سوبھاگیہ محسوس کر رہی ہوں کہ میری پیاری اور میری پرانی سکھی سہیلی مایا دیوی اتنی مدت کے بعد میری کٹیا میں موجود ہے۔ یاد ہے جب تم آشرم میں ہوتی تھیں تو ہم کسی کسی رات کو اس کٹیا میں آکر کتنے مزے کرتے تھے۔"

میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نے ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں عیاش قسم کے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ بعض عورتیں بھی ایک دوسری سے مزے کرتی ہیں۔ یہ عورتیں نارمل اور شریف عورتیں نہیں ہوتیں بلکہ جنسی طور پر بگڑی ہوئی اور بے راہ عورتیں ہوتی ہیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اگر سیندھیا کا مطلب اسی قسم کے مزے سے ہے تو وہ کیا کرتی ہیں۔ میں یہاں زیادہ تفصیل سے ان کے مزے کی حرکتیں بیان نہیں کروں گا لیکن ان کی کچھ ایسی حرکتیں ضرور بیان کروں گا جو خدا کے عذاب کو دعوت دیتی ہیں۔ جن شہروں اور بستیوں میں عورتیں عورتوں سے اور مرد مردوں سے ایسی گھناؤنی اور گناہ آلود حرکتیں کرنے کے عادی تھے۔ ان بستیوں پر اللہ تعالیٰ کا ایسا عذاب نازل ہوا کہ ان بستیوں کے نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ جو لوگ میری داستان سن رہے ہیں یا پڑھ رہے ہیں ان کو بھی نصیحت کروں گا کہ وہ عبرت حاصل کریں اور صرف اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں تاکہ وہ فلاح پائیں اور دین و دنیا اور آخرت میں بھی سرخرو ہوں۔ مجھے خیال آیا کہ میں کٹیا سے باہر چلا جاتا ہوں۔ جب میں اٹھ کر باہر جانے لگا تو جوگن نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"کرم داد! تم باہر نہیں جاؤ گے' یہ میرا حکم ہے۔ تم نے سوم رس نہیں پیا' میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا۔ مگر اب کٹیا میں ہی رہو گے اور یہ دیکھو گے کہ دو عورتیں کام دیوتا کی کس طرح پوجا کرتی ہیں۔"

میں بے بس سا ہو کر وہیں بیٹھا رہا۔

وہ دونوں سوم رس پی رہی تھیں اور باتیں کیے جا رہی تھیں۔ وہ اپنے دھرم کے مطابق آکاش کی ان اپسراؤں کی باتیں کرنے لگیں جو ایک دوسری سے مزے کرتی ہیں۔ جب انہوں نے کافی سوم رس پی لیا اور انہیں خوب نشہ ہوگیا تو وہ ایک دوسرنے کو پیار کرنے لگیں۔ میں کونے میں دبک کر بیٹھا یہ گناہ آلود منظر اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کسی وقت میں آنکھیں بند کر لیتا۔ خدا جانے جوگن کو اس نشے کی حالت میں بھی کیسے پتہ چل جاتا کہ میں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اس نے کڑک کر کہا۔

"مورکھ! آنکھیں بند نہ کرو' یہ میرا حکم ہے۔ کام دیوتا حاضر ہوگئے ہیں۔ انہوں نے تمہیں آنکھیں بند کیے ہوئے دیکھ لیا تو تم کو بھسم کر دیں گے۔"

"مجھے اس کے کام دیوتا کی کوئی پروا نہیں تھی لیکن اس کے حکم کے آگے میں مجبور تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

اس وقت دونوں عورتیں بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں اور جھوم رہی تھیں۔ پھر دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں اور انہوں نے اپنے آپ کو لباس سے آزاد کر دیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خدا جانے کس زبان میں اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ وہ ایک دائرے میں اشلوک پڑھتے ہوئے گھومنے لگیں۔ پھر بیٹھ گئیں اور ایک دوسری کے سر سے سر جوڑ کر دائیں بائیں جھولنے لگیں۔ اشلوک وہ برابر پڑھتی جا رہی تھیں۔ اب اشلوکوں میں کام دیوتا کا نام بار بار آتا تھا۔ کچھ دیر وہ اسی طرح بیٹھی جھولتی رہیں۔ پھر سب سے پہلے سیندھیا اٹھی جوگن بال پھیلائے بیٹھی جھومتی رہی۔ سیندھیا نے اپنا ہاتھ جوگن کے سر پر رکھ کر بلند آواز میں کہا۔

"کام دیوتا! کام دیوتا! ہماری شردھا نجلی سویکار کر۔ ہماری شردھا نجلی سویکار کر۔ کام دیوتا! اے کام دیوتا!"

جوگن بھی جے ہو کام دیوتا کی کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر ناچنے لگیں۔ اس قسم کا ناچ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کبھی وہ ناچتے ناچتے بیٹھ جاتیں۔ پھر اٹھ کر چھوٹے سے دائرے میں گھوم جاتیں۔ اس کے بعد ایک دوسرے کی پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر گھومنے لگ جاتیں۔ گھومتے گھومتے بانہوں میں بانہیں ڈال کر سر پیچھے کو ڈھلکا لیتیں اور جے ہو کام دیوتا کی کا نعرہ لگاتیں۔ میں چشم حیرت سے یہ واہیات منظر دیکھ رہا تھا۔ واہیات اس لیے کہ دونوں کے جسم پر کوئی لباس نہیں

تھا۔

جب دونوں ناچتے ناچتے تھک گئیں تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر بستر پر گر پڑیں۔ اس کے بعد جو حرکتیں انہوں نے کیں انہیں بیان کرنے کو میری زبان زیب نہیں دیتی اور میں بیان بھی نہیں کروں گا۔ یہ وہ حرکتیں تھیں جو خدا کے عذاب کو دعوت دیتی ہیں۔ میرے دل نے کہا کہ کرم داد ایک نہ ایک دن اس آلوپ نگر پر ضرور خدا کا عذاب نازل ہو گا اور یہ ساری کھنڈر عمارتیں اور گناہ کے آشرم تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں گے۔

میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ لیکن وہ دونوں عورتیں گہری نیند سو چکی تھیں اور خراٹے لے رہی تھیں۔ میں اٹھ کر کٹیا سے باہر آ گیا۔ باہر درختوں کے درمیان اوپر آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ اس کھنڈروں کے شہر پر موت کا سکوت طاری تھا۔ اس وقت مجھے اپنی بیوی کا خیال آ گیا کہ وہ اس بدمعاش شیطان مہا دیو کے آشرم میں ہو گی۔ خدا جانے اس کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہو گا۔ سب سے بڑی پریشانی مجھے اس بات کی تھی کہ جمیلہ پر پلیدوں کے منتروں کے جادو ٹونے کا اثر ہو چکا تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ جب میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو کہیں وہ شور نہ مچا دے اور مندر میں موجود دوسرے رائفل بردار پلیدوں کو اس طرف متوجہ نہ کر دے۔ میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ صرف کمانڈو چاقو تھا یا میرا تجربہ تھا اور میری تربیت کی صلاحیتیں میرے ساتھ تھیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے پہچاننے ہی سے انکار کر دے۔ ظاہر تھا کہ اگر وہ منتروں کے زیر اثر ہے تو مجھے کہاں پہچانے لگی۔ ایک ہلکی سی امید ضروری تھی کہ شاید وہ مجھے پہچان لے۔

میں کٹیا کے باہر سنسان رات کے سناٹے اور تاریکی میں سیندھیا کی کٹیا کے باہر ایک طرف ہو کر بیٹھا ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ مجھے سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ جبلی طور پر میں ڈر کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ سانپ میرے قریب نہیں آئے گا۔ اس کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ تاروں کی روشنی بڑی مدھم تھی۔ میں نے ایک سانپ کو دیکھا جو مجھ سے چھ سات قدم دور پھن پھیلائے بیٹھا میری طرف گھور رہا تھا۔ میں پیچھے ہٹنے کی بجائے

اس کی طرف بڑھا تو وہ پھن سکیڑ کر تیزی سے درختوں کی طرف گم ہو گیا۔ تازہ کھلی ہوا میں مجھے بڑا سکون ملا تھا۔ میں بیٹھنے ہی لگا تھا کہ ایک خوفناک آواز نے مجھے وہیں ساکت کر دیا۔ یہ آواز کسی خونخوار جانور کی معلوم ہوتی تھی۔ شیر یا چیتے کی دھاڑ نہیں تھی۔ میں اس طرف دیکھنے لگا جس طرف سے آواز آئی تھی۔ دھندلے اندھیرے میں مجھے درختوں کی طرف سے ایک اونچا لمبا بن مانس اپنی طرف دوڑتا ہوا آتا نظر آیا۔ میں جلدی سے کٹیا میں گھس گیا اور میں نے اپنا کمانڈو چاقو نکال لیا۔ میں جانتا تھا کہ اگر یہ بن مانس اندر آ گیا تو مجھ اکیلے کو ہی اس کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ دونوں عورتیں بے سدھ ہو کر پڑی تھیں۔

کٹیا کے باہر بن مانس کی خوفناک آوازیں آنے لگیں۔ خدا جانے کیوں وہ کٹیا کے اندر آتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے تھوڑا سا ٹاٹ ہٹا کر دیکھا' تاروں کی روشنی میں بن مانس کٹیا سے چند قدم کے فاصلے پر حلق سے عجیب ڈراؤنی آوازیں نکالتے ہوئے زور زور سے اپنا سینہ ڈھول کی طرح پیٹ رہا تھا۔ میں خوف زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کچھ دیر تک بن مانس اچھلتا کودتا رہا پھر اپنے آپ واپس مڑ کر چبوترے سے چھلانگ لگا کر اترا اور درختوں کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ محض جوگن مایا دیوی کی وجہ سے اندر نہیں آ رہا تھا۔ رات گزر گئی۔

میں کٹیا میں ایک طرف پڑ کر سو گیا تھا۔ آنکھ کھلی تو جوگن مایا دیوی ہنومان کی مورتی کے آگے بیٹھی بھجن کیرتن کر رہی تھی۔ کٹیا کا پردہ اٹھا ہوا تھا۔ اندر دھوپ آ رہی تھی۔ جوگن کے بال گیلے تھے۔ اس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ کسی تالاب سے اشنان کر کے آئی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سیندھیا وہاں پر نہیں تھی۔ جوگن بھجن کیرتن میں مگن رہی۔ جب اس نے بھجن کیرتن ختم کیا تو پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

”مورکھ! میں ابھی تمہیں کچھ کھلاتی پلاتی ہوں۔“

میں نے پوچھا۔

”تمہاری سکھی سہیلی سیندھیا کہاں ہے؟“

جوگن نے آرتی والی تھالی مورتی کے آگے رکھ کر ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ اٹھ کر

ساڑھی درست کرتے ہوئے بولی۔

"وہ مہادیو جی کے آشرم کی طرف چلی گئی تھی۔ شام کو آئے گی اور یہ بتائے گی کہ تمہاری پتنی منہ اندھیرے کس وقت تالاب پر اشنان کرنے جاتی ہے اور اس کے ساتھ کون کون ہوتا ہے۔ تم بیٹھو میں کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔ تم باہر مت نکلنا۔"

وہ کٹیا سے باہر نکل گئی۔ واپس آئی تو اس کی جھولی میں وہی کیلے اور شریفے تھے جو ہم نے پہلے کھانے تھے۔ اس نے بھی میرے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ کہنے لگی۔

"رات کو ہم دونوں نے کام دیوتا کی جو پوجا کی تھی اس سے کام دیوتا بڑے خوش ہوئے ہیں۔ اب وہ ہماری بڑھ چڑھ کر مدد کریں گے۔"

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا۔

"دیوی! ابھی تک تو تمہارے کام دیوتا نے ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ تمہاری سہیلی سیندھیا ہی ہماری مدد کر رہی ہے۔"

جوگن بولی۔

"تم مورکھ ہو۔ نہیں جانتے' کچھ نہیں جانتے۔ دیوتا لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں مدد نہیں کیا کرتے۔ وہ ہماری اس وقت مدد کریں گے جب ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے اور سیندھیا بھی ہماری مدد نہیں کر سکے گی۔"

اس کے بعد وہ کام دیوتا اور دوسرے دیوتاؤں کی غیبی طاقت کی باتیں کرنے لگی۔ میرے لیے یہ بیکار باتیں تھیں۔ میں اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتا جا رہا تھا۔ مجھے اس کی باتوں' اس کے دیوتاؤں کے کارناموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں اپنی بیوی جمیلہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے مجھے بالکل نہ پہچانا اور میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور شور مچا دیا تو مجھے کیا کرنا ہو گا۔ سارا دن ہم نے کٹیا کے اندر ہی گزار دیا۔ صرف ایک بار جوگن کٹیا سے باہر گئی تھی اور جلدی سے واپس آ گئی۔ جب دن غروب ہو گیا اور کٹیا کے باہر درختوں کے نیچے شام کا اندھیرا اترنے لگا تو جوگن نے کٹیا کا پردہ اٹھا دیا۔ کہنے لگی۔

"سیندھیا نے کہا تھا کہ وہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد آئے گی۔ راستے میں اگر کسی سپیرے فوجی نے اسے پکڑ نہ لیا تو وہ یہاں ضرور پہنچ جائے گی۔"

میں نے کہا۔

"اور اگر اسے تمہارے سپیروں نے پکڑ لیا تو ہمیں کیا کرنا ہو گا؟ میرا خیال ہے پھر ہم اکیلے ہی منہ اندھیرے تالاب پر پہنچ جائیں گے۔"

جوگن نے کہا۔

"سیندھیا بڑی ہوشیار نرتکی ہے۔ وہ پہرے دار سپیروں کو جل دے کر یہاں پہنچ جائے گی۔ اسے جوان سپیروں کو رجھانا بھی آتا ہے۔"

اور جوگن مسکراتی رہی۔

جب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تو وہ کٹیا سے باہر چلی گئی۔ میں اندر ہی بیٹھا رہا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ گزر جانے کے بعد وہ اندر آئی اور کہنے لگی۔

"شاید سیندھیا آ گئی ہے۔ میں نے اس کے قدموں کی آواز سنی ہے۔"

چند سیکنڈ کے بعد سیندھیا آ گئی۔ وہ میرے اور جوگن کے گلے لگ کر ملی۔ اس کے جسم میں سے ایسی بو آ رہی تھی جیسے وہ گیدڑوں کے بھٹ سے نکل کر آ رہی ہو۔ کہنے لگی۔

"میں سارا کچھ معلوم کر کے آئی ہوں۔"

پھر اس نے بتایا کہ میری بیوی رات کے پچھلے پہر مہادیو کے آشرم سے سات نرتکیوں کے ساتھ پوتر تالاب پر اشنان کرنے نکلے گی اور دو رائفلوں والے سپیرے اس سے پچاس قدموں کے فاصلے پر تالاب کے قریب کسی جھاڑی میں مورچہ بنا کر بیٹھے ہوں گے۔ اس نے جوگن مایا کو ان سپیروں کے نام بھی بتائے۔ جوگن نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"کرم داد! تیار ہو جاؤ۔ تمہاری مردانہ دلیری آزمانے کا وقت آن پہنچا ہے۔ میں تمہارے ساتھ صرف پوتر تالاب تک ہی جاؤں گی اور تمہیں وہاں پہنچا کر فوراً واپس اسی کٹیا میں آ جاؤں گی۔ باقی سارا کام تمہیں خود ہی کرنا ہو گا۔ اگر تم اپنی بیوی کو وہاں سے

نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو سیدھے کٹیا میں آنا میں اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔ "

مجھے اندیشہ تھا کہ مسلح سپیروں کو قابو کرتے وقت اگر ان میں سے کسی کی رائفل چل گئی تو فائر کا دھماکہ ہو گا۔ یا اگر میری بیوی یا اس کے ساتھ آئی ہوئی عورتوں نے مجھے دیکھ کر شور مچا دیا تو وہاں ہنگامہ مچ جائے گا اور مندر کے ارد گرد پہرے پر موجودہ دوسرے مسلح سپیرے بھی وہاں آ جائیں گے۔ جب میں نے اس خدشے کا اظہار کیا تو جوگن مایا دیوی سوچ میں پڑ گئی۔ سیندھیا بھی غور کرنے لگی۔ جوگن نے کہا۔

"اگر وہاں شور مچ گیا تو پھر تمہارا وہاں سے نکلنا اور میرا اس کٹیا میں ٹھہرنا ناممکن ہو جائے گا۔ "

سیندھیا کہنے لگی۔

"اس کا ایک ہی علاج ہے۔ "

"وہ کیا؟" جوگن مایا دیوی نے پوچھا۔

سیندھیا نے کہا۔

"وہ یہ ہے کہ رات کے پچھلے پہر میں بھی سات سکھیوں کے ساتھ جاؤں۔ جب کرم داد کی بیوی اشنان کرنے لگے تو میں عورتوں کو باتوں میں لگا کر دوسری طرف لے جاؤں لیکن جھاڑیوں میں مورچہ لگا کر بیٹھے ہوئے سپیروں سے کرم داد کو ہی نمٹنا ہو گا۔ کیونکہ اگر اس کی بیوی نے اس کے پہچاننے اور اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو وہ ضرور شور مچا دے گی اور اس کے شور کی آواز سن کر سپیرے ہوا میں فائرنگ شروع کر دیں گے اور فائر کی آوازیں سن کر مندر کے سپیرے بھی اس طرف دوڑ پڑیں گے۔

میں نے کہا۔

"میں انہیں سنبھال لوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ تم صرف اتنا کرو کہ میری بیوی کے ساتھ جو عورتیں جائیں گی کسی طرح انہیں تالاب سے کچھ فاصلے پر لے جاؤ جہاں سے وہ مجھے تالاب پر آتے نہ دیکھ سکیں۔ "

سیندھیا نے کہا۔

"یہ میں کر لوں گی۔ "

جوگن مایا دیوی نے میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کرم دادا! تم نہتے ہو گے تمہارے پاس کوئی بندوق وغیرہ نہیں ہو گی۔ تم رائفلوں والے دو آدمیوں کو کیسے قابو کر سکو گے؟"

میں نے کہا۔

"دیوی! میں کوشش کروں گا۔ مجھے یہ کوشش کرنی ہی ہو گی اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ "

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ " جوگن نے آہستہ سے کہا۔

پھر سیندھیا سے مخاطب ہو کر بولی۔

"تم نرتکیوں کو باتوں میں لگا کر تالاب سے دور کیسے لے جاؤ گی؟"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چاہے کچھ ہو جائے تمہاری خاطر مجھے یہ کام تو کرنا ہی ہو گا۔ ہاں اگر وہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو میں وہاں سے غائب ہو جاؤں گی۔ "

باتیں کرتے کرتے شام جب زیادہ گہری ہو گئی اور رات کی تاریک پھیلنے لگی تو سیندھیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی۔

"اب میں جاتی ہوں۔ "

پھر اس نے جوگن مایا دیوی سے کہا۔

"مایا! تم کرم داد کو تالاب کا خفیہ راستہ بتا دینا۔ "

وہ بولی۔

"میں اسے تالاب تک چھوڑنے اس کے ساتھ جاؤں گی۔ میں اسے وہاں چھوڑنے کے بعد واپس آ جاؤں گی۔ "

"ہاں۔ " سیندھیا نے کہا۔ "تمہارا وہاں زیادہ دیر رہنا ٹھیک نہیں ہو گا۔ کسی نرتکی کی

تم پر نگاہ پڑ گئی تو مہادیو جی تمہاری تلاش میں تمام آدمی دوڑا دیں گے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔"

وہ چلی گئی تو جوگن میرے پاس ہی چوکی پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"اگر بھگوان نہ کرے وہاں تالاب پر ہاہا کار مچ گئی تو مجھے اس کی آوازیں آ جائیں گی۔ پھر میں اس کٹیا میں نہیں ٹھہر سکوں گی۔"

میں نے پوچھا۔

"تو پھر تم کہاں ملو گی؟ میرا مطلب ہے اگر میں گڑبڑ کے بعد بھی اپنی بیوی کو نکال لانے میں کامیاب ہو گیا تو تم مجھے کہاں ملو گی؟ کیونکہ تمہاری مدد کے بغیر میں اس خونی جنگل سے شاید باہر نہ نکل سکوں۔"

وہ کہنے لگی۔

"یہاں سامنے والے درختوں کے پیچھے ایک کنڈ ہے۔ تمہیں یاد ہے آتی دفعہ ہم نے وہاں پانی پیا تھا۔"

مجھے یاد آ گیا یہ ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں پانی تھا۔ آتی دفعہ ہم نے وہاں پانی پیا تھا۔ اس کی نشانی بھی مجھے یاد آ گئی۔ وہاں دو درخت ایک دوسرے کے ساتھ مل کر تال کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

"ہاں مجھے وہ کنڈ یاد ہے۔"

وہ بولی۔

"اگر وہاں شور مچ گیا اور تم بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو میں تمہیں اسی کنڈ کے پاس ملوں گی۔ میں وہاں جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ہوں گی مگر تمہیں دیکھ کر باہر نکل آؤں گی۔"

ہم باتیں کرتے رہے۔ میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ کر شروع کیے جانے والے کمانڈو ایکشن کے بارے میں غور کرتا رہا۔ یہ بالکل ایک طرح سے کمانڈو آپریشن ہی تھا۔ مجھے کمانڈو بن کر دونوں مسلح سپیروں کو اس طرح قابو کرنا تھا کہ کسی ایک کو دوسرے کے انجام

کی خبر نہ ہو۔ مجھے اس کام کی تربیت ملی ہوئی تھی اور یہ کام مجھے کوئی مشکل نظر نہیں آ رہا تھا۔ مشکل مرحلہ صرف وہ تھا جب مجھے اپنی بیوی جمیلہ کے سامنے جا کر اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہنا تھا۔ دل کہتا تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان جائے گی اور فوراً میرے ساتھ بھاگ کھڑی ہو گی۔

جب رات گہری ہونے لگی تو جوگن مایا دیوی انگڑائی لیتی ہوئی اٹھی اور سیندھیا کے بستر کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"ابھی رات کے پچھلے پہر میں تین گھنٹے باقی ہیں۔ آ جاؤ۔ میرے ساتھ لیٹ کر تم بھی کچھ دیر آرام کرو۔"

میں ڈر گیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"دیوی! مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی۔"

اس نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ میرا حکم ہے۔"

میرا جی چاہا کہ اس عورت کا سر پھوڑ دوں مگر میں بے بس تھا۔ بیوی کی تلاش کی مہم اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس وقت مجھے اس جوگن کی اشد ضرورت تھی۔ میں اس کے آگے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی اس نے یہ شرط عائد کر رکھی تھی کہ اگر میں اس کا کوئی ایک بھی حکم نہ مانا تو وہ میری مدد نہیں کرے گی۔ میری راہنمائی نہیں کرے گی اور جہاں جیسی حالت میں ہو گی وہاں سے واپس چلی جائے گی۔ عجیب وحشی اور خوفناک قسم کی عورت تھی یہ جوگن----- آج آپ کو اپنی داستان سناتے ہوئے جب اس عورت کا تصور کرتا ہوں تو یقین کریں میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں اسی طرح بیٹھا رہا۔ جوگن بستر پر لیٹ چکی تھی۔ میری طرف سر اٹھا کر دیکھا اور غصیلی آواز میں بولی۔

"میرے پاس آؤ۔"

میں جیسے کسی جادو کے اثر سے اٹھا اور اس بھیانک عورت کے پاس چلا گیا۔

مجھے واقعی نیند نہیں آ رہی تھی۔

مگر جوگن میرے گلے میں بانہیں ڈال کر چند لمحوں کے بعد ہی گہری نیند سو گئی اور بن مانس کی طرح خراٹے لینے شروع کر دیے۔ میں نے پہلے تو اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ لیکن اس طرح بہت جلد میری گردن تھک گئی۔ پھر میں نے انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو جوگن کی بانہوں کے شکنجے سے نکالا اور ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا میں اس کمانڈو ایکشن میں کامیاب ہو سکوں گا؟ میں نے خدا سے بڑی دعائیں مانگیں۔ دعائیں مانگنے سے میرے اندر اعتماد پیدا ہو گیا۔ وقت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کتنی رات گزر گئی ہے اور رات کا پچھلا پہر کس وقت ہو گا۔ جوگن کو مجھے ہی اٹھانا تھا۔ وہ تو گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی اور کٹیا اس کے بن مانس والے خراٹوں سے گونج رہی تھی۔ میں آہستہ سے اٹھ کر کٹیا سے باہر آ گیا۔ آسمان پر تارے کھلے ہوئے تھے اور بھڑک بھڑک کر چمک رہے تھے۔ کھیتیاں یعنی سات ستاروں کی ٹولی ابھی آسمان کے وسط میں تھی۔ اتنا مجھے بچپن ہی سے معلوم تھا کہ جب رات کا پچھلا پہر ہوتا ہے تو یہ سات ستاروں کی ٹولی آسمان پر مغربی افق کی طرف جھک جاتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی رات کے پچھلے پہر میں دو ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ میں کٹیا میں آ کر بیٹھ گیا۔

طاق میں پیتل کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ اس کی لو مدہم ہونے لگی تھی۔ وہیں بیٹھا خیالات میں الجھا رہا۔ مجھے پاک آرمی سے ریلیز ہوئے پانچ ساڑھے پانچ سال گزر گئے تھے۔ اتنے

عرصے کے بعد میں ایک بار پھر کمانڈو مہم پر روانہ ہونے والا تھا۔ میں ایک ایک کر کے کمانڈو ٹریننگ کے سارے سبق یاد کر رہا تھا۔ فوج میں کمانڈو ٹریننگ ایسی ہوتی ہے کہ اسے ایک کمانڈو ساری زندگی نہیں بھول سکتا' وہ آدمی کے جسم کا حصہ بن جاتی ہے۔ میں نے کمانڈو چاقو ہرن کی چھال کے نیچے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ میں نے چاقو نکال لیا۔ دیے کی دھیمی روشنی میں اسے کھول کر اس کے پھل کی دھار کو غور سے دیکھا۔ اس پر انگلی پھیری' دھار کافی تیز تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ چاقو مجھے دھوکا نہیں دے گا۔ میں نے جوگیوں والی دھوتی باندھ رکھی تھی۔ سر کے بالوں میں بھی جوگن نے راکھ مل دی تھی جو اب تک کافی جھڑ چکی تھی۔ میں کٹیا میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں اٹھ کر باہر جاتا اور آسمان پر سات ستاروں کی ٹولی کو دیکھ آتا۔ یہ سات ستارے جنہیں ہم پنجاب میں کھیتیاں کہتے ہیں آہستہ آہستہ آسمان کے مغربی افق کی طرف جا رہی تھیں۔ جب آخری بار میں اٹھ کر باہر گیا تو کھیتیاں کافی نیچے جا چکی تھیں۔ میں نے کٹیا میں آ کر جوگن کو جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اس طرح اٹھی جس طرح کوئی بن مانس ہڑبڑا کر اٹھتا ہے۔

"ٹائم ہو گیا کیا؟"

اس نے بالوں کا جوڑا باندھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے رات کا پچھلا پہر ہو گیا ہے۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر کٹیا کے باہر نکل گئی۔ میں ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر اسے دیکھنے لگا۔ جوگن آسمان کی طرف منہ کر کے ستاروں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ جلدی سے واپس آ گئی اور بولی۔

"وقت ہو گیا ہے۔ جلدی سے نکل چلو۔"

جوگن نے اپنی ساڑھی خوب اچھی طرح سے کس کر جسم کے گرد باندھی۔ اس کا پلو اپنے جسم پر اچھی طرح سے لپیٹ لیا۔ میں نے بھی دھوتی کو اچھی طرح سے اوپر کر کے کس کر باندھا۔ اس کے ڈھب میں کمانڈو چاقو چھپا کر رکھ لیا۔ جوگن نے پھونک مار کر دیا

بجھادیا۔ ترشول اس نے پہلے ہی تھام لیا تھا۔ ہم کٹیا سے باہر نکل آئے۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی کٹیا کے چبوترے سے نیچے اتر گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ چبوترے سے اتر کر اس نے سامنے کی طرف دیکھا۔ ستاروں سے روشن آسمان کے پس منظر میں کچھ فاصلے پر مہادیو کے آشرم کے میناروں کے خاکے نظر آرہے تھے۔ وہ میری طرف جھک کر بولی۔

"ہم بائیں جانب والے درختوں کے پیچھے سے ہو کر جائیں گے۔ خبردار اب کوئی آواز نہ نکالنا۔ کھانسی چھینک آئے تو روک لینا۔ میرے پیچھے پیچھے چلنا۔"

مجھے کمانڈو ٹریننگ کے دوران اپنے استاد کے سبق یاد آ گئے۔ اس کے علاوہ مجھے وہ کمانڈو آپریشن بھی یاد آ گئے جب ہماری کمانڈو پارٹی ٹارگٹ مارنے کے لیے رات کے اندھیرے میں دشمن کے مورچوں کے عقب میں جاتی تھی اور ہمارا پارٹی لیڈر ٹارگٹ کے قریب پہنچ کر کہا کرتا تھا۔

"خبردار! ہم ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں۔ کھانسی بند۔ چھینک بند۔ باتیں بند۔ سگریٹ بند۔ گھس مس بند۔۔۔۔"

میں اس وقت پورا کمانڈو بن گیا۔ میرے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں ٹارگٹ مار لوں گا اور اپنی بیوی کو ہر حالت میں شیطانوں' سانپوں اور مگرمچھوں اور بن مانسوں کی بستی سے نکال کر لے جاؤں گا۔

ہم پچھلی رات کی تاریکی میں بائیں جانب والے درختوں کی طرف چل پڑے۔ جوگن مایا دیوی یہاں زندگی کے کئی برس گزار چکی تھی۔ اسے اندھیرے میں بھی راستے کا پتہ چل رہا تھا۔ وہ بڑی محتاط ہو کر ایک ایک قدم آہستہ آہستہ اٹھا کر چل رہی تھی۔ درختوں کے نیچے زیادہ اندھیرا تھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر شیطان مہادیو کے آشرم کے ہندووانہ طرز کے نوکیلے مینار ستاروں کی روشنی میں نظر آرہے تھے مگر ان میں کسی جگہ روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ جوگن نے مجھے بتایا تھا کہ گمشدہ شہر کی کسی عمارت میں بجلی نہیں ہے۔ آشرم اور مندر میں پیتل کے چھوٹے بڑے چراغ جلائے جاتے ہیں۔ ہم درختوں کے درمیان جھک کر چل رہے تھے۔ ایک جگہ ہمارے سامنے گھنی جھاڑیوں کی دیوار آ گئی۔ جوگن رک گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بھی وہیں روک لیا۔ جھاڑیوں کی شاخیں ہٹا کر دوسری طرف دیکھا۔ پھر میرے کان کے پاس منہ لا کر بولی۔

"ہم تالاب پر پہنچ گئے ہیں۔ آؤ دیکھو۔"

اس نے جھاڑیوں کی شاخیں ہٹا کر مجھے تالاب دکھایا۔ ستاروں کی روشنی میں تالاب کا پانی مدھم دکھائی دے رہا تھا۔ چھوٹا سا تالاب تھا۔ سامنے کی جانب پتھر کی سیڑھیاں تالاب میں اتری ہوئی تھیں۔ پیچھے اونچے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ میں نے سر پیچھے کر لیا۔ میں کچھ کہنے لگا تو جوگن نے میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا اور کان کے پاس منہ لا کر سرگوشی کی۔

"بولو مت۔ کچھ دیر کے بعد اسی تالاب پر تمہاری بیوی سات عورتوں کے ساتھ اشنان کرنے آئے گی۔ سیندھیا ان عورتوں کو کسی بہانے باتوں میں لگا کر دوسری طرف لے جائے گی۔ تمہاری بیوی تالاب پر اکیلی ہوگی۔ اسے اپنے ساتھ لانا اب تمہارا کام ہے۔ میں جاتی ہوں اگر ہاہاکار مچ گئی تو میں تمہیں پرانے کنڈر پر ہی ملوں گی۔ سیندھیا کی کٹیا میں نہیں ہوں گی۔ بھگوان تمہاری سہائیت کرے۔"

اور جوگن مایا دیوی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ مسلح سپیرے کہاں اور کس طرف جھاڑیوں میں ہو سکتے ہیں۔ جس طرف سے میں اور جوگن آئے تھے اس طرف وہ لوگ نہیں تھے۔ سامنے والے درختوں کے نیچے جو جھاڑیاں تھیں وہاں ان کی موجودگی کا امکان ہو سکتا تھا۔ میں نے دھوتی کے ڈھب میں سے کمانڈو چاقو نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اگرچہ اس وقت میرا حلیہ سادھوؤں والا تھا۔ لیکن میں ایک دلیر اور جانباز کمانڈو بن چکا تھا۔ میں نے ہمہ تن گوش ہو کر فضا میں کچھ سننے کی کوشش کی۔ وہاں کوئی ایسی سرسراہٹ یا آہٹ سنائی نہ دی جس سے میں کچھ اندازہ لگا سکتا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ کچھ دیر میں میری بیوی تالاب پر نہانے آرہی تھی۔ اس کے آنے سے پہلے مجھے جھاڑیوں میں مورچہ بند مسلح سپیروں کو ختم کرنا تھا۔ ان کو ختم کیے بغیر اپنے مشن میں میری کامیابی مشکوک تھی۔

میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جھاڑیوں کے پیچھے جھک جھک کر دبے پاؤں چلتا تالاب کے دوسرے کنارے پر آگیا جہاں پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں اندھیرا تھا۔ آسمان پر پچھلی رات کا نور پھیلنے لگا تھا۔ میں جھک کر چھپ چھپ کر چلتا تالاب سے کوئی پچاس گز دور گنجان جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ مجھے یقین تھا کہ مسلح سپیرے ان جھاڑیوں میں ہی مورچہ بند ہوں گے۔ میں بڑے تجربہ کار کمانڈو کی طرح چیتے کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے پاؤں کی آہٹ تک پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ میں جھاڑیوں کے پہلو سے دور رہ کر آگے نکل گیا۔ آگے جا کر میں پیچھے سے جھاڑیوں کی طرف چلنے لگا۔ میں جھک کر چل رہا تھا۔ پانچ سات قدم چلا ہوں گا کہ مجھے فضا میں چرس کی بو محسوس ہوئی۔ میں فوراً زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔ مسلح سپیرے بہت قریب ہی تھے۔ وہ چرس پی رہے تھے۔ چرس کی بو ان کی جانب سے ہی آ رہی تھی۔ میں کہنیوں کے بل سامنے والی جھاڑیوں کی طرف رینگنے لگا۔ میں بڑا چوکس اور چوکنا ہو رہا تھا۔ رک رک کر آگے کی طرف رینگ رہا تھا۔ میں چرس کی بو کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ بو تیز ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بو سامنے والی جھاڑیوں میں سے آ رہی تھی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ مسلح سپیروں کا مورچہ ان جھاڑیوں میں ہی ہے تو میں نے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے کسی آڑ کی تلاش تھی۔ وہاں درخت دور دور تھے۔ مجھے اپنے بائیں جانب ایک چھوٹی جھاڑی دکھائی دی جو بڑی جھاڑیوں کے پاس ہی تھی۔ یہ میرے لیے بہترین آڑ ثابت ہو سکتی تھی۔ میں شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس پر کہنیوں کے بل رینگتا تیزی سے اس اکیلی جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔

مجھے ان دونوں سپیروں میں سے ایک کو اس جھاڑی کی طرف بلانا تھا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ اس وقت تیز ایکشن کی ضرورت تھی۔ میں نے جھاڑی کے نیچے ہاتھ پھیرا۔ وہاں مجھے کوئی پتھر یا روڑا نہ ملا تو میں نے جھاڑی کی ایک شاخ توڑ دی اور اسے سامنے والی جھاڑیوں کے اوپر زور سے پھینک دیا۔ اس سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کوئی سپیرا اس آواز پر جائزہ لینے مورچے سے باہر نہ آیا۔ میں نے دوسری موٹی سی شاخ توڑ کر پھینکی۔ اس کی آواز زیادہ تھی۔ مجھے جھاڑیوں میں دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے کمانڈو چاقو کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اس چیتے کی طرح بیٹھ گیا جو اپنے شکار پر جھپٹنے ہی والا ہو۔ ایک دو سیکنڈ کے بعد ایک انسانی سایہ جھاڑیوں میں سے باہر نکلا۔ میں پچھلے پہر کے دھندلکے میں اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ عجیب بات تھی اور یہ میری خوش قسمتی بھی تھی کہ یہ آدمی غیر مسلح تھا۔ اس کے ہاتھ میں یا کندھے پر کوئی رائفل وغیرہ نہیں تھی۔ یہ بے احتیاطی صرف چرس کے نشے کی وجہ سے ہی ہو سکتی تھی یا یہ بات تھی کہ انہیں پورا اعتماد تھا کہ اس جگہ کوئی غیر آدمی داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ انسان یقیناً گارڈ سپیرا ہی تھا۔ وہ جھاڑیوں پر جھک کر غور سے دیکھ رہا تھا کہ ابھی ابھی جو آواز آئی تھی وہ کسی بندر کی تھی یا کوئی اور آواز تھی۔

میں پوری گھات لگا کر ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ آدمی جھاڑیوں پر ہاتھ مارتا اس اکیلی جھاڑی کی طرف آ رہا تھا جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا بجلی کی چمک ایسی تیزی سے کرنا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔ جیسے ہی وہ میری جھاڑی کے قریب سے گزر کر ایک قدم آگے بڑھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ میرا سیدھا ہاتھ چھلانگ لگاتے ہی اس کی گردن کی پشت پر پڑا۔ یہ اس قدر زوردار ہاتھ تھا کہ وہ آدمی یا سپیرا کوئی آواز نکالے بغیر آگے کو گرا۔ آگے میرا چاقو تھا جسے میں نے اس کے حلق پر پوری طاقت اور پوری برق رفتاری سے پھیرا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب اس کی شہ رگ سے خون کا فوارہ چھوٹے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ خون تو مجھے نظر نہیں آیا لیکن اس کے نرخرے کی خرڑ خرڑ کی آواز آنے لگی۔ میں نے اس کی آدھی کٹی ہوئی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ اتنے میں جھاڑیوں کے اندر سے دوسرے مسلح سپیرے نے اپنے ساتھی کو آواز دے کر بلایا۔ جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ خود جھاڑیوں سے باہر نکل آیا۔ اس دوران میں جھاڑیوں کی اوٹ میں پوزیشن بنا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

میں نے غور سے دیکھا۔ دوسرے سپیرے کے کندھے سے رائفل نہیں بلکہ سٹین گن سلنگ کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ اگر سٹین گن اس کے ہاتھ میں ہوتی تو مجھے دوسری

حکمت عملی اختیار کرنی پڑتی۔ کیونکہ سٹین گن ہاتھ میں ہونے کی صورت میں اس کی انگلی ٹرینگر پر ہوتی اور میرے حملہ کرنے کے ساتھ ہی فائر کے دھماکے ہو سکتے تھے۔ دوسرا سپیرا اپنے ساتھی کو آوازیں دیتا آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ میں جھاڑیوں کی شاخوں میں چھپا ہوا تھا اور اسے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ میری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ میری عقابی نظریں اس سپیرے کے سینے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس نے بھی پہلے والے سپیرے کی طرح فوجی سپاہیوں والی وردی پہن رکھی تھی۔ جیسے ہی وہ جھاڑیوں کی ان ٹہنیوں کے قریب سے گزرنے لگا جن کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا میں اچانک اس کے سامنے آ گیا اور سامنے آتے ہی میرا کمانڈو چاقو پوری شدت اور طاقت کے ساتھ اس کے سینے میں اتر چکا تھا۔ کمانڈو ٹریننگ کے دوران ہم بھوسے کی ڈمیوں پر مشق کیا کرتے تھے اور جیسے ہی ڈمی ہمارے سامنے سے لٹکتی ہوئی گزرتی تھی ہم آڑ سے نکل کر چاقو ڈمی کے دل میں گھونپ دیتے تھے۔ یہ بڑی سخت ٹریننگ ہوتی تھی۔ اگر ہمارا چاقو ڈمی کے دل پر لگے ہوئے نشان پر نہیں پڑتا تھا تو پیچھے سے انسٹرکٹر کی چھڑی ہمارے سر پر پڑتی تھی۔

میرا چاقو سپیرے کے عین دل میں دستے تک اتر گیا تھا۔ وہ میرے اوپر گرنے لگا۔ میں چاقو کھینچ کر پرے ہٹ گیا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گرا اور بے حس و حرکت وہیں پڑا رہا۔ میں نے اس کی سٹین گن اٹھالی۔ یہ میرے کام آ سکتی تھی۔ جھاڑیوں کے اندر گیا تو وہاں کوئی اور آدمی نہیں تھا۔ میں یہی تسلی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد میں تیزی سے تالاب کی طرف آیا اور جہاں تالاب کی سیڑھیاں تھیں۔ اس سے کچھ فاصلے پر درخت کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر پو پھٹنے کا نور بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی بیوی کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ مجھے عورتوں کی باتیں کرنے اور دھیمی دھیمی ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میری نظریں تالاب کے پہلے جو درخت تھے اس طرف لگی تھیں۔ آوازیں بھی اسی طرف سے آ رہی تھیں۔ پھر کچھ عورتیں اندھیرے میں نمودار ہوئیں۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ ان میں یقیناً میری بیوی بھی تھی۔ سحر کی سپیدی ابھی نہیں ہوئی تھی اس لیے عورتوں کے دھندلے خاکے سے ہی نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس خیال سے بے چینی ہونے لگی کہ یہ

ساری عورتیں میری بیوی کو لے کر تالاب کی طرف آ رہی ہیں۔ بیندھیا نے تو کہا تھا کہ میں عورتوں کو باتوں میں لگا کر دور ہی رکھوں گی اور تالاب پر صرف میری بیوی ہی آئے گی۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے ایسا ہوا کہ ساتوں عورتیں جو میری بیوی کے ساتھ آئی تھیں ایک طرف چلی گئیں۔ ضرور ان میں بیندھیا بھی تھی جو ان عورتوں کو کسی بہانے دوسری طرف لے گئی تھی۔

تب میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ایک انسانی سائے کو دیکھا جو اکیلا رہ گیا تھا اور تالاب کی سیڑھیوں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے اندھیرے اور دھندلکے میں بھی پہچان لیا۔ یہ میری بیوی جمیلہ تھی۔ میں نے اس کو اس کے چلنے کے انداز سے پہچانا تھا۔ اس کا چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سٹین گن کندھے سے لٹکائی۔ چاقو میں نے پہلے ہی صاف کر کے اپنی جوگیوں والی دھوتی کے ڈھب میں چھپا لیا تھا۔ وقت بہت کم تھا میرے پاس---- میں جھاڑیوں سے نکل کر سیدھا تالاب کی طرف دوڑ کر گیا۔ اس وقت میری بیوی تالاب کی سیڑھیاں اترنے ہی والی تھی۔ قریب جاتے ہی میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ میری بیوی جمیلہ ہی تھی۔ اس کے کھلے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی اس کی سکھیوں میں سے کوئی سکھی ہے۔ میں نے قریب جا کر اسے بے اختیار آواز دی۔

"جمیلہ۔"

جمیلہ ایک دم رک گئی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں لے لیا۔

"جمیلہ! خدا کا شکر ہے تمہاری شکل دیکھنی نصیب ہوئی۔ اب تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں اس دوزخ سے نکال کر لے جاؤں گا۔ جلدی سے میرے ساتھ آ جاؤ۔"

جتنی دیر میں یہ جملے بولتا رہا جمیلہ حیرت اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ

میری طرف دیکھتی رہی۔ میں سمجھ گیا کہ اس پر منتروں کا اثر ہے اور وہ پوری طرح سے مجھے پہچان نہیں رہی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کھینچا تو جمیلہ نے چیخ ماری۔ پہلے تو میں گھبرا کر رک گیا مگر میں تو اسے ہر حالت میں وہاں سے لے جانے کے لیے آیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالنے کی کوشش کی تو جمیلہ نے اونچی آواز میں چیخنا شروع کر دیا۔ اس کی چیخوں کو سن کر ساری عورتیں درختوں میں سے نکل کر وہاں آ گئیں۔ انہوں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ جمیلہ کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو انہوں نے بھی شور مچا دیا۔ پھر خدا جانے ان کے شور کی آواز سن کر کس طرف سے سٹین گن کی فائرنگ کے دھماکے ہوئے۔ میں نے جمیلہ کو چھوڑ کر اپنی سٹین گن سے ہوا میں ایک برسٹ فائر کیا اور جمیلہ کو بازو سے پکڑنے لگا تو وہ چیختی چلاتی شور مچاتی عورتوں کے ساتھ درختوں کی طرف بھاگ گئی۔

میں کیا کر سکتا تھا۔ ان پر فائرنگ نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے پیچھے دوڑا کہ کسی طرح جمیلہ کو قابو کر کے وہاں سے لے جاؤں۔ دو قدم ہی دوڑا تھا کہ بائیں جانب والے درختوں سے چار پانچ فوجی وردیوں والے آدمی نمودار ہوئے۔ انہوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ تالاب خالی تھا۔ گولیاں درختوں کی شاخوں کو توڑتی ہوئی نکلنے لگیں۔ شاید وہ ابھی درختوں کو نشانہ بنا کر برسٹ فائر کر رہے تھے۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں وہاں سے چپکے سے سحر کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر نکل جاتا۔ ان لوگوں کو میں نظر نہیں آیا تھا ورنہ وہ مجھ پر برسٹ فائر کرتے۔ میں نے یہ غلطی کی کہ جو دو آدمی مجھے صبح کاذب کی مدھم روشنی میں تالاب کے پاس فائرنگ کرتے نظر آ رہے تھے ان پر فائرنگ کی ایک بوچھاڑ مار دی۔ دونوں آگے کو گر پڑے۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر فائر آنے لگا۔ شاید دوسرے آدمیوں کو میں نظر آ گیا تھا۔ جمیلہ کو وہاں سے نکال کر لے جانا تقریباً" ناممکن ہو گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس وقت وہاں سے نکل جاؤں اور دوسری دفعہ جمیلہ کو جوگن کے مشورے کے بعد نکالنے کی کوشش کروں۔ میں فائرنگ کرتا پیچھے ہٹنے لگا۔ یہ مجھے خیال ہی نہ رہا کہ میری سٹین گن کے میگزین کی گولیاں ختم ہو گئیں تو مجھے مزید ایمونیشن کہیں سے نہیں مل سکے گا۔ میرا خیال تھا کہ میں فائرنگ کرتا وہاں سے نکل جاؤں گا۔ آخر وہی ہوا۔ گولیان ختم ہو گئیں۔

میں نے سٹین گن وہیں پھینکی اور سیندھیا کی کٹیا کی طرف دوڑ لگا دی۔ لیکن میں گھیرے میں آ چکا تھا۔ گولیاں میرے سر کے اوپر سے نکل رہی تھیں۔ میں جھک کر بھاگ رہا تھا۔ اب دن کا اجالا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ میں جیسے ہی آشرم کے تالاب والے درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلا سامنے دس بارہ مسلح آدمی جنہوں نے فوجی وردیاں پہن رکھی تھیں، سٹین گنوں کا رخ میری طرف کیے کھڑے تھے۔ میں بغیر اسلحے کے تھا۔ صرف ایک چاقو ہی میرے پاس تھا جو اس وقت میرے کام نہیں آ سکتا تھا۔ ان لوگوں نے مجھ پر ایک بھی گولی نہ چلائی۔ شاید انہیں یہ حکم ملا تھا کہ مجھے زندہ گرفتار کیا جائے۔ انہوں نے مجھے فوراً" قابو میں کر لیا۔ یہ معمولی قد و قامت کے آدمی تھے۔ رنگ گہرے سانولے تھے۔ ابھی انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں ان کے دو آدمیوں کا خون کر چکا ہوں۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے مندر کی طرف لے گئے۔ ایک اونچے چبوترے پر بنا ہوا یہ مندر ایک کھنڈر لگ رہا تھا۔ وہ آپس میں اس علاقے کی زبان میں باتیں کر رہے تھے جو کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھیں۔

میرا حلیہ جوگیوں والا تھا۔ وہ حیران تھے کہ میرے پاس سٹین گن کہاں سے آ گئی تھی۔ انہوں نے مجھے مندر کے ایک تنگ و تاریک تہہ خانے میں پھینک کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے دھوتی کے ڈھب میں سے چاقو نکال کر کونے میں پتھروں کے نیچے چھپا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی دو مسلح آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے دو اور آدمی آ گئے۔ انہوں نے میرے ہاتھ رسی سے پیچھے باندھے اور کھینچتے ہوئے تہہ خانے سے نکال کر ایک نیم روشن راہداری میں سے گزرنے لگے۔ اس راہداری کی پتھر کی دیواروں پر بڑی فحش پوز والی مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں انہوں نے مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کر کے باہر تالا لگا دیا۔ میں ننگے فرش پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ جب ان لوگوں کو پتہ چلا کہ میں ان کے دو آدمی مار چکا ہوں تو یہ مجھے کسی صورت میں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ موت میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں صرف خدا کو یاد کر رہا تھا۔ بہت دیر گزر گئی۔ پھر باہر قدموں کی آہٹ

سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور تین باوردی مسلح سپیرے آئے اور مجھے پکڑ کر ایک اور تنگ سے کمرے میں لے گئے۔ جہاں چھ سات مسلح سپیرے پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے ایک ان کا افسر معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور اس علاقے کی ہندوستانی زبان میں مجھے گالی دی اور پھر اتنی زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا کہ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔

”تم نے ہمارے دو آدمیوں کو قتل کیا ہے۔ ہم تمہیں ابھی گولی مار دیتے اگر مہادیو جی کا حکم نہ ہوتا کہ تمہیں ان کے سامنے زندہ پیش کیا جائے۔“

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت تو جان بچ گئی۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ وہ مجھے وہاں سے مندر کی مختلف گھٹی گھٹی فضا والی تنگ و تاریک راہ داریوں میں سے گزارتے ہوئے ایک ایسی جگہ لے آئے جہاں ایک دروازے کے باہر دو مسلح سپیرے پہرہ دے رہے تھے۔ افسر سپیرے نے کہا۔

”مہاراج سے عرض کرو کہ ان کا آدمی ہم پکڑ کر لے آئے ہیں۔“

ایک آدمی اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو بولا۔

”اندر لے جاؤ۔ اس راکھشش کو۔“

مجھے ایک چھوٹے ہال کمرے میں لایا گیا جس کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ جگہ جگہ چوکور ستون چھت تک چلے گئے۔ ان ستونوں پر ننگی عورتوں کی مورتیں کندہ کی گئی تھیں۔ چھت کے ساتھ پیتل کے روشن دیے لٹک رہے تھے۔ اس ہال میں سے گزار کر وہ لوگ مجھے آگے ایک اور ہال کمرے میں لے آئے۔ یہ چھوٹا ہال کمرہ تھا۔ فرش پر قالین بچھے تھے۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک بڑا تخت بچھا تھا۔ اس پر ایک سرخ رنگ کا ٹاؤچ رکھا ہوا تھا جو خالی تھا۔ اس کی دونوں جانب دو جوان اور نیم عریاں لڑکیاں مور چھل تھامے ساکت کھڑی تھیں۔ مجھے ایک ستون کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ میرے ہاتھ کھول دیے گئے تھے۔

کوئی پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ سنکھ بجانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میرے

ساتھ جو مسلح فوجی سپیرے آئے تھے وہ گھٹنوں کے بل ہو گئے۔ انہوں نے مجھے بھی گھٹنوں کے بل بٹھا دیا۔ جس طرف سے سنکھ بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں اس طرف سرخ پردے گرے ہوئے تھے۔ دو زعفرانی کپڑوں اور لمبے بالوں والے آدمی پردے کے پیچھے سے نمودار ہوئے۔ انہوں نے پردے ایک طرف ہٹا دیے۔ ایک پالکی آئی جس کو چار آدمیوں نے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ آگے آگے چار پجاری سنکھ بجا رہے تھے۔ پالکی پر ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے گیروے رنگ کی دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ توند پھولی ہوئی تھی۔ گلے میں اور بازوؤں پر ہیرے موتیوں کے ہار لٹک رہے تھے۔ سر پر ایک تاج تھا جس پر نیلے رنگ کا اژدہا کا سر بنا ہوا تھا۔ پالکی کے پیچھے بھی چار آدمی تھے جو اشلوک پڑھتے ہوئے قدم قدم چل رہے تھے۔ پالکی تخت کے پاس لا کر رکھ دی گئی۔ موٹی توند والا آدمی دو پجاریوں کے سہارے سے پالکی میں سے نکلا اور تخت پر بیٹھ گیا۔ پیچھے دو نیم عریاں جوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ وہ مور چھل ہلانے لگیں۔ تخت کے چاروں کونوں پر چاندی کے دیے روشن کر دیے گئے۔

”میں سمجھ گیا کہ یہی شیطانی مہادیو ہے۔ جو اس پر اسرار آشرم میں دور دراز سے حسین عورتوں کو منگوا کر ان کی عزتوں سے کھیلتا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کا عصا تھا جس کی موٹھ پر بھی اژدہا کا سر بنا ہوا تھا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی عصا کو آہستہ سے بلند کیا اور خرخراتی بھاری آواز میں کہا۔

”دشمن کو میرے قریب لاؤ۔“

دو آدمی مجھے گھسیٹتے ہوئے تخت کے پاس لے گئے اور گھٹنوں کے بل بٹھا دیا۔ ایک فوجی وردی والے نے کہا۔

”دیوتاؤں کے دیوتا مہاراج مہادیو گورو! یہی ہمارا دشمن ہے جو باہر سے آیا ہے اور جس نے ہمارے دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“

شیطان مہادیو نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

”تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟ تم یہاں کس کی مدد سے آئے ہو؟ اگر تم سچ سچ بتا دو

گے تو میں تمہاری جان نہیں لوں گا۔"

میں نے فوراً اداکاری کرتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! میں بے قصور ہوں۔ میں نے آپ کے دو آدمیوں کا خون نہیں کیا۔ مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔ میں آلوپ نگر کو دیکھنے کے شوق میں یہاں آگیا تھا۔ تالاب کے پاس رات کو سوگیا۔ صبح صبح عورتوں کو اشنان کرتے دیکھ رہا تھا کہ آپ کے آدمیوں نے مجھ پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔"

شیطان مہادیو نے کہا۔

"تم نے بھی جواب میں فائرنگ کی تھی۔ تمہارے پاس سٹین گن کہاں سے آگئی تھی؟"

اس آدمی کے جملوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ اردو جانتا ہے اور ماڈرن زمانے کے اسلحہ وغیرہ سے خوب واقف ہے۔ میں نے کہا۔

"مہاراج! میں نے گولی نہیں چلائی۔ مہاراج میں تو معمولی سا جوگی ہوں۔ مجھے کیا پتہ گولی کیسے چلائی جاتی ہے۔"

فوجی وردی والا سپیرا جو افسر تھا، بولا۔

"مہاراج! یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس نے ہم پر جوابی فائرنگ کی تھی۔ ہم نے اسے خود سٹین گن سے فائرنگ کرتے دیکھا تھا۔ مہاراج! یہ کوئی جاسوس ہے جسے ہمارے دشمنوں نے یہاں کے حالات معلوم کرنے بھیجا ہے۔"

شیطانی مہادیو نے غصے میں آ کر کہا۔

"اگر اسے ہمارے دشمنوں نے بھیجا ہے تو یہ ہمارے سانپوں اور مگرمچھوں سے بچ کر آلوپ نگر اور ہمارے آشرم تک کیسے پہنچ گیا؟"

تخت کے پاس ایک بوڑھا پجاری کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! اس نے ضرور اپنے اوپر کوئی منتر پھونک رکھا ہے۔ یہ کوئی بڑا خطرناک جوگی معلوم ہوتا ہے۔"

شیطانی مہادیو نے چاندی کا عصا اوپر اٹھا کر حکم دیا۔

"گنگولی کو بلاؤ۔"

ایک پجاری فوراً چلا گیا۔ مہادیو! مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے حلق سے سانس لیتے ہوئے خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ کہنے لگا۔

"تم جوگی سنیاسی نہیں ہو۔ یہ مجھے معلوم ہوگیا ہے۔ ابھی وقت ہے بتا دو کہ تم اصل میں کون ہو اور تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

میں نے وہی الفاظ دہرا دیے کہ مہاراج مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔ میں بے قصور ہوں۔ میں الہ آباد کا ہوں۔ جوگی بننے کا شوق تھا۔ گنگا کے کنارے ایک سادھو مہاراج نے مجھے جوگی بنا دیا۔ میں نے وید شاستر نہیں پڑے۔ میں شہر کا رہنے والا ہوں۔ آلوپ نگر دیکھنے کا شوق مجھے یہاں کھینچ لایا۔ مجھے شما کر دیں مہاراج---- مہادیو اس دوران قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھ کر گردن دائیں بائیں ہلاتا رہا۔ گنگولی آگیا۔ اس کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی دہشت سپیرا تھا جس کو میں نے دلی والے کوارٹر میں شام کے وقت منڈلاتے دیکھا اور دوسرے دن یہی سپیرا میری بیوی کو ورغلا کر لے گیا تھا۔ اس سپیرے نے مجھے نہیں دیکھا کیونکہ اس کا میرا آمنا سامنا کبھی نہیں ہوا تھا۔ دہشت سپیرے نے میری طرف دیکھا۔ پھر مہادیو کے آگے ہاتھ باندھ کر جھک گیا۔ مہادیو نے کہا۔

"گنگولی! یہ باہر کا جاسوس ہے۔ یہ معلوم کرو کہ اس نے اپنے بدن پر کون سا منتر پھونک رکھا ہے۔ جس کے اثر سے یہ ہمارے زہریلے سانپوں، مگرمچھوں اور خونی درختوں سے زندہ سلامت بچ کر یہاں تک آگیا۔"

"گنگولی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا میرے پاس آگیا۔ اس نے منہ ہی منہ میں کوئی اشلوک پڑھ کر مجھ پر پھونکا۔ پھر خود بخود چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ دوبارہ میرے قریب آیا اور میرے جسم کو سونگھنے لگا۔ پھر مہادیو کے تخت کے پاس جا کر بولا۔

"مہا دیوتا! اس شخص کے جسم سے ایسی بو آرہی ہے جس کو سونگھ کر زہریلے سانپ اور مگرمچھ بھاگ جاتے ہیں۔ آدم خور درختوں کی ٹہنیاں سمٹ جاتی ہیں۔ مہاراج! یہ کوئی

بڑا خطرناگ جوگی ہے۔"

مہا دیو غصے سے کانپتا ہوا تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ کڑک کر بولا۔

"اس دھشٹ کو شیش ناگ والی کوٹھڑی میں بند کر دو۔ اماوس کی رات ہم خود اس کو اپنے سامنے کھولتے ہوئے تیل کے کڑاؤ میں ڈالیں گے۔ لے جاؤ اسے۔"

سپیرے فوجی مجھے گھسیٹتے ہوئے وہاں سے نکال کر لے گئے۔

میرا خیال تھا کہ مجھے جس کوٹھڑی میں بند کیا جائے گا' اس میں کوئی بہت بڑا سانپ بھی ہو گا۔ چونکہ مہا دیو اماوس کی رات تک مجھے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ اس کوٹھڑی میں شیش ناگ نہیں ہو گا۔ اگر ہوا بھی تو وہ سانپ ہی ہو گا اور میرے جسم سے نکلنے والی بو اسے میرے قریب نہیں آنے دے گی۔ وہ لوگ مجھے آشرم کی عمارت سے باہر لے آئے۔ آمنے سامنے تنگ کوٹھڑیوں والے کھنڈر نما مندر تھے جن کے باہر ھنومان کی اور اژدہوں کے بت جگہ جگہ نصب تھے۔ دن کا وقت تھا مگر وہاں کوئی آدمی کوئی پجاری نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پیچھے باندھ دیے گئے تھے۔ یہ لوگ مجھے مندروں کے درمیان ویران اجاڑ راستے میں سے گزارتے ہوئے ایک ٹیلے کے پاس لے آئے۔ یہاں پتھر کی دیواروں اور پتھر کی چھت والی ایک کوٹھڑی تھی جس کے لکڑی کے پرانے دروازے کے آگے لوہے کا بڑا مضبوط جنگلہ لگا ہوا تھا۔ یہ بالکل حوالات کے دروازے کی طرح تھا۔ ایک سپیرے فوجی نے آگے بڑھ کر لوہے کے جنگلے والے دروازے کا تالا کھولا۔ پھر لکڑی کے پرانے دروازے کا تالا کھولا اور مجھے پکڑ کر اندر دھکیل کر دونوں دروازے بند کر کے تالے لگا دیے گئے۔

اس کوٹھڑی کو مہا دیو شیطان نے شیش ناگ والی کوٹھڑی کہا تھا۔ اندر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر دیوار کے اوپر چھت کے قریب بنے ہوئے چھوٹے سے روشندان میں سے جو دن کی روشنی اندر آ رہی تھی' اس کی وجہ سے کچھ کچھ نظر آنا شروع ہوا۔ کوٹھڑی کے فرش پر سوکھا گھاس پھونس بچھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ کوٹھڑی میں حبس اور گرمی تھی۔ مچھر بھی تھے۔ مچھروں نے فوراً مجھ پر حملہ کیا لیکن میرے جسم سے نکلنے والی بو پا کر جدھر سے آئے تھے ادھر کو بھاگ گئے۔ اس اعتبار سے میں بڑے سکون میں تھا کہ کم از کم مجھے مچھر اب تنگ نہیں کریں گے۔ میں سوکھی گھاس پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ جمیلہ نے مجھے نہیں پہچانا۔ اس پر کیے گئے منتروں کا اثر کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ کیا میں اس سے دوبارہ مل سکوں گا؟ خدا جانے ان کی اماوس کی رات کب آئے گی۔ اس رات یہ لوگ مجھے کھولتے ہوئے تیل کے کڑاؤ میں ڈال دیں گے۔ ہو سکتا ہے اماوس کی رات کل کی رات ہو۔ میں خدا کے حضور سر جھکا کر دعائیں مانگنے لگا۔

رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں اونگھتے اونگھتے وہیں گھاس پر پڑ کر سو گیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب کوئی میرے پاؤں پر زور سے ٹھوکریں مار رہا تھا۔

"اٹھو دھشٹ! میرے ساتھ آؤ۔"

لکڑی اور لوہے کے دونوں دروازوں کے تالے کھلے تھے مگر باہر دو سپیرے فوجی سٹین گنیں لیے دائیں بائیں پوزیشن لے کر کھڑے تھے۔ جب فوجی سپیرے نے مجھے جگایا تھا وہ مجھے چند قدموں کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کے پاس لے گیا اور بولا۔

"جاؤ اندر جا کر اشنان وغیرہ کر لو۔"

یہ ایک تنگ سا غسل خانہ تھا۔ جہاں پانی سے بھری ہوئی بالٹی اور مٹی کا پیالہ رکھا ہوا تھا۔ نلکہ وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ میں نے اچھی طرح سے غسل کیا۔ سر میں جمی ہوئی راکھ مل مل کر نکال دی۔ وہی دھوتی پہنی اور غسل خانے سے باہر آ گیا۔ باہر مسلح فوجی سپیرا موجود تھا۔ وہ مجھے سٹین گن کی نوگ پر واپس لوہے کے جنگلے والی کوٹھڑی میں لے آیا اور اندر دھکیل کر اس نے دونوں دروازوں پر تالے لگا دیے۔ باہر نکلی ہوئی دھوپ سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ دوپہر کا وقت ہو گیا ہوا ہے۔ مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔

میں گھاس پھوس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ سارا دن گزر گیا۔ بھوک اور پیاس سے میں نڈھال ہو رہا۔ روشندان میں سے آتی دن کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ پھر یہ دھندلی

روشنی بھی غائب ہوگئی۔ باہر رات پڑ گئی تھی۔ باہر سے کسی کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ کسی کسی وقت سپیرے فوجیوں کی ایک دوسرے سے ایک آدھ جملہ بولنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ اس کے بعد پھر وہی موت کی خاموشی طاری ہو جاتی۔ اس کوٹھڑی میں ناگوار بو رچی ہوئی تھی۔ شاید اس میں کبھی کوئی بڑا اژدہا رہتا ہوگا۔ جب رات ہوگئی تو دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر آئی۔ اس نے جوگنوں والی زرد دھوتی باندھ رکھی تھی۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ اس عورت کے ہاتھوں میں ایک تھال تھا جس میں پیتل کا دیا روشن تھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ جوگن مایا دیوی کی سہیلی اور ہم دونوں کی دوست سیندھیا تھی۔ اس نے طشت میرے آگے رکھ دیا اور سرگوشی میں کہا۔

"خاموش رہنا۔"

وہ میرے لیے کھانے کو روٹیاں سبزی کا سالن اور کچھ کیلے لائی تھی۔ پیتل کا دیا اس نے طاق میں رکھ دیا۔ پھر اونچی آواز میں کہا۔

"مہا دیو جی نے تم پر مہربانی کر کے تمہارے لئے بھوجن بھیجا ہے۔ پر تو اماوس کی رات تک جو کچھ بھی کھا سکتا ہے کھا لے۔ پھر تیرے جیون کا سفر ختم ہو جائے گا۔"

شاید یہ الفاظ وہ کوٹھڑی کے باہر پہرے پر موجود مسلح سپیرے فوجیوں کو سنانا چاہتی تھی۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ دھیمی آواز میں بولی۔

"میں نے گنگولی سپیرے سے کہہ کر تمہیں روزانہ شام کو بھوجن کرانے کی ڈیوٹی لگوائی ہے۔ وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے' کیونکہ میں اسے بہت خوش کرتی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"سیندھیا! یہ سب کچھ کیا ہوگیا ہے۔ میری بیوی اگر چیخ نہ مارتی تو میں اسے نکال کر لے گیا تھا مگر اس نے مجھے بالکل نہیں پہچانا۔"

ہم بڑی دھیمی آواز میں بلکہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"اب تمہاری بیوی نے تھوڑا تھوڑا تمہیں پہچان لیا ہے۔ وہ مجھ سے تمہاری باتیں

کرتی رہی تھی۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں" سیندھیا نے آہستہ سے کہا۔ "دو ایک دن میں اس پر منتروں کا اثر شاید ختم ہو جائے۔"

میں نے آہ بھر کر کہا۔

"اب کیا فائدہ--- یہ لوگ تو مجھے ختم کر دیں گے۔ شاید اب کبھی جمیلہ سے ملاقات نہ ہو۔"

سیندھیا نے کہا۔ "فکر کیوں کرتے ہو۔ تمہیں اماوس کی رات کو کھولتے تیل میں ڈالا جائے گا اور اماوس کی رات میں ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔"

یہ سن کر میرا کچھ حوصلہ بڑھا۔ میں روٹی بھی کھا رہا تھا اور سیندھیا سے آہستہ آہستہ باتیں بھی کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"سیندھیا! کیا تم مجھے اور میری بیوی کو یہاں سے نکال سکتی ہو؟"

اس نے کہا۔

"میں اسی لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔ میں کوشش کروں گی کہ تم اپنی بیوی کو لے کر یہاں سے فرار ہو جاؤ۔ لیکن ابھی مجھے کوئی راستہ تلاش کر لینے دو۔ میں کل آؤں گی تو تم سے بات کروں گی۔"

میں نے جلدی جلدی کھانا کھا لیا۔ پانی پیا۔ سیندھیا طشت اٹھا کر کوٹھڑی سے نکل گئی۔ باہر کھڑے فوجی سپیرے نے پہلے لکڑی کے دروازے پر اور پھر لوہے کے جنگلے پر تالا لگا دیا۔

سیندھیا کے آنے سے میرے دل میں امید کی ایک کرن روشن ہوگئی تھی۔ یہ عورت میری مدد کر سکتی تھی۔ وہ سمجھدار تھی اور بہادر بھی تھی۔ دوسرا دن میں نے سخت بیزاری کے عالم میں گزار دیا۔ شام کے وقت سیندھیا میرے لیے کھانا لے کر آ گئی۔ مجھے

دن میں صرف ایک بار کھانے کو ملتا تھا۔ مگر مجھے بڑا اچھا کھانا دیا جا رہا تھا۔ شاید مہادیو چاہتا تھا کہ میں موت کے وقت تک پوری طرح صحت مند رہوں تاکہ مجھے کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں گرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچے۔ سیندھیا میرے سامنے بیٹھ گئی۔ میں کھانا کھانے لگا۔ اس نے اونچی آواز میں باہر پہرے داروں کو سنانے کے لیے مجھے برا بھلا کہا۔ مہادیو کی تھوڑی سی تعریف کی اور خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

"تمہاری بیوی پر کیے گئے منتروں کا اثر کافی ختم ہو گیا ہے۔ رات کو جب وہ مہادیو کے آشرم میں جانے لگی تو مجھ سے بولی۔ سیندھیا! مجھے اس دوزخ سے نکالو۔ میں اپنے خاوند کرم داد کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ اگر وہ مر گیا تو میں زندہ نہیں رہوں گی۔"

میری جان میں جان آ گئی۔ اگرچہ مجھے اپنی زندگی کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ میں ہفتے کے بعد زندہ بھی ہوں گا یا نہیں، اس کے باوجود جمیلہ کی یادداشت کے واپس آ جانے کی مجھے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ میں نے سیندھیا سے کہا۔

"سیندھیا! یقین کرو اگر تمہارے مہادیو نے مجھے مروا دیا تو میری بیوی واقعی زندہ نہیں رہے گی وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی ہے۔"

سیندھیا نے دروازے کی طرف ایک نظر ڈالی۔ پھر میری طرف جھک کر کہا۔

"میں نے تم دونوں کے فرار کا سوچ لیا ہے۔"

میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں ہاں آہستہ بات کرو۔" اس نے مجھے دبی آواز میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "کل شام کو آؤں گی۔ تم تیار رہنا۔"

اس کے بعد سیندھیا جلدی سے اٹھ کر لکڑی کے دروازے کے بند کیواڑوں کے پاس گئی اور کان لگا کر دوسری طرف سے کچھ سننے لگی۔ پھر اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر دیکھا۔ اس کے بعد جلدی سے دروازہ بند کر کے میرے سامنے بیٹھ گئی اور سرگوشی میں بولی۔

"تم کل رات تیار رہنا۔"

"کیا جمیلہ کو تم ساتھ لاؤ گی؟"

"شی! خاموش رہو! یہ میں تمہیں کل بتاؤں گی۔"

وہ چلی گئی۔ میرے لیے دوسرے دن کی شام کرنا پہاڑ کاٹنے کے برابر ہو گیا۔ سارا دن سوچتا رہا کہ سیندھیا نے کیا انتظام کیا ہو گا۔ کہیں ہمارے ساتھ وہ بھی موت کے منہ میں نہ چلی جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس شیطان نگری سے ہمارا نکلنا ناممکن نظر آتا تھا مگر سیندھیا وہاں کے تمام خفیہ راستوں کی بھیدی تھی۔ ضرور وہ ہمیں کسی خفیہ سرنگ سے فرار کروانے والی تھی۔ بڑی مشکل سے دن کا تیسرا پہر ہوا۔ پھر شام کا اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرا ذرا گہرا ہوا تو تالا کھلنے کی آواز آئی۔ سیندھیا میرے لیے بھوجن لے کر آ گئی تھی۔ آج وہ پیتل کا نیال دیا لائی تھی جو روشن تھا۔ اس نے نیا دیا طاق میں رکھ کر پرانا دیا اٹھا لیا جس کی لو تیل کم ہو جانے کی وجہ سے مدھم ہو رہی تھی۔ میں پرامید نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ معمول کے مطابق اس نے باہر سپیرے فوجیوں کو سنانے کی خاطر مجھے بلند آواز میں برا بھلا کہا۔ اپنے شیطانی مہادیو کی تعریف کی اور سرگوشی میں کہنے لگی۔

"تمہیں آج آدھی رات کے بعد یہاں سے فرار ہو جانا ہے۔ میں نے تمہاری بیوی کو تیار کر لیا ہے۔ میں اسے لے کر اپنی کٹیا میں موجود ہوں گی لیکن اس کوٹھڑی سے نکلنے کا کوئی طریقہ تمہیں خود سوچنا ہو گا۔ باہر دو سپیرے پہرہ دے رہے ہیں۔ ان کے پاس سٹین گنیں بھی ہیں۔ میں انہیں یہاں سے نہیں ہٹا سکتی۔ یہ کام تمہیں خود کرنا ہو گا۔"

میں ایک بار تو پریشان ہو گیا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی دو فوجی سپیرے ہر وقت باہر پہرے پر موجود ہوتے تھے۔ وہ انہیں نہ تو ہلاک کر سکتی تھی اور نہ کسی طریقے سے انہیں وہاں سے ادھر ادھر کر سکتی تھی۔ اس طرح سے اس پر بعد میں شک کیا جا سکتا تھا۔ اس نے مجھے ایک ایسا کام سونپ دیا تھا جو اس وقت مجھے بہت مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ مگر میری کمانڈو

ٹریننگ وہاں بھی میرے کام آئی۔ میں نے ایک طریقہ سوچ لیا۔ میں نے سیندھیا سے کہا۔

"میرے پاس ایک ترکیب ہے لیکن ہو سکتا ہے وہ کامیاب نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو تم کیا کرو گی؟"

وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"پھر یہی ہو گا کہ تم اپنی بیوی کو حاصل کیے بغیر ہی موت کے منہ میں جھونک دیے جاؤ گے۔ یہ اچھی طرح سے سمجھ لو کہ یہ تمہاری زندگی کا آخری موقع ہے۔ تمہیں ہر حالت میں آج آدھی رات کے بعد اس کوٹھڑی سے نکلنا ہو گا۔"

میں کھانا بھی کھا رہا تھا اور میرا ذہن تیزی سے کام بھی کر رہا تھا۔ میرے پاس صرف ایک ہی طریقہ تھا' میں اسی کو آزما سکتا تھا۔ مجھے ننانوے فیصد یقین تھا کہ میری ترکیب کامیاب رہے گی۔ میں نے سیندھیا کو بڑے اعتماد سے کہا۔

"میں آدھی رات کے بعد تمہاری کٹیا میں ضرور پہنچوں گا۔ اگر نہ پہنچ سکا تو سمجھ لینا کہ میں زندہ نہیں ہوں پھر تم اگر کر سکو تو صرف اتنا کر دینا کہ میری جمیلہ کو یہاں سے نکال کر دلی میرے دوست کے گھر پہنچا دینا۔"

میں نے سیندھیا کو اپنے دوست اور محسن مشتاق صاحب کا نام پتہ بتا دیا۔ وہ بولی۔

"یہ کام میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر تم آج رات میری کٹیا میں نہ پہنچے اور زندہ بھی رہ گئے تو یہ لوگ تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے اور سمجھ لینا کہ تمہاری بیوی مہادیو کے آشرم میں ہی بوڑھی ہو کر مرے گی۔ اب میں جاتی ہوں۔ آدھی رات ہونے میں تین گھنٹے باقی ہیں۔ میں تین گھنٹوں کے بعد جس طرح بھی ہو سکا تمہاری بیوی کو لے کر اپنی کٹیا میں پہنچ جاؤں گی۔ اگر تم نہ آئے تو میں تمہاری بیوی کو لے کر واپس آشرم میں آ جاؤں گی۔"

اس کے بعد وہ طشت اٹھا کر چلی گئی۔

میرے پاس تین گھنٹے تھے۔ بلکہ میرے حساب سے دو گھنٹے ہی تھے۔ اس عرصے میں مجھے صرف ایک کمانڈو ایکشن کرنا تھا۔ یہ کمانڈو ایکشن، مجھے اور میری بیوی کو نئی زندگی بھی

عطا کر سکتا تھا اور یہی کمانڈو ایکشن میری زندگی کا آخری ایکشن بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس قسم کا ایکشن اپنی کمانڈو سروس میں کئی بار کر چکا تھا۔ کبھی اس میں کامیاب رہا تھا اور کبھی کامیاب نہیں ہوا تھا لیکن یہاں میرے پاس کوئی چوائس نہیں تھی۔ مجھے اپنے ایکشن میں ہر حالت میں کامیاب ہونا تھا۔ ناکامی کی صورت میں میری موت تھی اور میری بیوی جمیلہ کی زندگی کی بربادی اور تباہی تھی۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ کمانڈو چاقو بھی نہیں تھا۔ اس کی مجھے زیادہ پرواہ نہیں تھی کیونکہ کمانڈو نہتا بھی ہو تو دشمن کو قابو کرنا جانتا ہے لیکن یہاں ٹارگٹ میرے سامنے نہیں تھا۔ مجھے ٹارگٹ کو کوٹھڑی کے اندر مہیا کرنا تھا۔ آگے چل کر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں کس قسم کا کمانڈو ایکشن کرنے والا تھا۔ یہ کوئی پر اسرار یا انوکھا ایکشن نہیں تھا۔ لیکن اس کا کامیاب ہونا لازمی تھا۔ دوسری صورت میں میری موت اور میری بیوی کی تباہی تھی۔

میں دروازے کے پاس آ گیا۔ کان لگا کر باہر کی آواز سننے کی کوشش کی۔ باہر کوئی آواز نہیں تھی۔ خاموشی ہی خاموشی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ باہر دو سپیرے فوجی سٹین گنیں لیے پھر رہے ہیں۔ خدا جانے وہ خاموش کیوں تھے۔ اچانک مجھے دروازے کی درز میں سے چرس کی بو آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ دونوں سپیرے چرس پی رہے تھے۔ اس لیے ان پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ شراب پی کر آدمی بہت زیادہ باتیں کرتا ہے مگر چرس پی کر آدمی چپ ہو جاتا ہے۔ بات کرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا۔ مجھے اطمینان سا ہوا۔ چرس کے نشے کی حالت میں میں ان دونوں کو آسانی سے قابو کر سکتا تھا۔ شرط صرف یہ تھی کہ وہ اندر آ جائیں۔ میں کوٹھڑی میں ٹہل کر وقت گزارنے لگا۔ کچھ دیر تک تو مجھے وقت کا احساس رہا۔ پھر میں بھول گیا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ ایک اندازہ سا تھا اسی کے حساب سے جب مجھے احساس ہوا کہ آدھی رات ہونے والی ہے تو میں نے بسم اللہ پڑھ کر اللہ میاں سے کامیابی کی دعا مانگی اور کوٹھڑی کے بند دروازے کے پاس جا کر اس طرح اونچی آواز میں چیخنے لگا جیسے میں شدید تکلیف میں ہوں۔ میں ساتھ ساتھ زور سے دروازے پر ہاتھ بھی مار رہا تھا اور وقفے وقفے سے بلند آواز میں کہتا جاتا تھا۔

”بھگوان کے لیے میری مدد کرو۔ میرا پیٹ درد سے پھٹا جاتا ہے۔ کسی وید کو بلاؤ۔ میں مرجاؤں گا۔ مجھے بچالو۔ مجھے بچالو۔ ہے بھگوان-----‘ ہے بھگوان------“

میں نے اس قدر اودھم مچایا۔ اتنی چیخ و پکار کی کہ مجھے باہر والے لوہے کے جنگلے کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ یہ میری پہلی کامیابی تھی۔ میں اسی طرح درد سے تڑپنے اور شور مچانے کی اداکاری کر رہا تھا۔ دوسرے دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی تو میں درد سے بلبلانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اپنی خاص پوزیشن میں ہوگیا۔ سپیرا فوجی مجھے گالیاں دیتا کوٹھڑی میں آگیا۔ وہ اکیلا تھا۔ دوسرا فوجی باہر ہی تھا۔ لکڑی کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ میں دیوار کی آڑ لے کر بالکل اٹیک کی پوزیشن میں کھڑا تھا اور ہائے ہائے بھی کر رہا تھا جیسے ہی سپیرا فوجی اندر داخل ہوا میں نے اٹیک کر دیا۔ یہ کوئی تربیت یافتہ فوجی تو تھے نہیں، سپیرے تھے۔ نوجوان ضرور تھے۔ فوجی وردی بھی انہوں نے پہن رکھی تھی مگر صرف سٹین گن اور رائفلیں چلانا ہی جانتے تھے۔ میرے لیے یہ بڑا آسان شکار تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ درد سے بلبلانے کی آوازیں نکالتے ہوئے پلک جھپکنے میں اپنا بازو اس کی گردن میں آگے کی طرف سے ڈال کر گردن کو پوری طاقت سے ایک جھٹکا دیا۔ مجھے ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور سپیرے فوجی کا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے ہائے ہائے کرتے ہوئے اس کے مردہ جسم کو گھسیٹ کر دیوار کی طرف کر دیا اور مزید زور زور سے آواز نکالنے لگا۔ باہر جو سپیرا فوجی کھڑا تھا اس نے اپنے ساتھی کو چلا کر کہا کہ اس دھشٹ کو گولی مار دو۔ تم اندر کیا کر رہے ہو؟ جب اسے اپنے ساتھی کی کوئی آواز نہ آئی تو وہ دوڑ کر اندر آگیا۔ اس نے سٹین گن سیدھی کی ہوئی تھی۔ میں محتاط ہوگیا۔

جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا میں نے اسے دبوچ کر سب سے پہلے ہاتھ مار کر اس کی سٹین گن نیچے گرا دی۔ وہ مجھ سے گتھم گتھا ہوگیا۔ مگر وہ مجھ سے ویسے بھی کمزور اور دبلا تھا۔ ایک کمانڈو کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے چیخ مار کر شاید باہر سے کسی کو بلایا۔ میں نے اسی وقت اس کی گردن میں بازو ڈال کر تین چار زبردست جھٹکے دیے۔ یہ خاص زاویے کے جھٹکے تھے جو صرف ایک کمانڈو ہی دے سکتا تھا۔ دوسرا دبلا پتلا سپیرا فوجی بھی اگلے

جہان میں پہنچ گیا۔ میں نے ان میں سے ایک کی سٹین گن اٹھالی اور دبے پاؤں دروازے کے پاس آکر گردن باہر نکال کر دیکھا۔ دوسرے سپیرے نے کسی کو آواز دی تھی۔ خطرہ تھا کہ باہر کوئی تیسرا سپیرا موجود نہ ہو لیکن باہر کوئی نہیں تھا۔

سٹین گن کو میں نے اپنے ہاتھ میں ہی رکھا اور کوٹھڑی کے بڑے چبوترے سے دوسری طرف چھلانگ لگا کر درختوں میں گھس گیا۔ رات کی تاریکی میں مجھے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن مجھے سیندھیا کی کٹیا تک کے راستے کا اندازہ تھا۔ میں جھاڑیوں کو پھلانگتا جتنی تیز چل سکتا تھا چل رہا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ سامنے آشرم کی عمارتوں کا سب سے کشادہ پلاٹ تھا۔ جو رات کی تاریکی میں ویران پڑا تھا۔ یہاں سے سیندھیا کی کٹیا زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے دوڑ کر ویران صحن کو پار کیا اور ایک چھوٹے ٹیلے کے پیچھے سے گزر کر اس مقام پر آگیا جہاں چبوترے پر سیندھیا کی کوٹھری نظر آگئی۔

میں جلدی جلدی چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ کر کٹیا کے اندر چلا گیا۔ کٹیا میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سیندھیا میری بیوی کو لے کر ابھی نہیں پہنچی تھی۔ میں سٹین گن لیے کٹیا کے باہر ایک طرف اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گیا اور سیندھیا اور اپنی بیوی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ جیسے جیسے رات گزر رہی تھی میری بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں بار بار آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ جہاں سات ستاروں کی ٹولی یعنی کھیتیاں ابھی آسمان کے وسط میں ہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی آدھی رات ہی ہوئی تھی۔ میرے جسم سے نکلنے والی جڑی بوٹیوں کی خاص بو کی وجہ سے ایک بھی مچھر میرے قریب نہیں آ رہا تھا۔ مجھے سانپوں کا بھی ڈر نہیں تھا۔ صرف بن مانس اور کسی طرف سے اچانک نکل آنے والے اژدہا کا ہی ڈر تھا۔ میں دائیں بائیں اندھیرے میں دیکھ لیتا تھا۔ یہ وقت گزارنا میرے لیے قیامت بن گیا تھا۔ میری آنکھیں اس طرف درختوں کی تاریکی میں دیکھتے دیکھتے تھک گئی تھیں جدھر سے میرا خیال تھا کہ سیندھیا میری بیوی کو لے کر آنے والی تھی۔

رات گزرتی گئی۔

آسمان پر سات ستاروں کا جھومر آہستہ آہستہ مغربی افق کی جانب جھکتا چلا گیا۔ میری بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب آسمان پر پچھلے پہر کا نور جھلکنے لگا تو میں مایوس ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ضرور کوئی مشکل پڑ گئی ہوگی سیندھیا کو۔ میں نے سوچا۔ ورنہ وہ جمیلہ کو لے کر اب تک پہنچ گئی ہوتی۔ میں تھوڑی دیر کٹیا میں آ کر بیٹھا رہا۔ پھر بے چین ہو کر باہر آ کر چبوترے پر ٹہلنے لگا۔ صبح کا اجالا نمودار ہونا شروع ہوگیا۔ مہادیو کے آشرم کی عمارتوں کے کھنڈر گھنے درختوں کے پیچھے پچھلے پہر کے دھندلکوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مجھے صرف سامنے والی عمارتوں کے کھنڈر کچھ فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ جیسے جیسے صبح کی سپیدی پھیل رہی تھی میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ صبح ہوتے ہی ان لوگوں کو میرے فرار اور مزید دو سپیروں کے قتل کا علم ہوجانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مہادیو کے سپیروں کے فوجی دستے مجھے ہلاک کرنے کے لیے نکلنے والے تھے۔ میرے لیے اس علاقے میں زیادہ دیر رکنا کسی صورت میں بھی مناسب نہیں تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہاں سے نکلنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں جمیلہ کو ہر حالت میں ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا اور وہاں ٹھہر بھی نہیں سکتا تھا۔ جب دن کی روشنی ذرا زیادہ ہوئی تو اچانک شیطان مہادیو کے آشرم کی طرف سے فائرنگ کے دھماکے ہوئے۔ یہ سٹین گنوں کے برسٹ تھے جو ایک ساتھ فائر ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی آدمیوں کے ایک دوسرے کو آوازیں دینے اور ہر ہر مہادیو کے نعرے گونجنے لگے۔

مہادیو کو میرے فرار اور اپنے دو آدمیوں کی ہلاکت کا پتہ چل گیا تھا اور اس کی فوج کے آدمی میری تلاش میں نکل پڑے تھے۔ میں نے چبوترے پر سے چھلانگ لگائی اور مشرق کی طرف خونی جنگل کے درختوں کی طرف دوڑنے لگا۔ میں دوڑتے دوڑتے پلٹ کر پیچھے بھی دیکھ لیتا تھا۔ خدا جانے ان لوگوں کو کیسے پتہ چل گیا کہ میں اس طرف ہوں کیونکہ ہر ہر مہادیو کے نعروں اور کسی کسی وقت سٹین گن کی فائرنگ کی آوازیں میرے قریب آتی جا رہی تھیں۔ میدان سے نکل کر میں گھنے خونی جنگل میں داخل ہوا ہی تھا کہ اچانک چیختا چلاتا سینہ پیٹتا ایک بن مانس میرے سامنے آگیا اور دانت نکال کر اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے سٹین گن سیدھی کی اور یکے بعد دیگرے دو برسٹ فائر کر کے اسے چھلنی کر دیا۔ بن مانس خوفناک آوازیں نکالتا نیچے گر پڑا۔ میں فائر کے دھماکے نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن بن مانس سے جان بچانے کے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا۔ فائرنگ کے دھماکوں نے میری نشان دہی کر دی تھی۔ اس کے بعد مہادیو کے آدمیوں کے نعروں کی آوازیں زیادہ جوش سے بلند ہونے لگیں۔ یہاں جنگل جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں بہت گھنا شروع ہوگیا تھا۔ درخت بالکل ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ان پر جھاڑیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ ان میں آدم خور جھاڑیاں اور درخت بھی تھے لیکن میرے جسم کی بو کی وجہ سے یہ خونی جھاڑیاں جہاں جہاں میرے راستے میں آتی تھیں فوراً سمٹ جاتی تھیں یا درخت اپنی خونی شاخوں کو اوپر کھینچ لیتے تھے۔

میرے پیچھے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔

پھر گولیاں میرے سر کے اوپر سے اور دائیں بائیں درختوں کی شاخوں کو کاٹتی ہوئی سیٹیاں بجاتی گزرنے لگیں۔ وہاں درختوں کے تنے اتنے قریب قریب کھڑے تھے کہ مجھے کوئی گولی نہیں لگ رہی تھی۔ میں درختوں کے تنوں کے بیچ میں سے تیزی سے گزر رہا تھا۔ یہاں میں دوڑ نہیں سکتا تھا۔ دوڑنے کی جگہ ہی نہیں تھی۔ دن کی روشنی درختوں کے اوپر سے جھانک رہی تھی۔ درختوں کے درمیان ہلکا اندھیرا تھا۔ میں بن مانس کی طرح اچھلتا اور چھلانگیں لگاتا چلا جا رہا تھا۔ میں پانی کے کنڈ کے قریب سے بھی گزر گیا۔ یہ وہ کنڈ تھا جہاں پچھلی رات سحر کے وقت جوگن مایادیوی نے ضرور میرا انتظار کیا ہوگا۔ وہ یقیناً خونی جنگل اور شیطان مہادیو کی آلوپ نگری کی حدود سے نکل کر اپنے چوکھمبا گاؤں والی کٹیا میں پہنچ چکی ہوگی۔ مجھے اسی کے پاس جانا تھا۔ اگر میں اپنے پیچھے لگی ہوئی سپیروں کی فوج کی اندھا دھند فائرنگ سے بچ گیا تو۔ یہ لوگ جنگل میں چاروں طرف سٹین گن کے برسٹ بارش کی طرح فائر کر رہے تھے۔ کئی سانپ مجھے دیکھ کر پھنکاریں مارتے بھاگتے نظر آئے۔ میں مگرمچھوں کے تالاب پر آ گیا۔ تالاب کے کنارے چھ سات مگرمچھ لیٹے

ہوئے تھے۔ میری بو پا کر وہ ہڑبڑا کر تالاب میں چھلانگیں لگا گئے۔

جنگل اب زیادہ گھنا نہیں رہا تھا۔ میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ یہاں آ کر میں نے بھی پلٹ کر دو تین بار سٹین گن کے برسٹ فائر کیے۔ مگر ان کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہاں مجھے کوئی دشمن کا آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ایک دلدل میں گرتے گرتے بچا۔ اگر مجھے جوگن مایا دیوی نے دلدلوں کی شناخت نہ کرا دی ہوتی تو میں دلدل میں گر چکا تھا اور دلدل نے مجھے فوراً نگل لینا تھا۔ آخر مجھے دور درختوں کے تنوں میں سے دن کی روشنی دکھائی دینے لگی۔ یہ آلوپ نگر کے خونی جنگل کی سرحد کے آخری درخت تھی۔ یہ مہادیو کی شیطانی سلطنت کی سرحد تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ مہادیو کے فوجی سپیرے اس سرحد سے آگے نہیں آئیں گے۔ میں نے دوڑنے کی رفتار تیز کر دی۔ میرے پیچھے فائرنگ کے دھماکے بھی شدت اختیار کر گئے تھے۔ خدا جانے ان لوگوں کے پاس اس ویران جگہ پر اتنا اسلحہ کہاں سے آ گیا تھا۔ وہ بے دریغ سٹین گن کا اسلحہ پھونک رہے تھے۔

”اپنی فوجی تربیت کی وجہ سے مجھے معلوم تھا کہ دشمن کی فائرنگ سے کس طرح اپنے آپ کو بچایا جاتا ہے۔ میں بالکل سیدھ میں نہیں دوڑ رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے کبھی دائیں ہو جاتا کبھی بائیں ہو جاتا اور کبھی جھک جاتا۔ میں ہر تیسرے قدم پر کسی نہ کسی درخت کی اوٹ لے کر چند گز بالکل درخت کی سیدھ میں دوڑتا چلا جاتا تھا۔ جب احساس ہوتا کہ درخت مجھے کور نہیں دے رہا تو پھر فوراً جھک کر کسی دوسرے درخت کی طرف دوڑنا شروع کر دیتا۔ اسی طرح دوڑتے دوڑتے میں ان درختوں کے درمیان سے نکل گیا جو مہادیو کی سلطنت آلوپ نگر کی سرحد کے آخری درخت تھے۔ میرے سامنے اب گھاس کا کھلا میدان تھا۔ جہاں دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور روشنی ہی روشنی تھی۔ اس میدان میں آتے ہی میں نے اپنی رفتار مزید تیز کر دی۔ میرے پیچھے جو فائرنگ ہو رہی تھی۔ اب وہ مجھ سے کافی دور رہ گئی تھی۔ ایک جگہ گھاس کافی اونچی تھی۔ میں اس میں گھس گیا۔ جب گھاس کے اندر ہی اندر تیز تیز چلتے ہوئے وہاں سے باہر نکلا تو میرے سامنے ہرے ہرے کھیت ہی کھیت تھے۔ میں چوکھما گاؤں کے گرد و نواح کے کھیتوں میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے

رک کر پیچھے خونی جنگل کے درختوں کو دیکھا۔ فائرنگ کے دھماکے بالکل سنائی نہیں دے رہے تھے۔ مہادیو کے سپیروں کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور ان کی سرحد سے نکل چکا ہوں۔ یہاں وہ اس لیے بھی میرے پیچھے آ کر فائر نہیں کھول سکتے تھے کہ جہاں میں تھا وہاں بھارتی پولیس کی عمل داری تھی اور یہاں آ کر فائرنگ کرنے سے پولیس خبردار ہو کر ان کے تعاقب میں آلوپ نگر تک پہنچ سکتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے بقول جوگن مایا دیوی انہیں مہادیو کا حکم تھا کہ خونی جنگل کی سرحد کے پار چوکھما گاؤں کی طرف ہرگز فائر نہیں کرنا۔ میں نے گاؤں کے مکانوں کو غور سے دیکھا۔

ایک دو کھیتوں میں کسان ہل چلا رہے تھے۔ مجھے جوگن مایا دیوی کی کٹیا کی تلاش تھی۔ مجھے پورا اندازہ نہیں تھا کہ میں خونی جنگل کے کس جانب سے باہر نکلا ہوں۔ میں ایک کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ گیا۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں سانس درست کرتے ہوئے گاؤں کے مکانوں کا جائزہ لینے لگا۔ گاؤں کا یہ وہ پہلو نہیں تھا جدھر سے میں جھانسی سے روانہ ہونے کے بعد آیا تھا۔ جب میرا سانس معمول کے مطابق ہو گیا تو میں اٹھا اور کھیتوں میں سے ہو کر گاؤں کی دوسری جانب چلنے لگا۔ دوسری جانب سے ہو کر میں نے گاؤں کا چکر پورا کیا تو میں نے سامنے پھیلے ہوئے سوکھی جھاڑیوں والے میدان کو پہچان لیا۔ اسی میدان میں سے گزر کر میں پہلی بار جوگن مایا دیوی کی کٹیا میں آیا تھا جو ایک مڑھی میں واقع تھی اور جس طرف گاؤں کے لوگ ڈر کے مارے نہیں آتے تھے اور کھیتی باڑی بھی نہیں کرتے تھے۔ اسی وجہ سے یہ میدان ویران پڑا تھا۔

دور سے مجھے وہ چبوترا نظر پڑا جس پر جوگن کی کٹیا تھی۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ یہ آسیبی مڑھی تھی اور اس کے بارے میں بڑی ڈراؤنی کہانیاں مشہور تھیں۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ کٹیا کے باہر چبوترہ ویران پڑا تھا۔ باہر جو چولہا بنا ہوا تھا وہ بھی ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ کٹیا بھی خالی تھی۔ مٹی کی مٹکی کٹیا کے باہر اسی طرح رکھی ہوئی تھی۔ کٹیا بانس کی تھی جس کے باہر بانس کے ساتھ بجھی ہوئی لالٹین لٹکی تھی۔ جوگن کا بستر ویسے ہی لگا ہوا تھا۔ ہرن کی چھال بھی بچھی ہوئی تھی۔ پیتل کی دو کٹوریاں رکھی تھیں۔ مگر جوگن مایا دیوی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے اس کی مدد کی اشد ضرورت تھی۔ میں اپنی بیوی کو خونی جنگل

والی آلوپ نگر کی شیطانی بستی میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے اپنی بیوی کو واپس لانے کے لیے مہا دیو کے شیطانی آشرم پر ایک بار پھر حملہ کرنا تھا اور یہ کام میں جوگن مایا دیوی کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔ میں کٹیا کے بانس کے دروازے کے پاس بیٹھ گیا۔ مٹکی میں سے پانی نکال کر پیا اور جوگن کا انتظار کرنے لگا۔ میرے جسم پر جوگیوں والی صرف ایک ہی دھوتی تھی جس کا ایک پلو میں نے اپنے جسم کے اوپر ڈال رکھا تھا۔ سارا رستہ کھیتوں میں سے گزرتے وقت میں نے سٹین گن کو دھوتی کے پلو میں چھپائے رکھا تھا۔

میں نے سٹین گن کے میگزین کو چیک کیا۔ اس میں صرف ایک راؤنڈ ہی باقی رہ گیا تھا۔ یہ مہا دیو کے آشرم پر دوسری بار شب خون مارتے وقت میرے کام آ سکتا تھا۔ مگر ایک راؤنڈ ناکافی تھا۔ میں جان چکا تھا کہ مہا دیو کے آشرم کے سپیروں کی فوج کے پاس کافی اسلحہ موجود ہے۔ اب میں وہاں ہر قسم کے اسلحے سے لیس ہو کر جانا چاہتا تھا۔ لیکن ہر قسم کا اسلحہ مجھے وہاں کون لا کر دے سکتا تھا۔ جوگن مایا دیوی یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ بہرحال ایک بات طے شدہ تھی کہ مجھے دوبارہ خونی جنگل میں داخل ہو کر مہا دیو کے شیطانی آشرم پر بھرپور کمانڈو اٹیک کرنا ہے اور وہاں سے اپنی بیوی کو نکال کر لانا ہے اور ان لوگوں سے اپنی بیوی کی بے عزتی کا انتقام بھی لینا ہے۔ میرے انتقام کی فہرست میں دہشت سپیرا جو میری بیوی کو دلی والے کوراٹر سے اغوا کر کے لے گیا تھا اور شیطان صفت مہا دیو سر فہرست تھے۔ مجھے صرف ایک بات کا خدشہ تھا کہ اس دوران کہیں وہ لوگ میری بیوی پر دوبارہ منتر پھونک کر اس کی یادداشت گم نہ کر دیں۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی جوگن مایا دیوی کا انتظار کرتے کرتے کافی دن نکل آیا تھا۔ میں نے اپنی سٹین گن کٹیا کے اندر کونے میں چھپا دی۔ ایک مٹی کے مٹکے میں سے مجھے چاولوں اور دال کی پوٹلیاں مل گئیں۔ میں نے باہر آ کر چولہے میں ادھر ادھر سے درختوں کی شاخیں اکٹھی کر کے آگ جلائی۔ چاولوں اور دال کو دھو کر پتیلی میں ڈال کر اسے چولہے پر چڑھا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھیکی کھچڑی تیار ہو گئی۔ نمک مجھے وہاں کہیں نہیں ملا تھا۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھچڑی کھائی اور کٹیا کے اندر جا کر جوگن کے بستر پر لیٹ گیا۔ ساری رات کا جاگا تھا اور دوڑ دوڑ کر تھک چکا تھا۔ ایسی گہری نیند سویا کہ جب آنکھ کھلی تو

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ کٹیا سے باہر آ کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دور چوکھمبا گاؤں کے مکانوں میں روشنیاں ٹمٹمانے لگی تھیں۔ خونی جنگل کی طرف نگاہ اٹھائی خونی جنگل کی سرحد کے اونچے اونچے سیاہ درخت شام کے اندھیرے میں تارکول کے ستونوں کی طرح سیاہ اور ڈراؤنے لگ رہے تھے۔ اپنی بیوی جمیلہ کا خیال کر کے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر غصے میں دانت پیستے ہوئے میں کٹیا کے باہر چولہے کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی سی کھچڑی پتیلی میں سے نکال کر کھائی پانی پیا اور وہیں کھلی ہوا میں بیٹھ کر جوگن کا انتظار کرنے لگا۔ خدا جانے وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔

کسی وقت خیال آتا کہ شاید وہ ابھی تک خونی جنگل میں ہی میرا انتظار کر رہی ہو۔ کسی وقت خیال آتا کہ کہیں اسے مہا دیو کے فوجی سپیروں نے نہ پکڑ لیا ہو۔ میں نے کٹیا کے باہر لٹکی ہوئی لالٹین کو بھی نہیں جلایا تھا۔ میں گاؤں میں بھی جوگن کو دیکھنے نہیں گیا تھا۔ میں اس خطرے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا کہ بھارت کی پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس میری تلاش میں ہے۔ اگر میں ان کے ہتھے چڑھ گیا تو میری بیوی کی تلاش کا سارا معاملہ بیچ میں ہی رہ جائے گا اور کوئی پتہ نہیں انڈین ملٹری یا سول پولیس والے مجھے یہاں سے اٹھا کر کسی شہر کی طرف لے جاتے ہیں اور میرا کیا حشر کرتے ہیں۔ بھارتی پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس کو یقین تھا کہ میں پاکستانی فوج کا مفرور جنگی قیدی ہوں اور وہ ہر حالت میں مجھے پکڑنا چاہتے تھے۔ مچھر میرے جسم کی بو کی وجہ سے مجھے کٹیا کے اندر یا باہر بالکل تنگ نہیں کرتے تھے۔ رات بھیگتی چلی گئی، گہری ہوتی چلی گئی۔ چاروں طرف موت ایسی خاموشی چھا گئی۔ گاؤں کی طرف سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ ویسے بھی گاؤں جوگن کی کٹیا سے کافی دور تھا۔ شاید کتے بھی آسیبی مڑھی سے ڈر کر اس طرف کا رخ نہیں کرتے تھے۔ جوگن نے مجھے وہاں ایک مڑھی دکھائی تھی جو اس کی کٹیا سے چند قدم کے فاصلے پر ایک لمبے چبوترے کی شکل میں تھی۔ اس کے درمیان اینٹوں کا ایک پرانا طاق سا بنا ہوا تھا۔ جوگن نے کہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں یہاں آدھی رات کو کبھی کبھی گناہ گار عورتوں کی عذاب میں مبتلا بدروحیں آتی ہیں۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔

جب کٹیا کے باہر بیٹھے بیٹھے تھک گیا اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ جوگن مایا دیوی

رات کو نہیں آئے گی۔ اگر اسے آنا ہوتا تو دن کی روشنی میں آ جاتی۔ ممکن تھا کہ وہ خونی جنگل میں ہی کسی جگہ چھپ کر میرے انتظار میں ہو یا میرا کھوج لگانے کے لیے اپنی سہیلی سیندھیا سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر کٹیا کے اندر آ گیا۔ چونکہ مجھے مچھروں اور دوسرے حشرات الارض کی کوئی فکر نہیں تھی، اس لیے میں اندھیرے میں ہی جوگن مایا دیوی کے بستر پر جھونپڑی کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور جمیلہ کے بارے میں سوچنے لگا کہ نہ جانے وہ کس حالت میں ہوگی۔ اب تو اس کی یادداشت بھی واپس آ گئی تھی۔ اسے احساس ہو گیا ہے کہ وہ میری بیوی ہے اور اسے سپیرا اغوا کر کے لے گیا تھا۔ اسی سوچ نے جمیلہ کی ذہنی اذیت میں اضافہ کر دیا ہوگا۔ جب تک اس کی یادداشت منتروں کے اثر کی وجہ سے غائب تھی وہ شاید اطمینان کی حالت میں تھی اور اپنے آپ کو آشرم کی ایک نرتکی ہی سمجھ رہی تھی لیکن اب یہ سوچ کر اس پر قیامت گزر رہی ہوگی کہ وہ ان عورتوں میں سے نہیں ہے اور اسے اغوا کر کے وہاں لایا گیا ہے اور یہ بھی کہ اس کا خاوند یعنی میں اس کی تلاش میں وہاں تک پہنچ چکا ہوں۔ وہ میرے بارے میں بھی شدید پریشان ہوگی۔ سیندھیا نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس کو وہاں سے نکالنے پہنچ گیا ہوں اور مجھے پکڑ لیا گیا ہے اور اماوس کی رات کو مجھے موت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اگرچہ انہیں بھی میرے فرار کا علم ہو گیا ہوگا لیکن جمیلہ اس لیے بھی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہوگی کہ میں فرار ہو کر کہاں گیا ہوں۔ سپیرے فوجی میرے پیچھے لگے ہیں۔ کہیں انہوں نے مجھے مار نہ ڈالا ہو۔ یہ بات مجھے بھی پریشان کر رہی تھی کہ آخر کل رات کو سیندھیا میری بیوی کو لے کر اپنی کٹیا میں کیوں نہیں پہنچی تھی۔

یہی کچھ سوچتے سوچتے مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ کٹیا میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر کٹیا کے باہر والی لالٹین روشن نہیں کی تھی۔ سٹین گن میں نے کونے سے اٹھا کر اپنے پاس ہی رکھ لی تھی۔ اس خیال سے کہ اگر شیطانی مہادیو کے آشرم کا کوئی سپیرا فوجی رات کو جاسوسی کرتا میری تلاش میں وہاں نکل آیا تو میں اس کو ٹھکانے لگا سکوں گا۔ میں اونگھنے لگا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میں گہری نیند میں کھو چکا تھا۔ ایک عجیب سا خواب دیکھنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر میری بیوی جمیلہ میری طرف دونوں بانہیں پھیلا کر کھڑی ہے، چاند نکلا ہوا ہے۔ میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔ جمیلہ میری طرف سے منہ موڑ کر دوسری طرف دیکھتی ہے اور پھر ایک دم پہاڑ کی چوٹی سے دوسری طرف کود جاتی ہے۔ میں چیخ مار کر اس کے پیچھے کود جاتا ہوں۔ میں روئی کے گالے کی طرح نیچے گرتا جا رہا ہوں۔ مجھے کوئی خبر نہیں کہ جمیلہ کہاں گری ہے۔ اچانک میں ایک بہت بڑے اژدہا کے منہ پر گرتا ہوں۔ اژدہا کے منہ سے خوفناک پھنکار کے ساتھ آگ کے شعلے نکل کر میرے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ میں چیخیں مارنے لگتا ہوں۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اپنی چیخوں کی آواز سنی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور آیت الکرسی پڑھنے لگا۔ اس سے میرے دل کو سکون مل گیا۔ بڑا ڈراؤنا خواب تھا۔ ذرا میرا دل ٹھیک ہوا تو میں دوبارہ لیٹ گیا۔ ابھی مجھے لیٹے پانچ چھ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ مجھے ایک عجیب سی المناک آواز سنائی دی۔ میں نے کان کھڑے کر لیے۔ باہر تاریک رات پر قبرستانوں کی خاموشی طاری تھی۔ آواز میں نے ضرور سنی تھی۔ میں نے کان لگائے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہی آواز پھر آئی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی جو بڑے ڈراؤنے اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز میں جیسے بین کر رہی تھی۔ میں نے سٹین گن اٹھا لی۔ آواز آنی بند ہو گئی۔ میں دبے پاؤں سٹین گن لیے کٹیا سے باہر آ گیا۔ باہر اندھیرا، تاریکی، سناٹے اور دہشت کا ماحول تھا۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اچانک میری دائیں جانب سے وہی ڈراؤنی آواز دوبارہ سنائی دی۔ میں اس طرف جھک کر چلتا ہوا بڑھا۔ دوسری طرف آسیبی مڑھی تھی۔ وہاں میں نے جو ہیبت ناک ڈراؤنا منظر دیکھا اسے میں ساری زندگی نہیں بھول سکوں گا۔

اس کے بعد کیا ہوا اس کا سنسنی خیز حال آپ "بت شکن مجاہد"، کے حصہ دوم

لکشمن پور کی ناگن درگا

اے حمید

میں پڑھیے۔